محمود المواعظ

(جلد دہم)

مجموعۂ مواعظ

حضرت اقدس مولانا مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتہم

سابق صدر مفتی وحال شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین، ڈابھیل

مرتب

مولانا عظیم الدین ارنالوی

مدرس مدرسہ مفتاح العلوم، تراج، سورت، گجرات

ناشر

مکتبۂ محمودیہ، محمود نگر، ڈابھیل

تفصیلات

کتاب کا نام:.............................. محمود المواعظ (جلد دہم)

افادات:............ حضرت اقدس مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتہم

مرتب:.............. مولانا عظیم الدین ارنالوی (استاذ مدرسہ مفتاح العلوم تراج)

صفحات: ۳۶۸

ناشر:.................. مکتبۂ محمودیہ، محمود نگر، ڈابھیل، گجرات

حضرت دامت برکاتہم کے مواعظ، کتابیں حاصل کرنے اور ہر سنیچر کو براہِ راست حضرتِ اقدس کی مجلس سننے کے لیے حسبِ ذیل ویب سائٹ کا استعمال کریں:

www.muftiahmedkhanpuri.com

ملنے کے پتے

- ادارۃ الصدیق، نزد جامعہ تعلیم الدین، ڈابھیل Mo:99133,19190
- مکتبۂ انور، ڈابھیل (مفتی عبد القیوم صاحب راجکوٹی) Mo:99246,93470
- مکتبۂ الاتحاد، دیوبند Mo:98972,96985
- مکتبۂ ابوہریرہ، کھروڈ (مولانا جاوید صاحب مہاراشٹری) Mo:99256,52499
- مفتی صدیق اسلامپوری (جامعہ خیر العلوم ادگاؤں، کولہاپور) Mo:99220,98249

اجمالی فہرست مضامین ...... جلد دہم

تفصیلی فہرست مضامین...... جلد دہم

دین میں توبہ کی اہمیت اور اس کی ضرورت وافادیت

خلق اللہ کی تحقیر سے بچیے

اپنے قلب کو غلّ وغش سے پاک رکھئے

مجاہدۂ نفس کا ایک رکن: تقلیلِ کلام

اتباعِ سنت کا مقام ومرتبہ اور اس کے لیے اکابر کا عاشقانہ طرزِ عمل

فضلاء سے اہم خطاب:

(۱) قیامت میں پوچھے جانے والے پانچ سوالات

(۲) علمِ نافع وغیر نافع کی تمیز

(۳) اصحابِ نسبت سے فیض حاصل کرنے کا طریقہ

مکمل و مدلل تعزیت

تقویٰ اور اُس کے حصول کا آسان راستہ:
صحبتِ صالحین

اقتباس

حدیث میں آتا ہے اور اسے بعض بزرگوں کا قول بھی کہا گیا ہے: لِكُلِّ شَيْءٍ مَعْدِنٌ، وَمَعْدِنُ التَّقْوَى قُلُوبُ الْعَارِفِينَ کہ: ہر چیز کی ایک کان ہوتی ہے، ہر چیز کا ایک معدن ہوتا ہے، جہاں سے وہ چیز ملا کرتی ہے: پانی واٹر ورکس (water works) سے آتا ہے، بجلی پاور ہاؤس (power house) سے آتی ہے، کسی کو نمک چاہیے تو نمک کی کان سے ملے گا، سونا چاندی چاہیے تو اس کی کان سے ملیں گے۔ اسی طرح ہر چیز کا ایک مرکز ہوتا ہے جہاں سے وہ چیز لی جاتی ہے۔ تقویٰ کا مرکز اور جہاں سے آپ تقویٰ حاصل کر سکتے ہیں، وہ اللہ کے عارفین اور نیک لوگوں کے قلوب ہیں، ان کی صحبت کو اختیار کریں گے تو یہ چیز حاصل ہوگی۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا، ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا، ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا، من يهده الله فلا مضل له، ومن يضلله فلا هادي له، ونشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شريك له، ونشهد أن سيدنا ومولانا محمداً عبده ورسوله، أرسله إلىٰ كافّة الناس بشيراً ونذيراً، وداعياً إلى الله بإذنه وسراجاً منيراً، صلّى الله تعالىٰ عليه وعلىٰ آله وأصحابه وبارك وسلّم تسليماً كثيراً كثيراً.

أمابعد: فَأَعُوْذُ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ: ﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ ٱتَّقُواْ ٱللَّهَ وَكُونُواْ مَعَ ٱلصَّـٰدِقِينَ ﴿١١٩﴾﴾ [التوبة: ١١٩]

وعظ سننے اور سنانے کی غرض اور نیت

محترم حضرات! ہم اور آپ اِس وقت اللہ تبارک وتعالیٰ اور اس کے رسولِ پاک ﷺ کی باتیں سننے اور سنانے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک کی یہ نیت ہو، کہ ہم یہ اس لیے سنیں گے کہ اس پر عمل کا اہتمام کیا جائے، یہ سننے والے کی نیت ہو اور سنانے والے کی نیت یہ ہو کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اور اُس کے رسولِ پاک ﷺ کی باتوں کو لوگوں تک پہنچا رہا ہوں، اپنی بڑائی، تفوّق یا اپنی علمیت کا اظہار مقصود نہ ہو، سننے والوں کی بھی غرض ذہنی عیاشی نہ ہو کہ اچھی باتیں سن کر لطف اٹھائیں گے، دین کی

باتیں اس غرض سے نہیں سنی جاتیں؛ بلکہ اس کا مقصد ہی عمل ہوا کرتا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ مجھے اور آپ کو اللہ تبارک وتعالیٰ کے ان احکام اور نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ان ارشادات اور ہدایات پر عمل کرنے کی توفیق، اہتمام اور سعادت عطا فرمائے۔ (آمین)

تقویٰ کی اہمیت

ابھی قرآنِ پاک کی ایک آیت آپ کے سامنے تلاوت کی گئی، اس میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایمان والوں کو تقویٰ اختیار کرنے کا حکم دیا ہے۔ لفظِ تقویٰ اور اس سے جو مختلف افعال اور اسماء بنتے ہیں، قرآنِ پاک میں اس کو بے شمار مقامات پر جگہ جگہ استعمال کیا گیا ہے، بعض حضرات لکھتے ہیں کہ دو سو سے زائد مقامات پر اس کا ذکر آیا ہے اور اس کی بڑی تاکید اور حکم دیا گیا ہے۔

تقویٰ کا لغوی مفہوم

یہ تقویٰ کیا ہے؟ تقویٰ یہ عربی زبان کا لفظ ہے جس کا ترجمہ اردو میں ''ڈر اور پرہیز'' سے کیا جاتا ہے کہ یہ چیز ایسی ہے جس سے ہمیں اپنے آپ کو بچانا ہے اور اس سے ڈرنا ہے۔ آدمی اللہ کے ڈر سے اس کی نافرمانی سے اپنے آپ کو بچاتا ہے۔ بچنے کی جو چیز ہوتی ہے، عام طور پر آدمی اس سے ڈرتا ہے، جیسے آگ بچنے کی چیز ہے تو آدمی اس سے ڈرتا ہے تو عربی زبان میں تقویٰ بچاؤ، پرہیز اور ڈر کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

جیسے بیمار کو بیماری میں جو چیزیں نقصان دینے والی ہیں اور دوا اور علاج کے اثر کو ختم کرنے والی ہیں، ڈاکٹر ان کے متعلق کہتا ہے کہ: یہ چیز مت کھائیو، کھٹا مت کھائیو،

میٹھا مت کھائیو، چناں چہ مریض ایسی چیزوں سے اپنے آپ کو بچاتا ہے، اسی کو ''پرہیز'' کہا جاتا ہے۔ تقویٰ کا معنی ہی بچنا ہے، اللہ فرماتے ہیں: ﴿إِلَّآ أَن تَتَّقُواْ مِنۡهُمۡ تُقَىٰةً﴾ [آل عمران۲۸]، کفار اور مشرکین کے ساتھ جہاں معاملہ پیش آیا تو فرمایا کہ ان کے ساتھ دوستی مت کرو، البتہ اگر ان کے شر سے بچنے کے لیے کبھی ضرورت پیش آجائے اور شریعت کی حدود میں رہ کر کوئی ایسی تدبیر اختیار کر سکتے ہو جو ان کے شر سے بچا سکے تو اس کی اجازت ہے، ﴿إِلَّآ أَن تَتَّقُواْ مِنۡهُمۡ تُقَىٰةً﴾: یعنی تم ان کے شر سے، ان کی برائی سے بچنے کے لیے کوئی طریقہ اختیار کرو۔ یہ تو عربی زبان کی لغت اور ڈکشنری (dictionary) کے اعتبار سے اس کا معنی ہوا۔

تقویٰ کا شرعی مفہوم

شرعی اعتبار سے اس کا مفہوم اور مطلب کیا ہے؟ تو اس سلسلے میں علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے، علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے اور دیگر مفسرین نے ایک واقعہ اپنی اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے کہ: امیر المؤمنین سیدنا حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ یہ تقویٰ کیا ہے؟۔

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کا مقام ومرتبہ

پوچھنے والے حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ ہیں جن کے مقام اور مرتبے سے ہم اور آپ واقف ہیں، نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد سب سے اونچا درجہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حاصل ہے اور اس کے بعد دوسرے نمبر پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو سب سے اونچا مقام حاصل ہے۔

ویسے خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بڑے مناقب اور فضائل ہیں: نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: لَوْ كَانَ نَبِيٌّ بَعْدِي لَكَانَ عُمَرَ بْنَ الخَطَّابِ: اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ حضرت عمر ہوتے[۱]۔

ایک موقع پر نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے متعلق ارشاد فرمایا کہ: عمر! آپ جس راستے سے اور جس گلی سے گذرتے ہیں، شیطان اپنا راستہ بدل لیتا ہے[۲]۔ ان کی ہیبت کا یہ عالم تھا کہ شیطان جیسا شیطان بھی ان سے کنّی کاٹ کر اور بچ کر نکلنے کی کوشش کرتا ہے۔

حدیثِ مذکورہ کا شانِ ورود

ایک خاص موقع پر نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے متعلق یہ بات ارشاد فرمائی تھی، بخاری شریف کی روایت ہے کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے گھر میں تشریف فرما ہیں اور حضراتِ ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو گھیرے ہوئے ہیں اور اپنے مطالبات، اپنی ڈیمانڈ پیش کر رہی ہیں اور اسی میں ان کی آوازیں نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آواز پر بلند ہو رہی ہیں، گھر کے اندر یہ معاملہ ہو رہا ہے۔

---

① سنن الترمذی، عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ رضي الله عنه، باب فِي مَنَاقِبِ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رضي الله عنه، ر:٣٦٨٦.

② صحيح البخاری، عَنْ سَعْدِ بْنِ أَبِي وَقَّاصٍ رضي الله عنه، باب مَنَاقِبُ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رضي الله عنه، ر:٣٦٨٣.

اشخاص کے اعتبار سے بھی حکم میں فرق درآتا ہے

ویسے نبیٔ کریم ﷺ کے ساتھ ان کا جو خصوصی تعلق تھا، اس کی وجہ سے اس کی گنجائش تھی۔ بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک چیز ایک آدمی کے حق میں بہت سخت حکم رکھتی ہے لیکن دوسرے آدمی کے حق میں اس کا یہ حکم نہیں۔ دیکھئے! قرآنِ پاک میں ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام جب کوہِ طور سے توریت کی تختیاں لے کر آئے تو ویسے تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کو وہیں سے بتلا دیا تھا کہ سامری نے قوم کے پاس جو زیورات تھے، اس کا بچھڑا بنا کر، آپ کی قوم کو بہکا کر اس بچھڑے کی پرستش میں مبتلا کر دیا ہے۔

چوں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کو- کہ وہ بھی نبی تھے- اپنا نائب بنا کر اپنی قوم بنو اسرائیل کو ان کے حوالے کر کے آئے تھے، اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے حضرت موسی علیہ السلام کو اس حادثے کی اطلاع دی ہی جا چکی تھی لیکن اس کے باوجود جب حضرت موسی علیہ السلام واپس اپنی قوم میں تشریف لائے اور اپنی آنکھوں سے ان کو ''گوسالہ پرستی'' کرتے ہوئے دیکھا تو اگرچہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے اطلاع دینے سے اس کا یقین ہو گیا تھا لیکن جب اپنی آنکھوں سے دیکھا تو پھر غصے سے بے قابو ہو گئے، بپھر گئے، توریت کی تختیاں ہاتھ سے گریں اور اسی حالت میں اپنے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کی ڈاڑھی اور سر پکڑ لیا۔

قرآن میں ہے: ﴿وَأَخَذَ بِرَأْسِ أَخِيهِ يَجُرُّهُ إِلَيْهِ﴾[الأعراف۱۵۰] کہ: تم نے یہ کیا کیا؟ تمھاری موجودگی میں انھوں نے گمراہی کا راستہ اختیار کر لیا۔ اس پر حضرت ہارون

کہنے لگے: ﴿لَا تَأْخُذْ بِلِحْيَتِي وَلَا بِرَأْسِيٓ﴾ کہ: آپ میری ڈاڑھی نہ پکڑیئے، ﴿إِنِّي خَشِيتُ أَن تَقُولَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِيٓ إِسْرَٰٓءِيلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِي ﴿٩٤﴾﴾ [طه: ٩٤]، حضرت موسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلوۃ والسلام کو شکایت یہ تھی کہ تم نے ان کو سختی سے روکا کیوں نہیں، سختی کا معاملہ کیوں نہیں کیا، حضرت ہارون علی نبینا وعلیہ الصلوۃ والسلام کو یہ اندیشہ تھا کہ سختی کرنے کی صورت میں معاملہ کہیں بگڑ نہ جائے، قوم میں کہیں تفریق نہ ہوجائے۔

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

ہر ایک کا اپنا اپنا انداز ہوتا ہے، یہیں سے حضراتِ مجتہدین کے اندازِ اجتہاد کا بھی آپ کو پتہ چل سکتا ہے کہ حضرت موسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلوۃ والسلام کی جو سوچ تھی، وہ الگ تھی اور حضرت ہارون علی نبینا وعلیہ الصلوۃ والسلام کی جو سوچ تھی، وہ الگ تھی۔

بہرحال! میں تو آپ کو یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ حضرت ہارونؑ بھی تو اللہ کے نبی ہیں تو ان کی ڈاڑھی کھینچنا، ان کے سر کے بال پکڑنا، اگر کوئی دوسرا آدمی یہ کام کر لیتا تو اس کے لیے کیسا سخت حکم جاری ہوتا لیکن یہاں یہ معاملہ کرنے والے حضرت موسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلوۃ والسلام ہیں؛ اس لیے یہ بات نہیں ہے۔ دیکھیے! اشخاص کے اعتبار سے حکم میں فرق آ گیا۔

آداب کے باب میں ازواجِ مطہرات کا حکم عام امت سے جدا

نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جو آداب اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآنِ پاک میں بتلائے ہیں، ان میں خاص طور پر ﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ لَا تَرْفَعُوٓاْ أَصْوَٰتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ ٱلنَّبِيِّ﴾

[الحجرات:۲] - کہ: نبی کی آواز پر اپنی آواز کو بلند مت کرو- کی تاکید کی گئی ہے لیکن حضراتِ ازواجِ مطہرات، امہات المؤمنین رضی اللہ عنہن کا جو خصوصی تعلق اور رشتہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تھا، اس کے پیشِ نظر اگر اپنے ذاتی معاملات میں گفتگو کے دوران ان کی آواز نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آواز پر بلند ہوئی تو اس کو وہ حکم نہیں دیا جائے گا جو دوسرے کو دیا جاتا ہے۔ حضرتِ ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی آوازیں بلند ہونے پر تو یہ آیتیں نازل ہوئیں لیکن حضراتِ امہات المؤمنین رضی اللہ عنہن کے حق میں یہ حکم نہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ناراض ہونے کی علامت

جیسا کہ حدیث میں آتا ہے: نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ: تم مجھ سے راضی ہوتی ہو، وہ میں جانتا ہوں اور ناراض ہوتی ہو، وہ بھی میں جانتا ہوں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا کہ وہ کیسے؟ تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم مجھ سے راضی اور خوش ہوتی ہو اور کسی بات پر قسم کھانے کی تمھیں ضرورت پیش آتی ہے تو تم یہ الفاظ استعمال کرتی ہو: لاَ وَرَبِّ مُحَمَّدٍ: محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پروردگار کی قسم! اور اگر تم مجھ سے ناراض ہوتی ہو اور کسی بات پر قسم کھانے کی تمھیں نوبت آتی ہے تو تم کہتی ہو: لاَ وَرَبِّ إِبْرَاهِيمَ: ابراہیم کے پروردگار کی قسم!۔ اب دیکھئے! یہاں حضرت عائشہ، نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ناراض ہو رہی ہیں (۱)۔

---

(۱) صحیح البخاری، عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنهَا، كِتَابُ النِّكَاحِ، بَابُ غَيْرَةِ النِّسَاءِ وَوَجْدِهِنَّ، ر:۵۲۲۸۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ

بعض روایتوں میں آتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ اپنے کسی معاملے میں غور و فکر کر رہے تھے- بخاری شریف کی روایت ہے- ان کی بیوی کو بھی معلوم تھا کہ فلاں مسئلے میں سوچ رہے ہیں تو ان کی بیوی نے کہا کہ آپ اس معاملے میں ایسا کر لیں تو بہتر ہے، یہ میرا ایک مشورہ ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: ہم مکہ والے مہاجرین، عورتوں کو کوئی حیثیت دیتے نہیں تھے، گویا ان کو اس بات کا حق نہیں تھا کہ وہ ہمارے معاملات میں دخل دیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب میرے غور و فکر کے درمیان میری بیوی نے یہ مشورہ دیا تو میرے تیور بدل گئے اور میں نے کہا کہ: اچھا! تو مجھے مشورہ دیتی ہے!۔ بہر حال! حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو ٹوکا اور ناپسندیدگی کا اظہار کیا، اس پر ان کی بیوی نے کہا کہ: اے ابنِ خطاب! آپ تو اتنی سی بات پر مجھ سے ناراض ہو گئے، میں نے تو بس ایک ایسی بات جس میں آپ کی بھلائی تھی، آپ کو بتائی، اس پر آپ اپنے غصے کا اظہار کر رہے ہیں اور نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواجِ مطہرات کبھی دن بھر نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بات چیت نہیں کرتیں، کٹّی کیے رہتی ہیں۔ آپ اندازہ لگائیے کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کٹّی کیے رہتی تھیں، دوسرا کوئی ایسا کرے تو کیا حکم لگائیں گے لیکن یہاں حضراتِ ازواجِ مطہرات، امہات المؤمنین رضی اللہ عنہن کا معاملہ ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اپنی بیٹی کا فکر

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو معلوم نہیں تھا؛ اس لیے پوچھا کہ کیا واقعی ایسا ہوتا ہے؟ ان کی

بیوی نے کہا کہ: ہاں! ایسا ہوتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: تب تو حفصہ ہلاک ہوگئی۔ اُمُّ المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا ان کی بیٹی ہوتی ہیں، ایسے موقع پر باپ کو اپنی اولاد کا فکر پہلے ہوا کرتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: میں پہلی فرصت میں دوڑا ہوا حفصہ کے پاس پہنچا؛ تاکہ ان کو سمجھاؤں کہ یہ تم کیا کرتی ہو! یہ تمھارے لیے بڑا خطرناک ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اپنی صاحب زادی کو فہمائش

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے وہاں جا کر سب سے پہلے تو حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ: ایسا ہوتا ہے؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ: ہاں۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ آئندہ ایسا مت کرنا، تمھیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے کہہ دینا، میں لا دیا کروں گا، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کوئی مطالبہ مت کرنا، کہیں ایسا نہ ہو کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ناراضگی کی وجہ سے اللہ ناراض ہو جائے، ایسا ہوا تو تمھارا بیڑہ غرق ہو جائے گا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حضرت اُمِّ سلمہ رضی اللہ عنہا کو نصیحت اور ان کا کڑا جواب

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: ان کو سمجھانے کے بعد میں حضرت اُمِّ سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس پہنچا، یہ بھی اُمُّ المؤمنین ہیں، ازواجِ مطہرات میں سے ہیں، ان سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رشتہ داری تھی۔ فرماتے ہیں کہ میں ان کے پاس گیا اور ان سے جب گفتگو شروع کی تو انھوں نے سختی کے ساتھ مجھے ٹوک دیا، انھوں نے کہا کہ اے عمر! تمھارا عجیب معاملہ ہے، تم ہر معاملے میں دخل اندازی کرتے ہو، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اور آپ کی

ازواجِ مطہرات کا جو معاملہ ہے، وہ تو ہمارا پرسنل معاملہ ہے، تم اس میں بھی دخل اندازی کرتے ہو! پھر انھوں نے یہ کہا کہ: کیا ہماری اصلاح کے لیے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کافی نہیں ہیں؟ یعنی اگر کوئی ایسی بات ہو جو اصلاح کے قابل ہو تو نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہماری اصلاح کر دیں گے، تمھیں اس طرح تنبیہ کرنے کی کیا ضرورت ہے!۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: ان کا یہ کڑا جواب سن کر کے میرے تو حوصلے پست ہو گئے اور اس کے بعد دوسری ازواجِ مطہرات کے پاس جانے کا ارادہ تھا، وہ سب ختم ہو گیا[۱]۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی آواز پر حضراتِ امہات المؤمنین کا فرار

خیر! میں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مناقب بیان کر رہا تھا کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حضراتِ امہات المؤمنین گھیرے ہوئے بیٹھی تھیں اور اپنے مطالبات پیش کر رہی تھیں، اسی دوران حضرت عمر رضی اللہ عنہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضری کی غرض سے آئے، ان کو معلوم نہیں تھا کہ اندر کیا گفتگو اور کیا سلسلہ جاری ہے۔ گھر کے دروازے پر پہنچ کر انھوں نے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے گھر کے اندر آنے کی اجازت چاہی۔ بخاری ہی کی روایت میں ہے کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی آواز سنی کہ وہ اندر آنے کے لیے اجازت مانگ رہے ہیں تو حضراتِ امہات المؤمنین رضی اللہ عنہن ایک دم سے اندر کی طرف بھاگ کھڑی ہوئیں اور

---

[۱] صحيح البخاری، عَنْ عَبْدِ اللهِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہما، كِتَابُ تَفْسِيرِ الْقُرْآنِ، بَابُ تَبْتَغِي مَرْضَاةَ أَزْوَاجِكَ، ر:٤٩١٣.

پردے کے پیچھے ہوگئیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے رعب وہیبت کا عالم

نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ منظر دیکھ کر مسکرائے؛ اس لیے کہ ابھی تو نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اندر آنے کی اجازت دی نہیں تھی اور ظاہر ہے کہ جب تک اجازت نہ ملتی، وہ اندر آ نہیں سکتے تھے، ابھی تو ان کی طرف سے اجازت طلب کی جارہی ہے لیکن ان کی ہیبت اور ان کا رعب ایسا تھا کہ ان کی صرف آواز سن کر سب بھاگ کر اندر کی طرف چلی گئیں۔ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اندر آنے کی اجازت دی۔ جس وقت وہ اندر داخل ہوئے تو دیکھا کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسکرارہے ہیں، ہنس رہے ہیں۔

کوئی آدمی جب کسی کو ہنستے ہوئے دیکھتا ہے تو وہ ہنسنے کا سبب بھی پوچھتا ہے؛ اگر وہ سبب اس کے سامنے پایا نہیں گیا۔ اگر پایا گیا تب تو وہ دیکھ رہا ہے کہ اس کی وجہ سے ہنس رہا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہنسنے کا سبب دریافت کیا۔

وہ آئے جب تو عظمت بڑھ گئی دنیا میں انسان کی

لیکن ہنسی کا سبب پوچھنے کے لیے بھی ایک ادب ہے۔ اسلام نے ہمیں ایسے عجیب وغریب آداب سکھلائے ہیں، نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات پر قربان جائیے! حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پہلے تو دعا دی: أَضْحَكَ اللّٰهُ سِنَّكَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ: اے اللہ کے رسول! اللہ تبارک وتعالیٰ آپ کو اور ہنسائے، مَا يُضْحِكُكَ؟: آپ کیوں ہنس رہے ہیں؟، آپ کو ہنسی کیوں آرہی ہے؟۔

دیکھئے! ہمیں ایک ادب سکھلایا گیا کہ اگر کوئی آدمی ہنس رہا ہو اور ہم اس سے اس کے ہنسنے کی وجہ دریافت کرنا چاہتے ہیں تو آپ پہلے اس کو دعا دیجیے کہ اللہ آپ کو اور ہنسائے! اللہ ایسے مواقع بار بار عطا فرمائے کہ آپ مسکراتے رہیں، ہنستے رہیں، دیکھو! کتنی عجیب و غریب تعلیم ہے!۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا جواب

نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے - پردے کی طرف اشارہ کر کے جہاں حضراتِ امہات المؤمنین موجود تھیں - ارشاد فرمایا کہ مجھے ان پر تعجب ہے کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے مجھ سے بلند آواز سے بات چیت کر رہی تھیں اور جہاں تمھاری آواز سنی، بھاگ کر اندر چلی گئیں، اس پر مجھے ہنسی آ رہی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب یہ سنا تو تعجب ہوا اور بہ ایں معنی ناگواری ہوئی کہ خود نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ بابرکات اس لائق تھی کہ آپ کا ادب کیا جاتا، آپ سے ڈرا جاتا اور آپ کے سامنے اس طرح بلند آواز سے گفتگو نہ کی جاتی، میں کیا ہوں! حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے حق دار تھے کہ آپ کے ساتھ ایسا معاملہ کیا جاتا۔ ان کے ساتھ تو یہ معاملہ ہوا اور میری آواز سن کر پیچھے کی طرف بھاگ کھڑی ہوئیں۔ اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پردے کی طرف اشارہ کر کے جہاں حضراتِ امہات المؤمنین تھیں - فرمایا: يَا عَدُوَّاتِ أَنْفُسِهِنَّ أَتَهَبْنَنِي وَلَا تَهَبْنَ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ؟: اے اپنی ذات کی دشمنو! تم مجھ سے ڈرتی ہو اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نہیں ڈرتیں؟۔

یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ہی حق ہے

حضرت علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: یہ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی کا حق ہے کہ حضراتِ امہات المؤمنین کو ان الفاظ کے ساتھ پکاریں یعنی يَا عَدُوَّاتِ أَنْفُسِهِنَّ: اے اپنی ذات کی دشمنو! تم مجھ سے ڈرتی ہو اور اللہ کے رسول سے نہیں ڈرتیں؟۔ یہاں بھی وہی بات کہ حضراتِ امہات المؤمنین کو ان الفاظ کے ساتھ خطاب کرنا یہ حضرت عمر کے لیے تو ٹھیک ہے، ورنہ خدانخواستہ حضراتِ امہات المؤمنین کے حق میں دوسرا کوئی ایسے الفاظ کہے گا تو مفتی لوگ اس کے بارے میں کیسا سخت حکم جاری کریں گے؟!۔

بہر حال! حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا کہ: تم مجھ سے ڈرتی ہو اور اللہ کے رسول سے نہیں ڈرتیں؟ تو اس پر اندر سے حضراتِ امہات المؤمنین رضی اللہ عنہن نے جواب میں فرمایا: أَنْتَ أَفَظُّ وَأَغْلَظُ مِنْ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ: آپ تو بڑے سخت اور اکھڑ قسم کے آدمی ہیں جب کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو بڑے نرم مزاج اور خوش خلق آدمی ہیں۔

بارگاہِ رسالت سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی دل جوئی

ظاہر ہے، یہ ایک ایسا جواب تھا جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو نہیں دیا جانا چاہیے تھا؛ اس لیے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی دل جوئی فرمائی۔ جیسے ہمارے گھر کوئی مہمان آیا ہوا ہو اور ہمارے گھر کے کسی آدمی کی طرف سے اس کے ساتھ اس قسم کی بات ہو جائے تو بڑا آدمی اس کو سنبھالنے کی کوشش کرتا ہے۔

اسی طرح اس موقع پر نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی دل جوئی کرتے ہوئے فرمایا: إِيهًا يَا ابْنَ الْخَطَّابِ: اے خطاب کے بیٹے! اور کہو، کیا کہتے ہو؟، وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ مَا لَقِيَكَ الشَّيْطَانُ سَالِكًا فَجًّا قَطُّ إِلاَّ سَلَكَ فَجًّا غَيْرَ فَجِّكَ [۱]: آپ کا حال تو یہ ہے کہ آپ جس راستے سے گذرتے ہیں، شیطان بھی اپنا راستہ بدل لیتا ہے یعنی جب آپ کے رعب کا یہ حال ہے کہ شیطان جیسا شیطان جو کسی کی رورعایت کرتا نہیں ہے، وہ بھی آپ سے ڈرتا ہے تو بھلا یہ کیوں نہیں ڈریں گی!۔

بہر حال! ان ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے ایک مرتبہ پوچھا۔

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کا مقام

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ یہ بھی بڑے جلیل القدر صحابی ہیں، انصاری ہیں، ان کا لقب تھا سید الانصار یعنی انصار کے سردار۔ یہ لقب بھی ان کو بارگاہِ نبوت سے عطا ہوا تھا، لوگ سید الانصار ہی کہتے تھے۔ بڑے زبردست عالم تھے اور علمِ قرأت کے ایسے ماہر تھے کہ بارگاہِ نبوت سے ان کو "أَقْرَأُهُمْ أُبَيٌّ" کا لقب عطا کیا گیا کہ حضراتِ صحابہ میں قرآنِ پاک کے سب سے بہتر اور زیادہ پڑھنے والے اور علمِ قرأت کے ماہر حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ ہیں [۲]، بڑا اونچا مقام تھا۔

---

① صحيح البخاری، عَنْ سَعْدِ بْنِ أَبِي وَقَّاصٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، كِتَابُ المَنَاقِبِ، بَابُ مَنَاقِبِ عُمَرَ بْنِ الخَطَّابِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، ر:۳۶۸۳.

② شرح السنة للبغوی، عن أنس بن مالك رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، باب مناقب أبي عبيدة بن الجراح رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، ر:۳۹۳۰.

بارگاہِ رسالت سے عطا کردہ القابات اور شاہی تمغے

ویسے تو بہت سے حضراتِ صحابہ تھے جو ماہر تھے لیکن کسی کے اندر کوئی وصف کسی کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہوتا ہے تو ان کی اس صفت اور خوبی کو ظاہر کرنے کے لیے نبیٔ کریم ﷺ کی طرف سے حضراتِ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کو خطابات دیے جاتے تھے۔ یہ شاہی اعزاز اور تمغے تھے جو بارگاہِ رسالت سے ملتے تھے، مثلاً: لِكُلِّ أُمَّةٍ أَمِينٌ وَأَمِينُ هَذِهِ الأُمَّةِ أَبُو عُبَيْدَةَ کہ: ہر امت کے اندر ایک امانت دار ہوتا ہے جس کے اندر یہ صفتِ امانت خصوصیت کے ساتھ پائی جاتی ہے اور میری امت کے اندر یہ حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ ہیں (۱)۔

حضرت ابی رضی اللہ عنہ کو قرآن سنانے کا حکم اور اس کی حکمت

بہرحال! نبیٔ کریم ﷺ کی طرف سے ایسے خطابات دیے جاتے تھے، حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کو بھی یہ خطاب ملا تھا۔ علمائے صحابہ، فقہائے صحابہ اور قرائے صحابہ میں شمار ہوتے تھے، چناں چہ ان کے اس مقام کا اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ بخاری شریف میں ہے: ایک مرتبہ نبیٔ کریم ﷺ نے حضرت ابی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ابی! اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمھیں سورۂ ﴿لَمْ يَكُنِ ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟﴾ پڑھ کر سناؤں۔

کبھی استاذ بھی شاگرد کے سامنے تعلیم کے لیے پڑھتا ہے، استاذ کا شاگرد کے سامنے پڑھنا بہ غرضِ تعلیم ہوتا ہے؛ چوں کہ ان کے ذریعہ سے یہ سلسلہ امت کے اندر جاری ہونے

---

(۱) صحيح البخارى، عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ، كِتَابُ المَغَازِي، بَابُ قِصَّةِ أَهْلِ نَجْرَانَ، ر:۴۳۸۲.

والا تھا اور ان کو بارگاہِ نبوت سے "أَقْرَأُهُمْ أُبَيٌّ" کا خطاب ملا تھا؛ اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے یہ خاص عنایت ہوئی اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ حکم ہوا کہ آپ ان کو سورۂ ﴿لَمْ يَكُنِ الَّذِينَ كَفَرُوا﴾ پڑھ کر سنائیے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ فرمایا تو حضرت ابی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: آللّٰهُ سَمَّانِي: اے اللہ کے رسول! کیا اللہ تعالیٰ نے میرا نام لے کر کہا کہ: سورۂ ﴿لَمْ يَكُنِ الَّذِينَ كَفَرُوا﴾ پڑھ کر مجھے سنائیں؟ میرا نام لے کر!۔

حضرت ابی رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ سوال کیوں کیا؟

کوئی آدمی سوال کرسکتا ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرما رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا کہ میں تمھیں سورۂ ﴿لَمْ يَكُنِ الَّذِينَ كَفَرُوا﴾ پڑھ کر کے سناؤں، پھر یہ سوال کرنے کا کیا مطلب ہے؟ حدیث کی تشریح کرنے والے علماء نے اس کی توضیح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایک عام انداز میں حکم دیا گیا ہو اور یہ بات کہی گئی کہ آپ اپنے صحابہ میں سے کسی کو یہ سورت سنائیے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے طور پر حضرت ابی رضی اللہ عنہ کو تجویز کیا ہو، تب بھی یہ کہا جاسکتا تھا کہ اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمھیں سورۂ ﴿لَمْ يَكُنِ الَّذِينَ كَفَرُوا﴾ پڑھ کر کے سناؤں۔ حالاں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے ان کے نام کی تجویز بھی ان کے لیے بہت بڑی سعادت تھی۔

ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہو

لیکن یہاں بات کو زیادہ صاف اور پکا کرنے کے لیے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ

نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا اللہ تعالیٰ نے میرا نام لے کر آپ کو یہ حکم دیا؟ نبیِ کریم ﷺ نے جواب دیتے ہوئے فرمایا: جی ہاں! اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کا نام لے کر یہ حکم فرمایا، بخاری شریف میں ہے کہ: یہ سن کر حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے [۱]۔ شرّاحِ حدیث نے لکھا ہے کہ: یہ آنسو خوشی کے آنسو تھے کہ اللہ تعالیٰ نے میرا نام لیا۔

ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

تقویٰ کی حقیقت حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی زبانی

ان ہی حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: اے ابی! تقویٰ کیا ہے؟ اس پر حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: سَلَكْتَ طريقًا ذا شَوْكَةٍ؟ اے امیر المؤمنین! آپ کبھی کسی کانٹے والے راستے سے گذرے ہیں؟ یعنی کوئی ایسا راستہ جس کے دونوں طرف کانٹے کی باڑ ہو اور بیچ میں سے پگڈنڈی ہے، اس پر سے گذرنا ہے، کیا کبھی ایسا موقع پیش آیا؟ تو اس کے جواب میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جی ہاں! تو اس پر حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے پوچھا: مَاذا فَعَلْتَ؟ اس موقع پر آپ نے کیا کیا؟ تو اس کے جواب میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: شَمَّرْتُ وَاجْتَهَدْتُ: میں نے اپنے کپڑوں کو بڑی کوشش اور اہتمام سے سمیٹا، ایسے انداز سے کہ کپڑے کانٹوں میں پھنس نہ جائیں، جسم کو بھی کانٹا لگنے نہ پائے، اس طرح اپنے آپ کو وہاں سے بچا کر لے گیا۔

---

(۱) صحيح البخاری، كِتَابُ المَنَاقِبِ، باب مَنَاقِبُ أُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ رضي الله عنه، ر:۳۸۰۹.

یہ جواب سن کر حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: بس! یہ دنیا گناہوں کے کانٹوں سے بھری ہوئی ہے: کہیں آنکھ کے گناہ ہیں، کہیں کان کے گناہ ہیں، کہیں زبان کے گناہ ہیں، گناہوں کی مختلف شکلیں ہیں، راستے میں گناہوں کے کانٹے بکھرے ہوئے ہیں، چاروں طرف لگے ہوئے ہیں اور آدمی کو الجھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ایسی صورت میں آدمی کو چاہیے کہ بڑی احتیاط کے ساتھ، بچ بچا کر نکلے، اپنے آپ کو ان کانٹوں میں الجھنے نہ دے اور کانٹوں کے لگنے سے بچا کر نکل جائے، اسی کا نام تقویٰ ہے[۱]۔

اسی موقع پر صاحبِ تفسیرِ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے کسی شاعر کا یہ قول نقل کیا ہے:

خَلِّ الذُّنُوبَ صَغِيرَهَا	وَكَبِيرَهَا ذَاكَ التُّقَى

گناہ چھوٹے ہوں یا بڑے، ان کو چھوڑ دو، اپنے آپ کو چھوٹے بڑے ہر قسم کے گناہوں سے بچا کر زندگی گزارنا، اسی کا نام تقویٰ ہے[۲]۔

تقویٰ کے بارے میں ایک عام غلط فہمی

اس تقوے کے متعلق ہمارے اندر بڑی غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے اور یہ جو غلط فہمی ہمارے ذہنوں میں بیٹھی ہوئی ہے، اسی نے ہمارا بیڑا غرق کر رکھا ہے، ہم اور آپ جب اس لفظ کو سنتے ہیں تو یہ سمجھتے ہیں کہ تقویٰ کا مطلب یہ ہے کہ آدمی رات بھر اللہ کی

---

(۱) تفسیر ابن کثیر: ۷۵/۱، تحت قوله تعالىٰ: ذَلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِلْمُتَّقِينَ.

(۲) تفسیر القرطبي: ۱٦۲/۱، تحت قوله تعالىٰ: ذَلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِلْمُتَّقِينَ [البقرة:۲] اور شعر ابن المعتز کا ہے۔

عبادت میں لگا رہے، ۲۴؍ گھنٹے اللہ کی یاد میں مشغول رہے، اور پھر یوں سمجھتے ہیں کہ یہ تو اللہ کے خاص بندوں کا کام ہے، بڑے لوگوں کی بات ہے، کہاں میں اور کہاں تقویٰ! کیا پدّی اور کیا پدّی کا شوربہ! یہ سوچ کر وہ دل ہی دل میں یہ فیصلہ کرتا ہے کہ وہ تو اللہ کے خاص خاص بندے ہیں جو یہ مقام حاصل کرتے ہیں، ہم تو روزے نماز کی پابندی کرلیں یہی کافی ہے۔ اس کی وجہ سے ہم نے تقویٰ کے حقیقی مفہوم کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔

تقویٰ اختیار کرنا ہر مؤمن پر فرض ہے

نہیں بھائی! ایسا نہیں ہے، قرآن اٹھا کر دیکھئے! قرآنِ پاک میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اہلِ ایمان کو تقویٰ اختیار کرنے کی بار بار بڑی تاکید فرمائی، امر کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے: ﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ ٱتَّقُواْ ٱللَّهَ﴾، ﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ ٱتَّقُواْ ٱللَّهَ﴾، ﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ ٱتَّقُواْ ٱللَّهَ﴾: اے ایمان والو! تقویٰ اختیار کرو۔ اہلِ علم موجود ہیں، وہ جانتے ہیں کہ جس چیز کا امر اور حکم دیا جاتا ہے، وہ ضروری اور واجب ہوجاتی ہے اور یہ خطاب تمام اہلِ ایمان کو ہے، ہر مؤمن اور ہر مسلمان کو باری تعالیٰ تقویٰ اختیار کرنے کا حکم دے رہے ہیں۔ یہ کوئی بڑے بڑے، خاص الخاص اور مقرب بندوں ہی کو حکم نہیں دیا جارہا ہے۔ ان آیتوں میں ہر مسلمان اس حکم کا مخاطب اور پابند ہے۔ مجھے، آپ کو، ہر مسلمان کو، ہر چھوٹے بڑے کو تقویٰ اختیار کرنا ہے، ہر ایک کے لیے اسے اختیار کرنا ضروری ہے، یہ نہیں کہ خاص خاص لوگوں کو یہ حکم دیا جارہا ہے۔

اللہ تعالیٰ ناممکن کاموں کا حکم نہیں دیتے

اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآنِ پاک میں باری تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا﴾[البقرۃ۲۸۶]: اللہ تعالیٰ کسی کو ایسا حکم نہیں دیتے جو اس کے بس میں نہ ہو، جس کو وہ انجام نہ دے سکے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے جب کسی کام کا حکم دیا جاتا ہے، کسی چیز کو ضروری اور فرض قرار دیا جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں کو یہ حکم دیا جارہا ہے، وہ اس کام کو انجام دے سکتے ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ کے اس حکم پر عمل کر سکتے ہیں، اگر یہ چیز ایسی ہوتی جس پر عمل کرنا ناممکن ہوتا تو ہرگز ہرگز اللہ تبارک وتعالیٰ اس کا حکم نہ دیتے، معلوم ہوا کہ تقویٰ ایک ایسی صفت ہے جس کو ہر مؤمن انجام دے سکتا ہے۔

کوئی گناہ صغیرہ نہیں ہے

اسی لیے تقویٰ اختیار کرنا ہر مؤمن پر فرض ہے؛ کیوں کہ تقویٰ نام ہے اپنے آپ کو اللہ کی نافرمانی سے بچانے کا، گناہوں سے بچانے کا، اللہ تبارک وتعالیٰ کی نافرمانی چاہے کسی بھی شکل میں ہو: چاہے معمولی شکل میں ہو، چاہے بڑے گناہ کی شکل میں ہو۔

ویسے گناہوں کے سلسلے میں علماء نے تقسیم کی ہے: کبیرہ یعنی بڑے گناہ، صغیرہ یعنی چھوٹے گناہ۔ اگرچہ بعض حضرات اس طرف گئے ہیں کہ ہر گناہ کبیرہ ہے؛ اس لیے کہ نافرمانی کس کی کی جارہی ہے؟ اللہ تبارک وتعالیٰ کی! اللہ تبارک وتعالیٰ کی عظمت، اس کی کبریائی، اس کا مقام ومرتبہ دیکھتے ہوئے اس کی معمولی سی نافرمانی بھی بہت بڑا گناہ

کہلائے گا[۱]۔

کوئی بڑا آدمی ہو: صدرِ جمہوریہ آجائے، وزیرِ اعظم آجائے، اس کی شان کے خلاف کوئی ذراسی بات کہہ دے گا، بے ادبی کرے گا تو اس کو بھی بہت بڑا رُخ دے دیا جائے گا کہ بہت بڑی گستاخی کرلی کیوں کہ جس کے ساتھ یہ برتاؤ کیا جارہا ہے، وہ بڑا ہے تو یہاں اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات جو عظمت وجلال والی ہے، اس کی معمولی سی نافرمانی بھی بہت بڑی سمجھی جائے گی؛ اس لیے سب گناہ کبیرہ ہی کبیرہ ہے، یہاں صغیرہ کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔

گناہوں کی تقسیم کے سلسلے میں محقّق فیصلہ

لیکن جمہور علماء قرآن وحدیث کی نصوص دیکھ کر تفصیل کرتے ہیں کہ ہر گناہ کبیرہ نہیں ہے، کچھ گناہ ایسے ہیں جو کبیرہ ہیں اور کچھ ایسے ہیں جو صغیرہ ہیں، پھر اس میں بہت ساری تفصیلات بیان کی گئی ہے کہ کبیرہ ایسے گناہ ہیں جن کے اوپر قرآن یا حدیث میں وعید اور دھمکیاں آئی ہیں کہ یہ کروگے تو یہ سزا ملے گی، یہ کروگے تو جہنم میں ڈالے جاؤ گے اور یہ کروگے تو اس طرح تم کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے عذاب دیا جائے گا۔ ہر وہ گناہ جس پر کسی خاص قسم کی وعید آئی ہے، کسی خاص عذاب سے ڈرایا گیا ہے، ایسے

---

۱ عَنْ ابْن عَبَّاس رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا: كُلّ شَيْء نُهِيَ عَنْهُ فَهُوَ كَبِيرَة. وَبِهَذَا قَالَ الْأُسْتَاذ أَبُو إِسْحَاق الْإِسْفَرَايِينِيّ.... وَحَكَى الْقَاضِي عِيَاض رَحِمَهُ اللّه هَذَا الْمَذْهَب عَنْ الْمُحَقِّقِينَ. وَاحْتَجَّ الْقَائِلُونَ بِهَذَا بِأَنَّ كُلّ مُخَالَفَة فَهِيَ بِالنِّسْبَةِ إِلَى جَلَال اللّه تَعَالَى كَبِيرَة. (شرح مسلم للنووی، ۱ / ۱۸۹باب بَيَانِ الْكَبَائِرِ وَأَكْبَرِهَا)

تمام گناہوں کو ''کبیرہ'' کہا جاتا ہے اور یہ توبہ کے بغیر معاف نہیں ہوتے اور جو ایسے نہیں ہیں، وہ ''صغیرہ'' ہیں ①۔ صغیرہ اور کبیرہ کے سلسلے میں اور بھی تفصیلات ہیں۔

چھوٹے گناہ کیسے معاف ہوتے ہیں؟

یہ صغیرہ ایسے گناہ ہیں جو توبہ کے بغیر اعمالِ صالحہ کے ذریعہ بھی معاف ہو جاتے ہیں، ﴿إِنَّ ٱلْحَسَنَـٰتِ يُذْهِبْنَ ٱلسَّيِّـَٔاتِ﴾: نیکیاں آدمی کے گناہوں کو مٹا دیتی ہیں۔ جیسا کہ حدیث میں آتا ہے کہ آدمی جب وضو کرتا ہے اور کلی کرتا ہے تو زبان سے جو گناہ صادر ہوئے، وہ سب جھڑ جاتے ہیں، چہرہ دھوتا ہے تو آنکھوں سے صادر ہونے والے گناہ معاف ہو جاتے ہیں اور جب ہاتھ دھوتا ہے تو ہاتھوں سے صادر ہونے والے گناہ معاف ہو جاتے ہیں، جب پاؤں دھوتا ہے تو پاؤں سے ہونے والے گناہ معاف ہو جاتے ہیں ②۔

اسی طرح حدیث میں آتا ہے کہ ایک نماز سے دوسری نماز تک جو گناہ کیے، وہ بعد والی نماز سے معاف ہو جاتے ہیں تو صغیرہ گناہ، چھوٹے چھوٹے گناہ صرف اعمالِ صالحہ کی برکت سے اللہ تبارک وتعالیٰ معاف کر دیتے ہیں ③۔

لیکن صغیرہ گناہ بھی آدمی قصداً نہ کرے اور بار بار نہ کرے، اگر بار بار کرے گا تو

---

① شرح مسلم للنووی، ۱ / ۱۸۹ باب بَيَانِ الْكَبَائِرِ وَأَكْبَرِهَا.

② صحیح مسلم، عَنْ عَمْرِو بْنِ عَبَسَةَ، بَابُ إِسْلَامِ عَمْرِو بْنِ عَبَسَةَ

③ صحیح مسلم، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ، بَابُ الصَّلَوَاتِ الْخَمْسِ وَالْجُمُعَةِ إِلَى الْجُمُعَةِ الخ

وہ صغیرہ نہیں رہے گا، کبیرہ ہو جائے گا[۱]۔ قصداً تو کرنا ہی نہیں ہے، جان بوجھ کر اور بالارادہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنا بہت خطرناک ہے۔

کبائر کے ساتھ صغائر سے بھی بچنا تقویٰ ہے

بہرحال! یہ دونوں ہی قسم کے گناہ نافرمانی کے قبیل سے ہیں، اپنے آپ کو اس سے بچایئے، اسی کا نام ''تقویٰ'' ہے اور اسی کو ''پرہیز'' کہتے ہیں یعنی اپنے آپ کو بچانا، جیسے بیمار ہوتا ہے تو اس بیماری کے اندر جو چیزیں نقصان دینے والی ہیں، دوا اور علاج کے اثر کو ختم کرنے والی ہیں، مریض ایسی چیزوں سے اپنے آپ کو بچاتا ہے، اسی کو ''پرہیز'' کہا جاتا ہے، اس کو اختیار کرنے سے ڈرتا ہے، اس لیے اس کو ''ڈر'' سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے، یہ تقویٰ کی حقیقت ہے یعنی اپنے آپ کو گناہوں سے بچانا۔

گناہوں نے بیڑا غرق کر رکھا ہے

دنیا میں اگر کوئی خطرناک چیز ہے تو وہ یہی گناہ اور اللہ کی نافرمانی ہے، یہی ہے جس نے ساری دنیا کا بیڑا غرق کر رکھا ہے۔ ﴿ظَهَرَ ٱلْفَسَادُ فِى ٱلْبَرِّ وَٱلْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِى ٱلنَّاسِ لِيُذِيقَهُم بَعْضَ ٱلَّذِى عَمِلُوا۟﴾ [الروم۴۱] لوگوں کے کرتوتوں اور بدعملی کے نتیجے میں زمین میں اور سمندر میں، خشکی میں اور تری میں فساد پھیل گیا ہے۔ ویسے تو گناہوں کا پورا بدلہ اور اس کی مکمل سزا آخرت ہی میں ملنے والی ہے لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کسی کسی گناہ کی سزا بہ طورِ نمونہ دنیا میں بھی دے دیا کرتے ہیں۔

---

① إحياء علوم الدين ٤/ ١٨، بيان أقسام الذنوب بالإضافة إلى صفات العبد.

زمین کی ویرانیاں گناہوں کا نتیجہ

بہرحال !اللہ فرماتے ہیں کہ دنیا میں جتنی خرابیاں ہیں: بے برکتی، بیماریاں، ظلم وبربریت، فتنہ وفساد۔ ان سب کا منبع اور بنیادو جڑ گناہ اور نافرمانی ہے۔ اسی آیت کی تفسیر میں صاحبِ روح المعانی نے ضحاک رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل فرمایا ہے کہ جس وقت اللہ تبارک وتعالیٰ نے کائنات کو پیدا فرمایا تو پوری زمین سرسبز وشاداب تھی، کوئی زمین بنجر، غیرآباد اور خالی نہیں تھی، جیسے ہمارے بعض علاقوں میں دیکھیں گے تو میلوں تک کوئی زمین کھیتی کے قابل نظر نہیں آتی۔ اس طرح ابتدا میں کوئی زمین خالی نہیں تھی، ساری زمین سرسبز وشاداب تھی، تمام درخت پھل دینے والے، پانی سارا میٹھا، کہیں کوئی کانٹے دار درخت نہیں تھا۔

سب سے پہلے حضرت آدم علی نبینا وعلیہ الصلاۃ والسلام کے بیٹے قابیل نے اپنے بھائی ہابیل کو قتل کیا تو زمین کے اندر ایک بھونچال سا آگیا اور اسی کے بعد زمین کا ایک حصہ بنجر ہوگیا، کانٹے دار درخت اُگ نکلے، سمندروں کا پانی کھارا اور شور ہوگیا اور وہیں سے خرابی کی شروعات ہوئی اور اسی گناہ کے نتیجے میں دنیا میں برائیاں، گناہ اور نافرمانیاں عام ہوتی گئیں [۱]۔

نیکی کی برکت اور گناہ کی نحوست

مسندِ احمد کی ایک روایت میں ہے کہ: آدمی اپنے گناہ کی وجہ سے روزی سے محروم

---

[۱] روح المعاني، ١١/ ٤٨

کر دیا جاتا ہے۔ کتابوں میں لکھا ہے کہ: بنو امیہ کے دورِ خلافت میں ان کے خزانے میں گیہوں کا ایک دانہ بڑے انڈے کے برابر تھا اور لکھا تھا کہ یہ اس زمانے کا ہے جب لوگوں میں خیر اور نیکی عام تھی①۔

اسی لیے مسلم شریف اور دوسری کتبِ حدیث میں ہے کہ: آخری زمانے میں جب حضرت عیسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلوۃ والسلام تشریف لائیں گے، اس وقت ایک انار سے اتنا رس نکلے گا کہ پوری جماعت کی سیرابی اور شکم سیری کے لیے کافی ہو جائے گا اور وہ انار اتنا بڑا ہوگا کہ اس کے چھلکے میں پوری جماعت سایہ حاصل کرے گی②۔ یہ نیکی کی برکتیں ہیں، جیسے وہ گناہوں کی نحوست ہے۔

گناہ کا وبالِ عظیم

بہر حال! یہ گناہ بڑی خطرناک چیز ہے اور ساری خرابیاں اسی سے پیدا ہوتی ہیں اور اس کا سب سے خطرناک نتیجہ یہ ہے کہ آدمی کے دل میں اللہ تبارک وتعالیٰ سے دوری پیدا ہو جاتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ اللہ والوں سے بھی دور ہو جاتا ہے اور دل میں ایک بے چینی کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

ظاہر ہے کہ جب آدمی اللہ تبارک وتعالیٰ کی نافرمانی کرے گا تو کہاں سکون پا سکتا ہے۔ اس کے دل میں ایک آگ لگی ہوئی ہے، اب چاہے اس کے گھر میں اے سی (A/C)

---

① مسند أحمد، عن أبي قحدم، ر:۷۹۳٦.

② صحيح مسلم، عَنِ النَّوَّاسِ بْنِ سَمْعَانَ، باب ذِكْرِ الدَّجَّالِ وَصِفَتِهِ وَمَا مَعَهُ.

لگا ہوا ہو، شان دار پلنگ ہو، عمدہ بستر ہو، خوشبو مہک رہی ہے، ان سب کے باوجود نیند نہیں آرہی ہے، نیند لانے کے لیے گولیاں کھانی پڑتی ہیں اور گولیاں کھا کر بھی نیند نہیں آتی۔ دل میں آگ لگی ہوئی ہے، یہ سب اسی کا نتیجہ ہے۔ اے سی (A/C) جسم کی ظاہری کھال کو تو ٹھنڈا کرسکتا ہے لیکن دل کی آگ کو ٹھنڈا نہیں کرسکتا، اس کے لیے تو توبہ اور انابت الی اللہ کی ضرورت ہے۔

بہرحال! یہ گناہ بڑی خطرناک چیز ہے اور اسی سے اپنے آپ کو بچانے کا نام تقویٰ ہے جو بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

پسندیدہ آدمی کون؟

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما جو نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا زاد بھائی ہیں اور نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جن کے لیے دعا فرمائی تھی: اللَّهُمَّ عَلِّمْهُ التَّأْوِيلَ وَفَقِّهْهُ فِي الدِّينِ (۱): اے اللہ! انھیں قرآن کا علم اور دین کی سمجھ بوجھ عطا فرما۔ حِبر الامّۃ (امت کے بڑے زبردست عالم) ان کا لقب تھا۔

ان سے کسی نے پوچھا: رَجُلٌ قَلِيلُ الْعَمَلِ قَلِيلُ الذُّنُوبِ أَعْجَبُ إِلَيْكَ، أَوْ رَجُلٌ كَثِيرُ الْعَمَلِ كَثِيرُ الذُّنُوبِ؟: ایک آدمی ہے جو اعمال زیادہ نہیں کرتا، صرف فرائض اور واجبات کا اہتمام کرتا ہے، نوافل کا زیادہ اہتمام نہیں کرتا لیکن گناہوں سے اپنے آپ کو بچاتا ہے، گناہوں کی مقدار بہت کم ہے، أَعْجَبُ إِلَيْكَ: ایسا آدمی آپ کی نگاہوں

(۱) المستدرك على الصحيحين، ذِكْرُ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا، ر:۶۲۸۰.

میں اچھا ہے، پسندیدہ ہے؟ یا ایک دوسرا آدمی ہے: رَجُلٌ كَثِيرُ الْعَمَلِ كَثِيرُ الذُّنُوبِ: نیکی کے کام بھی بہت کرتا ہے: تہجد پڑھتا ہے، اشراق پڑھتا ہے، چاشت پڑھتا ہے، اوّابین پڑھتا ہے، باجماعت نماز ادا کرتا ہے لیکن گناہ بھی کثرت سے کرتا ہے: غیبت بھی کرتا ہے، جھوٹ بھی بولتا ہے، حلال اور حرام میں تمیز نہیں کرتا، پڑوسیوں کو تکلیف پہنچاتا ہے، لوگوں کے متعلق بدگمانی میں مبتلا ہے، لوگ اس کی ایذا رسانی سے مامون اور محفوظ نہیں ہیں، گھر میں بھی سب اس سے پریشان رہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ نیکیوں کے ساتھ ساتھ گناہوں کا بھی سلسلہ ہے۔ نیکیاں زیادہ مقدار میں کرتا ہے تو گناہوں سے بھی نہیں بچتا۔ یہ اچھا ہے یا وہ اچھا ہے؟۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے جواب میں ارشاد فرمایا: لاَ أَعْدِلُ بِالسَّلاَمَةِ [1] : جو آدمی اپنے آپ کو گناہوں سے بچا رہا ہے، اس کے اس وصف کا میں کسی اور چیز سے مقابلہ نہیں کرسکتا، اس کی یہ خوبی وہ ہے جو سب سے عمدہ اور اچھی ہے، یہی اصل ہے۔

رمضان کے روزوں کی فرضیت کی حکمت

رمضان کا مہینہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہم کو کیوں عطا فرمایا؟ ہر عبادت کی ایک خاصیت ہے: نماز ایک عبادت ہے، اس کی ایک خاصیت ہے، اللہ فرماتے ہیں: ﴿إِنَّ ٱلصَّلَوٰةَ تَنْهَىٰ عَنِ ٱلْفَحْشَآءِ وَٱلْمُنكَرِ﴾[العنکبوت۴۵] کہ: نماز گناہ اور بے حیائی کے کاموں سے روکتی ہے۔ اسی طرح روزہ ایک عبادت ہے، اس کی بھی ایک خاصیت ہے:

(۱) السنن الكبرى للنسائي، عَنْ قَيْسِ بْنِ حَبْتَرٍ، كِتَابُ الْمَوَاعِظِ، ر:۱۱۸۳۹.

﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ كُتِبَ عَلَيۡكُمُ ٱلصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى ٱلَّذِينَ مِن قَبۡلِكُمۡ لَعَلَّكُمۡ تَتَّقُونَ ١٨٣﴾ [البقرة] روزے کے نتیجے میں آدمی کو تقویٰ حاصل ہوتا ہے۔

روزہ تقوے کا ابتدائی نصاب ہے

حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: روزہ تقوے کا ابتدائی نصاب ہے، پرائمری کورس (primary course) ہے؛ اس لیے کہ روزہ کا مطلب کیا ہے؟ روزہ کا مطلب ہے کہ صبحِ صادق سے لے کر غروبِ آفتاب تک عبادت کی نیت سے، اللہ کو راضی کرنے کے لیے آدمی اپنے آپ کو تین چیزوں سے بچائے: (۱) کھانے (۲) پینے اور (۳) اپنی بیوی کے ساتھ صحبت کرنے سے۔ اب یہ تین کام: کھانا، پینا، اور اپنی بیوی کے ساتھ صحبت کرنا حلال ہیں لیکن جب وہ اللہ کو راضی کرنے کے لیے روزہ رکھ کر حلال چیزوں سے اپنے آپ کو بچائے گا تو اللہ کو راضی کرنے کے لیے اس کی حرام کی ہوئی چیزوں سے بھی ضرور اپنے آپ کو بچائے گا۔

اللہ تعالیٰ تو مجھے دیکھ رہے ہیں

دیکھیے! گنہگار سے گنہگار مسلمان بھی ایک مرتبہ روزے کی نیت کرلے گا نا تو اس کے بعد سوچ بھی نہیں سکتا کہ ان کاموں میں سے کوئی کام کرے۔ ایک بدمعاش قسم کا آدمی ہے، اس نے روزے کی نیت کرلی کہ آج میرا روزہ ہے۔ اب سخت گرمی ہے جس کی وجہ سے اس کو سخت پیاس لگی ہوئی ہے، حلق میں کانٹے پڑ رہے ہیں اور پیاس کی شدّت سے بے چین ہے، کمرے میں بیٹھا ہوا ہے، کمرہ بند ہے اور فریز میں ٹھنڈا پانی

اور ٹھنڈا جیوس موجود ہے لیکن وہ اس کو ہاتھ بھی نہیں لگائے گا، اس کو پی کر پیاس بجھانے کی سوچے گا بھی نہیں؛ کیوں کہ اس کو یقین ہے کہ اس کمرے میں اگر چہ دیکھنے والا کوئی انسان موجود نہیں ہے لیکن اللہ تعالیٰ تو مجھے دیکھ رہے ہیں۔

روزہ اپنی زندگی کو تقوے والی بنا دیتا ہے

یہ تصور کہ ''اللہ تعالیٰ تو مجھے دیکھ رہے ہیں'' اس کو اپنے پوری زندگی میں اتارنے کے لیے اور اس کی مشق کے لیے یہ روزہ فرض کیا گیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لیے اس کی حلال کی ہوئی چیزوں کو چھوڑنے کی عادت ڈالے گا تو اس کی حرام کی ہوئی چیزوں کو چھوڑنا آسان ہو جائے گا اور کوئی بھی حرام کام کرنے سے پہلے یہ تصور اس پر غالب آئے گا کہ اللہ تعالیٰ تو مجھے دیکھ رہے ہیں۔

گناہوں کے ساتھ نوافل کی انجام دہی زیادہ سودمند نہیں

جس آدمی کے دل میں دین پر عمل کا داعیہ اور جذبہ پیدا ہوتا ہے تو وہ نوافل کی طرف لپکتا ہے کہ بھائی! نوافل زیادہ سے زیادہ پڑھو، صدقہ خیرات کرو۔ یہ نوافل اپنی جگہ پر ہیں، اس کے اجر و ثواب سے انکار نہیں ہے لیکن بھائی! ایک آدمی تلاوت، تسبیح، اوابین، اشراق، چاشت، صدقہ خیرات، نفل روزے ان سب کا اہتمام کرتا ہے لیکن گناہوں سے بچنے کا اہتمام نہیں کرتا۔

نوافل کی حقیقت

اب دیکھئے! نوافل کا خلاصہ تو اتنا ہی ہے کہ یہ کام اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے

ہم پر لازم اور فرض نہیں کیا گیا۔ اگر ہم کریں تو اس پر ثواب ملے گا اور اگر نہ کریں تو اس پر کوئی پوچھ اور گرفت نہیں ہوگی، کل کو قیامت کے دن یہ سوال ہرگز نہیں ہوگا کہ آپ نے تہجد کی نماز کیوں نہیں پڑھی؟ اگر پڑھی ہے تو اس پر اجر وثواب ملے گا لیکن نہ پڑھنے پر قیامت کے دن گرفت نہیں ہوگی۔ نفل روزہ اگر نہیں رکھتے تو کل کو قیامت کے دن میدانِ حشر میں یہ سوال نہیں ہوگا کہ آپ نے عاشورا کا روزہ کیوں نہیں رکھا، عرفے کا روزہ کیوں نہیں رکھا، ایامِ بیض کے روزے کیوں نہیں رکھے، ہر جمعرات اور پیر کے روزے کیوں نہیں رکھے؟ یہ سوال نہیں ہوگا۔ اور نہ یہ پوچھا جائے گا کہ صدقہ خیرات کیوں نہیں کیا۔ آدمی اگر ان اعمال کو انجام دیتا ہے تو اس پر ثواب ملے گا اور اگر نہیں کرتا تو فرائض اور واجبات انجام دینے کی صورت میں اس پر کوئی گرفت نہیں ہوگی۔

ہر قسم کا گناہ باعثِ مواخذہ

لیکن اگر آدمی گناہ کا ارتکاب کرتا ہے تو گناہ چاہے چھوٹے سے چھوٹا ہو، اس پر اللہ تبارک وتعالیٰ گرفت فرمائیں گے؛ اس لیے حدیث میں آتا ہے کہ: چھوٹے گناہوں کو بھی معمولی مت سمجھو، اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اس پر بھی گرفت ہوگی، سوال ہوگا۔ گناہ ایسی چیز ہے جو آدمی کو کسی بھی وقت اللہ تبارک وتعالیٰ کی ناراضگی کا مورِد بنا سکتی ہے، اس کے نتیجے میں وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ناراضگی کا نشانہ بن سکتا ہے۔

قصداً گناہ کو انجام دینا مؤمن کی شان کے خلاف

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا کہ بدنظری یعنی پرائی عورت کو دیکھنا

صغیرہ ہے یا کبیرہ؟ چھوٹا گناہ ہے یا بڑا گناہ؟۔

بعض لوگ کیا سوچتے ہیں؟ یہ سوچتے ہیں کہ صغیرہ ہو تو کر ڈالیں اور کبیرہ ہو تو اس سے بچیں، حالاں کہ علماء نے لکھا ہے کہ: قصداً کسی گناہ کو کرنا، چاہے وہ صغیرہ ہو یا کبیرہ، یہ مؤمن کی شان ہے ہی نہیں۔ ایمان کا تقاضا کیا ہے؟ اللہ کو اپنا رب سمجھتا ہے، خالق و مالک سمجھتا ہے تو وہ جان بوجھ کر کسی گناہ کو انجام دینے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا؛ اس لیے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی شان تو بہت بڑی ہے، اس کی شان تو بڑی عظمت اور کبریائی والی ہے اور کسی بڑی شان والے کی شان میں ادنیٰ سی گستاخی بھی بہت بڑی سمجھی جاتی ہے۔

اعمالِ صالحہ سے کبائر معاف نہ ہونے کی حکمت

یہ چھوٹے گناہ بعض مرتبہ نادانستگی اور غفلت میں ہو جاتے ہیں، قصداً انہیں کرتا۔ فضائلِ نماز میں حضرت شیخ مولانا زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ’نماز سے اور دوسرے اعمال سے چھوٹے چھوٹے گناہ معاف ہوتے ہیں اور بڑے گناہ بغیر توبہ کے معاف نہیں ہوتے‘‘ اس کی وجہ اپنے والدِ بزرگ وار حضرت مولانا یحییٰ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے لکھی ہے۔ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میرے والد فرماتے تھے کہ: مؤمن سے بڑے گناہ صادر ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، ہاں! چھوٹے گناہ بھول سے بے خبری میں صادر ہو جاتے ہیں تو ان کے لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے معافی کا راستہ رکھ دیا کہ نماز پڑھو تو یہ معاف ہو جائیں گے، وضو کر رہے ہو تو زبان سے جو گناہ ہوئے وہ،

آنکھ سے جو گناہ ہوئے وہ، کان سے جو گناہ ہوئے وہ، سب معاف ہو جاتے ہیں، وغیرہ لیکن بڑا گناہ توبہ کے بغیر معاف نہیں ہوتا اور بڑا گناہ تو مؤمن کرتا ہی نہیں، جب کر لے گا تو توبہ کیے بغیر اس کو چین نہیں آئے گا۔

رہ گئی رسمِ اذاں، روحِ بلالی نہ رہی

یہ مضمون آپ نے ''فضائلِ نماز'' میں تو سنا ہی ہوگا، ہر جگہ فضائل کی کتابیں پڑھی جاتی ہیں۔ لوگ پڑھتے بھی ہیں اور سنتے بھی ہیں لیکن سب سر کے اوپر سے گذر جاتا ہے، احساس ہی نہیں کہ کیا پڑھا جا رہا ہے، کیا پیش کیا جا رہا ہے۔ ایک ایک لفظ بڑا قیمتی ہے؛ کیوں کہ قرآن و حدیث کی چیزیں حضرت نے پیش کی ہیں۔

یہ کوئی ہنسنے کی چیز نہیں ہے، ہم نے پورے دین کو رسم بنا لیا ہے، ہماری نمازیں بھی رسمی ہو گئی ہیں، عبادتیں بھی رسمی ہو گئیں، یہ فضائل کی کتابیں بھی جو سنی سنائی جاتی ہیں، وہ رسمی بن گئی ہیں۔ لوگ جب اہتمام اور توجہ کے ساتھ دین کی باتوں کو سنتے ہیں تو ان پر اس کا اثر کچھ اور ہی ہوتا ہے۔

یقیں ہوتا تو چال بدل جاتی

حضرت مولانا مسیح اللہ صاحب جلال آبادی رحمۃ اللہ علیہ ایک مرتبہ کسی مدرسے میں تشریف لے گئے، طلبہ سے پوچھا کہ: تم کو بتایا گیا ہے کہ تم طالبِ علم ہو؟ دین کا علم سیکھنے کے لیے آئے ہو؟ پھر فرمایا کہ: تم کو یہ بھی بتایا گیا ہے نا کہ طالبِ علم جب چلتا ہے تو اس کے پیروں کے نیچے فرشتے پر بچھاتے ہیں۔ جواب دیا کہ: ہاں! فرمایا کہ اس کا تم کو

یقین ہے؟ تو طلبہ خاموش ہو گئے۔ حضرت نے فرمایا کہ اگر تمھیں اس کا یقین ہوتا تو تمھاری چال کا انداز بدل جاتا۔

ہمارے وضو اور ہماری نماز کا حال

ہمیں معلوم ہے، حضور ﷺ بتلاتے ہیں کہ وضو کرتے وقت جب آدمی کلی کرتا ہے تو زبان سے جو گناہ صادر ہوئے، وہ جھڑ جاتے ہیں۔ اگر وضو کرتے وقت یہ یقین ہمارے دل کے اندر موجود ہو، یہ احساس زندہ ہو تو ہمارے وضو کا انداز بدل جائے گا، وہ کیفیت نہیں رہے گی جو ابھی ہے کہ لشتم پشتم یوں پانی مارا اور توں مارا اور بھاگے اور بھاگتے ہوئے آکر امام صاحب رکوع میں ہیں، ان کو وہاں پکڑ لیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چھلانگ لگا رہے ہیں۔ کسی کھیل کے میدان میں کھلاڑی چھلانگیں لگاتا ہے نا، ہم وضو خانے میں ویسی چھلانگیں لگاتے ہیں، یہ ہمارا حال ہو گیا ہے۔ وہ کیفیت نہیں رہی جو ہونی چاہیے۔

گناہ کو چھوٹا سمجھ کر انجام دینا اپنی ہلاکت کو دعوت دینا ہے

بہر حال! اس آدمی نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا کہ بدنظری صغیرہ گناہ ہے یا کبیرہ؟ حضرت نے جواب میں فرمایا کہ: چنگاری چھوٹی سمجھ کر کوئی آدمی اس کو اپنے کپڑے کے بکسے میں رکھتا نہیں ہے، چنگاری چھوٹی ہو یا بڑی، آدمی اس سے اپنے آپ کو بچاتا ہے؛ اس لیے کہ جس طرح بڑا انگارہ آگ لگاتا ہے، اسی طرح چھوٹی چنگاری بھی آگ لگا دیتی ہے اور آدمی کے خرمنِ ایمان کو تباہ کر دیا کرتی ہے۔

ایک گناہ بھی کبھی ایمان کی تباہی کے لیے کافی ہوتا ہے

تقویٰ کا مطلب سمجھے یا نہیں؟ تقویٰ کا مطلب یہ ہوا کہ اپنے آپ کو ہر چھوٹے بڑے گناہ سے بچانا، کیا یہ ہر مؤمن کے لیے ضروری ہے یا نہیں؟ اب وہ جو تم نے ذہنوں میں بٹھا رکھا ہے کہ یہ بڑے لوگوں کا کام ہے۔ نہیں، یہ تو ہر ایک پر فرض ہے، ہر مؤمن کے لیے ضروری ہے کہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچائے۔ کسی بھی گناہ کو چھوٹا سمجھ کر ہرگز ہرگز نہ کیا جائے۔

اسی لیے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا مقولہ ہے کہ: کسی گناہ کو چھوٹا سمجھ کر مت کرو، کہیں وہی گناہ آپ کی گرفت کا ذریعہ نہ بن جائے، اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اس پر آپ کی پکڑ ہو جائے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک گناہ ہوتا ہے اور آدمی اسی گناہ کے نتیجے میں ایمان سے محروم ہو جاتا ہے۔

بدنظری کا وبال

ایک آدمی کی موت کا وقت قریب آیا، لوگ اس کو کلمے کی تلقین کرنے لگے تو اس نے کہا کہ: ایک عورت کپڑا خریدنے کے لیے آئی تھی، وہ مجھے اچھی لگی اور میں اسے دیکھتا رہا، اسی گناہ کی وجہ سے اب میری زبان کے اوپر کلمہ نہیں چڑھ رہا ہے؛ اس لیے چھوٹا سا گناہ بھی کبھی آدمی کی ہلاکت اور ایمان سے محرومی کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

کسی نیکی کو حقیر نہ سمجھو

اسی طرح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ: کسی نیکی کو چھوٹا سمجھ کر مت چھوڑو، پتہ

نہیں کون سی نیکی اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں نجات کا ذریعہ بن جائے[۱]۔

بڑے بڑے لوگوں کو دیکھتے ہیں، ان کے قصے سنتے ہیں جن کی زندگیاں دین پر عمل کرتے ہوئے گذریں، دین کی خدمت میں گذریں، اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرماں برداری میں گذریں۔ دین کا کوئی شعبہ ایسا نہیں تھا جس میں انھوں نے حصہ نہ لیا ہو اور اللہ کی اطاعت وفرماں برداری کا کوئی کام ایسا نہیں تھا جو انھوں نے کیا نہ ہو لیکن اس کے باوجود جب وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے تو کسی چھوٹے سے عمل پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کی مغفرت کا فیصلہ سنا دیا۔

مؤمن کو ہر نیکی کا حریص ہونا چاہیے

پیاسے کتے کو پانی پلا دیا تو ایک بدکار عورت کے لیے اللہ تعالیٰ نے جنت کا فیصلہ کر دیا، کتے جیسے جانور کو پانی پلانے پر یہ فیصلہ! ایک مؤمن کی شان اور اس کا حال تو یہ ہونا چاہیے کہ وہ ہر نیکی کا حریص اور لالچی ہو، ہر نیکی اس امید میں کرے کہ پتہ نہیں، اللہ اسی پر میری مغفرت کر دے، مجھے نجات دے دے اور جنت کا فیصلہ ہو جائے اور ہر

---

① اس طرح کے قریب المعنی اقوال بہت سے صحابہ سے منقول ہیں اور حدیثِ مرفوع بھی وارد ہے لیکن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اس اثر پر میں مطلع نہیں ہو سکا، البتہ حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کا ایسا ہی قول کتابوں میں پایا جاتا ہے: تَمَامُ التَّقْوَى أَنْ يَتَّقِيَ اللَّهَ الْعَبْدُ حَتَّى يَتَّقِيَهُ فِي مِثْقَالِ ذَرَّةٍ، حَتَّى يَتْرُكَ بَعْضَ مَا يَرَى أَنَّهُ حَلَالٌ، خَشْيَةَ أَنْ يَكُونَ حَرَامًا، يَكُونُ حِجَابًا بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْحَرَامِ، فَإِنَّ اللَّهَ قَدْ بَيَّنَ لِلْعِبَادِ الَّذِي يُصَيِّرُهُمْ إِلَيْهِ قَالَ اللَّهُ: {فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ} [الزلزلة:۷] فَلَا تَحْقِرَنَّ شَيْئًا مِنَ الشَّرِّ أَنْ تَتَّقِيَهُ، وَلَا شَيْئًا مِنَ الْخَيْرِ أَنْ تَفْعَلَهُ.

(الزهد والرقائق لابن المبارك:۱۹۲، بَابٌ فِي التَّقْوَى)

گناہ سے اس نیت سے بچے کہ پتہ نہیں، اس پر گرفت ہو جائے اور جہنم میں پھینک دیا جاؤں تو کیا حال ہوگا۔

دودھ والی رات یاد ہے؟

ایک بزرگ کا انتقال ہوا، انتقال کے بعد کسی نے ان کو خواب میں دیکھا تو پوچھا کہ کیا ہوا؟ جواب دیا کہ اللہ کے حضور میں پیشی ہوئی، مجھے پوچھا گیا کہ ہمارے دربار میں کیا لے کے آئے ہو؟ انھوں نے نماز، روزہ وغیرہ اعمال کے بارے میں سوچا لیکن کسی عمل کے بارے میں یہ کہنے کی ہمت نہیں ہوئی کہ یہ عمل لے کر کے آیا ہوں۔ بہت سوچنے کے بعد کہا کہ: توحید لے کر آیا ہوں۔

توحید کا مطلب کیا ہے؟ اللہ کو ایک سمجھنا اور یہ سمجھنا کہ نفع اور نقصان سب کچھ اسی کے ہاتھ میں ہے، اس کے حکم کے بغیر کچھ نہیں ہوتا، وہی ہر چیز کا مالک ہے، وہی ہر چیز کرتا ہے۔

اس کے جواب میں باری تعالیٰ کی طرف سے کہا گیا کہ: دودھ والی رات یاد ہے؟ کیا ہوا تھا؟ ایک رات ان کے پیٹ میں درد پیدا ہوا تو زبان سے یہ نکلا کہ آج دودھ پی لیا تھا، اس کی وجہ سے یہ درد ہو رہا ہے۔ تو گویا تم نے پیٹ میں درد کا سبب دودھ کو سمجھا، یہی توحید ہے! یہ سن کر ڈر گئے کہ اب تو میں مارا گیا۔

ہم اس کی رحمتوں کے سہارے چلے گئے

اس کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے کہا گیا کہ: ایک روز سردی کی رات

میں بلّی کا ایک بچہ سردی اور ٹھنڈی کی وجہ سے ٹھٹھر رہا تھا، تم نے اس کو اپنی کمبل میں جگہ دی اور اس کو راحت پہنچائی تھی، اسی پر تم کو بخش دیا۔

تو دیکھئے! میں یہ عرض کر رہا تھا کہ کسی گناہ کو چھوٹا سمجھ کر مت کرو اور کسی نیکی کو بھی چھوٹا سمجھ کر مت چھوڑو۔

رحمتِ خدا بہانہ می جوید

ایک بہت بڑے عالم کا انتقال ہوا۔ دنیا میں جب تک رہے، دین کی بڑی خدمات کیں: درس وتدریس، دعوت وتبلیغ، وعظ وتذکیر، تصنیف وتالیف۔ مختلف شکلوں میں خدمات دیتے ہوئے پوری زندگی گذاری۔ ان کے انتقال کے بعد کسی نے خواب میں دیکھا تو پوچھا کہ: اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ تو جواب میں فرمانے لگے کہ: اللہ تبارک وتعالیٰ نے مغفرت فرمادی لیکن ایک چھوٹی سی نیکی کی وجہ سے، پوچھا کہ وہ کیا ہے؟۔

فرمانے لگے: ایک مرتبہ میں کتاب لکھ رہا تھا، اس زمانے میں لکھنے کے لیے دوات ہوتی تھی جس میں روشنائی ہوتی تھی، جس کو ''کھڑیا'' کہتے ہیں اور قلم اس میں ڈبو کر لکھتے تھے۔ آج کل تو روشنائی پہلے سے اندر بھری ہوئی تیار ہوتی ہے، پہلے ایسا نہیں تھا، تو لکھنے کے دوران روشنائی ختم ہوگئی اور قلم دوات کے اندر ڈبویا اور نکال کر لکھنے کے لیے کاغذ پر رکھنا چاہتا تھا کہ ایک مکھی آ گئی اور وہ نب پر بیٹھ گئی اور روشنائی جو اس نب پر لگی ہوئی تھی، اس کو پینے لگی اور اپنی پیاس بجھانے لگی، چناں چہ میں نے لکھنے کے کام کو

موقوف کر دیا اور میں نے سوچا کہ یہ مکھی روشنائی سے اپنی پیاس بجھا لے، وہاں تک میں لکھنے کے کام کو روک دوں؛ کیوں کہ لکھنے جاؤں گا تو اس کو اڑنا پڑے گا اور جب وہ خود اپنی پیاس بجھا کر اڑی تو میں نے لکھنا شروع کیا۔ اس پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے مجھ سے فرمایا کہ: تم نے ہماری ایک مخلوق کی پیاس بجھانے کے لیے یہ کام کیا تھا، اسی پر میں نے تمہاری مغفرت کر دی۔

اللہ تبارک وتعالیٰ خالق و مالک ہیں، خود مختار ہیں، اس کو جو بھی عمل پسند آ جائے، اس پر مغفرت فرما دیتے ہیں۔ اس لیے بھائی! آدمی کو چاہیے کہ ہر نیک عمل کی طرف لپکے، ہر نیکی کو کرنے کا شوق و ذوق رکھے۔

مجھے بھی نیکی کی ضرورت ہے

بعض لوگوں کا دماغ خراب ہوتا ہے، جب نیک کاموں کی ان کو تلقین کی جاتی ہے تو بعض مرتبہ تو وہ ایسے کفریہ کلمات زبان سے نکالتے ہیں کہ ایمان خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ جیسے بعض کہتے ہیں کہ ہم نے بہت سی نیکیاں کر لیں – نعوذ باللہ – ہمیں نیکی کی ضرورت نہیں ہے۔

حالاں کہ روایتوں میں آتا ہے کہ غزوۂ بدر کے موقع پر سواریاں کم تھیں، ایک سواری پر دو دو، تین تین آدمی سوار ہوتے تھے۔ ایک اونٹ پر نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ باری باری سوار ہوتے تھے۔ اب جب نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چلنے کی باری آتی تھی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت

میں عرض کرتے اور درخواست کرتے تھے کہ آپ سوار ہو جائیں، آپ کی جگہ پر ہم چل لیں گے۔ حضور ﷺ کے ساتھ ان حضرات کو جو محبت تھی، جو تعلق تھا، اس کا تقاضا یہی تھا۔ ان کے جواب میں نبیٔ کریم ﷺ کیا فرماتے؟ فرماتے: مَا أَنْتُمَا بِأَقْوَى مِنِّي کہ تم مجھ سے زیادہ قوی نہیں ہو یعنی چلنے کی طاقت جیسے تمھارے اندر ہے، میرے اندر بھی ہے، وَلاَ أَنَا بِأَغْنَى عَنِ الأَجْرِ مِنْكُمَا: اور میں نیکی کے معاملے میں تم سے زیادہ بے نیاز نہیں ہوں، جیسے تم کو نیکی کی ضرورت ہے، مجھے بھی ضرورت ہے [۱]۔

دین کا استخفاف کفر تک پہنچانے والا عمل

اللہ کے رسول ﷺ تو یہ فرماتے ہیں کہ مجھے نیکی کی ضرورت ہے اور آج ایک مسلمان یہ کہتا ہے -نعوذ باللہ- مجھے نیکی کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بڑا کفریہ کلمہ ہے، ایسی باتوں سے اپنے آپ کو بچانا ضروری ہے۔ آپ کا عمل نہ کرنا الگ چیز ہے لیکن نہ کرنے کے ساتھ اس طرح کے جملے کہنا جس سے دین کا استخفاف، اس کی توہین اور ہلکا پن محسوس ہوتا ہو، یہ کفر تک پہنچانے والا ہے۔

ایک آدمی نماز نہیں پڑھتا تو یہ اپنی جگہ پر کبیرہ گناہ ہے لیکن ساتھ ساتھ -نعوذ باللہ- کوئی ایسا کلمہ کہے کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں، یہ بہت خطرناک چیز ہے، ایک آدمی روزہ نہیں رکھتا اور ساتھ میں کہتا ہے کہ روزہ تو وہ رکھے جس کے گھر میں کھانا نہ ہو -نعوذ باللہ- یہ تو کفر تک پہنچا دیتا ہے۔

---

① المستدرك على الصحيحين، عَنْ عَبْدِ اللهِ، كِتَابُ الْمَغَازِي وَالسَّرَايَا، ر:۴۲۹۹.

پرہیز کے بغیر مُقوّی غذا بے سود ہے

بہرحال! میں یہ عرض کررہا تھا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ کسی بھی گناہ کو چھوٹا سمجھ کر مت کرو۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ: جو آدمی اپنے آپ کو گناہوں سے بچاتا ہے، بھلے وہ نفل کام زیادہ نہ کرتا ہو، فرائض اور واجبات پر اکتفا کرتا ہو، وہ میرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے۔

یہ ایسا ہی ہے، جیسا کہ ایک آدمی ہے جو ٹانک خوب استعمال کرتا ہے اور ظاہر ہے کہ ٹانک آدمی کے جسم میں قوت لانے والی چیز ہے، اس کا کثرت سے استعمال کرتا ہے لیکن ساتھ میں زہر سے بھی پرہیز نہیں کرتا، اس کا بھی استعمال کرتا ہے تو ظاہر ہے کہ ٹانک کا استعمال اس کو زہر کے مہلک اثرات سے بچا نہیں سکتا، اس کے نتیجے میں وہ ختم ہو جائے گا۔

ایک دوسرا آدمی ہے جس کے پاس ٹانک وانک کے پیسے ہی نہیں ہیں، بے چارہ دال روٹی کھا رہا ہے لیکن جسم کو نقصان پہنچانے والی چیزوں سے اپنے آپ کو بچاتا ہے تو اس کے متعلق حفاظت کی گارنٹی دی جائے گی؛ اس لیے گناہوں سے اپنے آپ کو بچانا بہت اہم ہے اور اسی کا نام تقویٰ ہے۔

سب سے بڑا عابد حدیث کی روشنی میں

نفل نمازیں اپنی جگہ عبادت ہے لیکن اللہ کی نافرمانی اور گناہوں سے اپنے آپ کو بچانا یہ ہر عبادت سے بڑھ کر عبادت ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے

ایک مرتبہ پانچ باتوں کی وصیت فرمائی تھی، اس میں سب سے پہلی وصیت یہ تھی: اتَّقِ الْمَحَارِمَ تَكُنْ أَعْبَدَ النَّاسِ کہ: شریعت میں جن چیزوں کو حرام قرار دیا گیا ہے، اپنے آپ کو ایسی تمام چیزوں سے بچاؤ، تم سب سے بڑے عبادت گذار بن جاؤ گے[۱]۔

گناہوں سے اپنے آپ کو بچانا اس کو سب سے بڑی عبادت کہا جا رہا ہے، یہ تہجد پڑھنے کے مقابلے میں، نفل پڑھنے کے مقابلے میں، اشراق پڑھنے کے مقابلے میں، چاشت پڑھنے کے مقابلے میں، صدقہ اور خیرات کرنے کے مقابلے میں بڑی عبادت ہے، اسی کو نبیٔ کریم ﷺ فرماتے ہیں: تَكُنْ أَعْبَدَ النَّاسِ: تم لوگوں میں سب سے بڑے عبادت گزار بن جاؤ گے۔

گناہوں سے بچنے کی خوبی کی برابری کسی اور خوبی سے نہیں ہوسکتی

ترمذی شریف میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ: نبیٔ کریم ﷺ کے سامنے دو آدمیوں کا تذکرہ کیا گیا، ان میں سے ایک عبادتوں میں بہت زیادہ مجاہدہ اور محنتیں کرتا تھا اور دوسرا اپنے آپ کو گناہوں سے بچانے کا اہتمام کرتا تھا، اگرچہ نوافل کا اتنا زیادہ اہتمام نہیں کرتا تھا تو نبیٔ کریم ﷺ نے یہ سن کر ارشاد فرمایا کہ: اپنے آپ کو گناہوں سے بچانے کی جو خوبی ہے، وہ ایسی ہے کہ اس کے برابر کوئی اور صفت نہیں ہوسکتی۔

اپنی سوچ بدلیے

میں اسی کو عرض کر رہا ہوں کہ: ہم نے جو ایک سوچ بنا رکھی ہے، اس کو ذرا بدلنے کی

۱ سنن الترمذی، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ، أَبْوَابُ الزُّهْدِ، باب مَنِ اتَّقَى الْمَحَارِمَ إلخ، ر:۲۳۰۵.

ضرورت ہے۔ ہر مسلمان روزانہ اپنے آپ کا جائزہ لے اور یہ سوچے کہ آج میری طرف سے کوئی ایسی بات جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا ذریعہ ہو، وجود میں تو نہیں آئی، اگر آ گئی ہو تو فوراً توبہ واستغفار کرے اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف رجوع ہو، معافی مانگے، یہ بہت اہم چیز ہے۔

ہم لوگ نیکیوں والے پہلو کو تو دیکھتے رہتے ہیں لیکن گناہوں کے پہلو کی طرف ہماری نظر نہیں جاتی، حالاں کہ آدمی اگر بیلینس (balance) کو دیکھ رہا ہے تو بیلینس کے دونوں طرف دیکھنے کی ضرورت ہے کہ آدمی یہ بھی دیکھے کہ میری نیکیوں کے ساتھ گناہوں کا سلسلہ کیا ہے؛ اس لیے عبادتیں اگر کثرت سے کرتا ہے لیکن ساتھ میں گناہ بھی ہیں تو یہ بڑی خطرناک چیز ہے۔

حضرت مولانا شاہ ابرار الحق صاحب کا ایک مقولہ

حضرت مولانا شاہ ابرار الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ: بھائی! آپ نے اپنے کمرے کے اندر اے سی (A/C) چلا دیا لیکن دروازے اور کھڑکیاں بند نہیں کیں، کھلی ہوئی ہیں تو اے سی سے نکلنے والی ٹھنڈک آپ کے کمرے کو ٹھنڈا نہیں کرے گی، دروازوں اور کھڑکیوں کے ذریعہ باہر سے جو گرمی آ رہی ہے، وہ کمرے کو کبھی بھی ٹھنڈا ہونے نہیں دے گی۔ آپ اے سی کی ٹھنڈک چاہتے ہیں تو پہلے کمرے کے دروازے اور کھڑکیاں بند کرو، تب کمرہ ٹھنڈا ہوگا۔

اسی طرح ہم عبادات کے ساتھ ساتھ گناہ کیے چلے جا رہے ہیں، گناہوں کے

دروازے اور کھڑکیاں کھلے ہوئے ہیں، چوپٹ ہیں، کوئی گناہ ایسا نہیں جو ہم نہیں کرتے، اس کے ساتھ اگر تہجد بھی پڑھ رہے ہیں، تلاوت بھی کررہے ہیں، تسبیحات کا سلسلہ بھی جاری ہے اس کے باوجود اس سے جو فائدہ ہونا چاہیے، وہ ہوگا نہیں اور کبھی بھی اللہ کا قرب حاصل نہیں ہوگا۔

حصولِ ولایت کے لیے گناہوں سے بچنا شرط

قرآنِ پاک میں باری تعالیٰ نے ولایت کے لیے دو شرطیں رکھی ہیں: ﴿أَلَآ إِنَّ أَوْلِيَآءَ ٱللَّهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝٦٢﴾: اللہ کے ولی کے اوپر نہ کوئی خوف ہے، نہ کوئی غم ہے لیکن اللہ کے ولی کون ہیں؟ ﴿ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ وَكَانُوا۟ يَتَّقُونَ ۝٦٣﴾ [یونس] کہ: جو ایمان لائے اور جنھوں نے تقویٰ اختیار کیا۔

ایمان ہمارے اور آپ کے پاس الحمدللہ موجود ہے۔ اگر ہم یہ عنایت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ایک دوسری شرط پوری کرنی پڑے گی، کاہے کی؟ تقوے کی یعنی اللہ کی نافرمانی اور گناہوں سے اپنے آپ کو بچانا۔

ایک گناہ پر اصرار بھی حصولِ ولایت سے مانع

بزرگوں نے لکھا ہے کہ: جو آدمی رات بھر تہجد پڑھتا ہو، نفلی روزے بھی رکھتا ہو، کوئی بھی نیکی والا کام ایسا نہیں جو وہ نہ کرتا ہو لیکن کسی ایک گناہ پر بھی اگر وہ جما ہوا ہے تو وہ ولی نہیں بن سکتا۔

چناں چہ حضرت حکیم اختر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: کسی ایک گناہ پر بھی اصرار

کے ساتھ کوئی آدمی کبھی اللہ کا ولی نہیں بن سکتا۔ اللہ کی ولایت اپنے آپ کو گناہوں اور معاصی سے بچانے پر موقوف ہے اور اگر جما ہوا نہیں ہے، کبھی غیر اختیاری طور پر ہو جاتا ہے، یہ الگ چیز ہے لیکن عادت کے طور پر ایک بھی گناہ ایسا ہے جس کو وہ پکڑے ہوئے ہے، چھوٹ نہیں رہا ہے تو اس گناہ کے ہوتے ہوئے وہ کبھی اللہ کا ولی نہیں بن سکتا۔

﴿أَلَآ إِنَّ أَوۡلِيَآءَ ٱللَّهِ لَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُونَ ۝٦٢ ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ وَكَانُواْ يَتَّقُونَ﴾[یونس]﴿إِنۡ أَوۡلِيَآؤُهُۥٓ إِلَّا ٱلۡمُتَّقُونَ﴾[الأنفال۝٣٤] اللہ کے ولی کون ہیں؟ جو اللہ کی نافرمانی سے اپنے آپ کو بچائیں۔

مجھے اور آپ کو اپنا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ اپنا جائزہ لو اور دیکھ لو کہ ہم اللہ کی کسی ایسی نافرمانی میں مبتلا تو نہیں ہیں جو اصرار تک پہنچ رہی ہے یعنی اس کی عادت بنی ہوئی ہے، چاہے لوگوں کو اس کا علم ہو یا نہ ہو۔ اس عادت کے ساتھ کبھی بھی ولایت حاصل نہیں ہو سکتی۔

تقویٰ کیسے حاصل ہوگا؟

بہر حال! یہ تقویٰ ہے جس کا ہم کو حکم دیا گیا ہے۔ اب بھائی! یہ تقویٰ حاصل کیسے کریں گے؟ تو اس کا طریقہ بھی بتلا دیا: ﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ ٱتَّقُواْ ٱللَّهَ وَكُونُواْ مَعَ ٱلصَّـٰدِقِينَ ۝١١٩﴾[التوبة] اے ایمان والو! تقویٰ اختیار کرو، ﴿وَكُونُواْ مَعَ ٱلصَّـٰدِقِينَ﴾ اللہ کے سچے بندوں کے ساتھ رہو۔ گویا تقویٰ کیسے آئے گا؟ اپنے طور پر گھر کے کونے میں بیٹھ کر ذکر کرنے لگیں، تسبیحات پڑھنے لگیں، تہجد پڑھنے لگیں، تلاوت کرنے لگیں۔ تنہا

اس طرح کرنے سے تقویٰ آنے والا نہیں ہے۔ گناہوں سے کنارہ کشی حاصل نہیں ہوگی۔

دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

گناہوں کی نفرت دل میں کب آئے گی؟ جب اللہ کے ان بندوں کا آپ ساتھ اور صحبت اختیار کریں گے جو اپنے آپ کو اللہ کی نافرمانی سے بچاتے ہیں، ان کی صحبت ہی آپ کے دل میں گناہوں کی نفرت پیدا کرے گی۔ اس کے علاوہ اس کا کوئی طریقہ ہے ہی نہیں۔ آپ ساری دنیا کی کتابیں پڑھ لیں، قرآنِ پاک کی ساری تفسیریں سیکھ لیں، حدیث کی ساری شرحیں دیکھ لیں، دنیا کا سارا علم حاصل کرلیں لیکن اگر آپ اللہ کے نیک بندوں کی صحبت اختیار نہیں کرتے تو گناہوں سے بچنے والی یہ کیفیت پیدا ہونے والی نہیں ہے۔

تقویٰ کا مرکز

حدیث میں آتا ہے اور اسے بعض بزرگوں کا قول بھی کہا گیا ہے: لِكُلِّ شَيْءٍ مَعْدِنٌ، وَمَعْدِنُ التَّقْوَى قُلُوبُ الْعَارِفِينَ [1]: کہ ہر چیز کی ایک کان ہوتی ہے، ہر چیز کا ایک معدن ہوتا ہے، جہاں سے وہ چیز ملا کرتی ہے: پانی واٹر ورکس (water works) سے آتا ہے، بجلی پاور ہاؤس (power house) سے آتی ہے، کسی کو نمک چاہیے تو نمک کی کان سے ملے گا، سونا چاندی چاہیے تو اس کی کان سے ملیں گے۔ اسی طرح ہر

---

① رَوَاهُ الطَّبَرَانِيُّ بحوالة مجمع الزوائد ومنبع الفوائد۱۰/ ۲۶۸، بَابٌ مَعَادِنُ التَّقْوَى قُلُوبُ الْعَارِفِينَ وَالصَّالِحِينَ، ر:۱۷۹٤٤.

چیز کا ایک مرکز ہوتا ہے جہاں سے وہ چیز لی جاتی ہے۔تقویٰ کا مرکز اور جہاں سے آپ تقویٰ حاصل کر سکتے ہیں، وہ اللہ کے عارفین اور نیک لوگوں کے قلوب ہیں، ان کی صحبت اختیار کریں گے تو یہ چیز حاصل ہوگی۔

فن کے لیے صاحبِ فن کی صحبت ضروری

دیکھو! کوئی آدمی باورچی بننا چاہتا ہے، فنِّ طبّاخی اور کھانا پکانے کا فن حاصل کرنا چاہتا ہے۔آج کل آپ کسی شہر میں بک اسٹال (bookstall) پر چلے جائیے، اس سلسلے میں آپ کو وہاں بے شمار کتابیں مل جائیں گی۔اخباروں کے اندر بھی آتا ہے، اس پر گجراتی، ہندی، اردو، انگریزی زبانوں میں کتابیں بھی لکھی ہوئی ہیں۔

آپ کتابوں کا ڈھیر لے کر آئے اور مطالعہ کرتے رہے اور ساری چیزیں یاد کر لیں لیکن ساری کتابیں پڑھ لینے اور زبانی یاد کر لینے سے آپ باورچی نہیں بن سکتے، اس سے کھانا پکانے کی صلاحیت آپ میں آنے والی نہیں، ارے نمک کتنا ڈالنا ہے، یہ بھی نہیں آئے گا۔باورچی بننے کے لیے اور کھانا پکانے کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کرنے کے لیے کسی باورچی کی صحبت میں رہنے کی ضرورت پڑے گی، کتاب ایک بھی نہ پڑھو لیکن اگر کسی باورچی کی صحبت میں رہو گے تو باورچی بن جاؤ گے اور ساری کتابیں پڑھ لو لیکن کسی باورچی کی صحبت اختیار نہیں کی تو باورچی نہیں بنو گے۔

حاصل کسی کامل سے یہ پوشیدہ ہنر کر

درزی اور ٹیلر بنا چاہتے ہیں، فنِّ خیاطی اور ٹیلرنگ کے اوپر جتنی بھی کتابیں تھیں،

وہ سب لاکر آپ نے ان کا مطالعہ کرلیا اور سب زبانی یاد کرلیا لیکن کسی درزی اور ٹیلر کی صحبت میں نہیں رہے تو سوئی میں دھاگہ پرونا بھی نہیں آئے گا، کاج بنانا بھی نہیں آئے گا، جب تک درزی کی صحبت اختیار نہیں کریں گے، یہ معمولی کام بھی نہیں آئیں گے، کرتہ اور پائجامہ بنانا تو بہت دور کی بات ہے اور ایک آدمی نے کوئی کتاب نہیں پڑھی لیکن درزی کی صحبت میں رہا ہے تو سب کچھ آسکتا ہے۔ دنیا کا کوئی بھی کام ہو: کوئی بڑھئی اور کارپینٹر بننا چاہتا ہے تو بڑھئی اور کارپینٹر کی صحبت اختیار کرنی پڑے گی، تب جاکر بڑھئی بنے گا، کتابیں پڑھنے سے نہیں بنے گا، کہنے کا حاصل یہ ہے کہ کچھ بننے کے لیے کسی ماہر وکامل کی صحبت اختیار کرنا بہت ضروری ہے۔

بے جان چیزوں میں بھی صحبت کا اثر ہوتا ہے

صحبت تو ایسی چیز ہے کہ بے جان چیزوں میں بھی اثر کرتی ہے، آپ نے اردو کا محاورہ سنا ہوگا کہ ''خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے''۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب کپڑے دھوکر اور پریس کرکے پیٹی میں رکھتے ہیں تو اس کے ساتھ خوشبو والی چیز بھی رکھتے ہیں یا کافور کی گولیاں رکھتے ہیں۔ اب کپڑے بھی بے جان ہیں اور گولیوں میں بھی جان نہیں ہے لیکن ایک مدت تک دونوں ایک ساتھ رہے تو آپ جب کپڑے نکالیں گے تو خوشبو سے مہک رہے ہوں گے، یہ صحبت کا اثر ہے۔

حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

مستی کے لیے بوئے مئے تُند ہے کافی		مے خانے کا محروم بھی محروم نہیں ہے

صحبت کی تاثیر کی ایک عجیب مثال

یہ جو چمیلی کا تیل ہوتا ہے نا، تو کیا چمیلی کے پھولوں کو نچوڑنے سے چمیلی کا تیل نکلتا ہے؟ ایسا نہیں ہے۔ حضرت مولانا عبدالحلیم جونپوری رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ: ہمارے یہاں چمیلی کا تیل بناتے ہیں، وہ چمیلی کے پھولوں کو نچوڑ کر نہیں بناتے بلکہ وہ ایسے بناتے ہیں کہ چمیلی کے پھولوں کو زمین پر بچھاتے ہیں، پھر اس کے اوپر تِل رکھتے ہیں، پھر اس کے اوپر چمیلی کے پھول بچھاتے ہیں پھر اس کے اوپر تِل رکھتے ہیں۔ اس طرح دو تین تہہ لگاتے ہیں۔ تھوڑے زمانے تک دونوں کو اس طرح ایک ساتھ رکھا جاتا ہے۔ پھر ان تِلوں کو پھولوں سے الگ کر کے کولہو میں پستے ہیں تو اب جو تیل اس سے نکلے گا، اس کو چمیلی کا تیل کہتے ہیں، اس سے پہلے وہ تِل کا تیل تھا، لیکن ایک مدت تک چمیلی کے پھولوں کے ساتھ رہنے کی وجہ سے وہ چمیلی کا تیل کہلایا۔

رنگ لاتی ہے حِنا پتھر پر گھس جانے کے بعد

تِلوں میں پھولوں کا اثر لانے کے لیے ایسے ہی نہیں رکھتے بلکہ پہلے ان تلوں کی اچھی طرح دُھلائی ہوتی ہے؛ تاکہ اس کے اوپر مٹی کے جو ذرّات ہیں، وہ دور ہو جائیں پھر اس کی گِھسائی ہوتی ہے، تِل کے اوپر ایک سخت باریک جِھلّی ہوتی ہے، پتلا کَوَرسا ہوتا ہے، اس کو دور کیا جاتا ہے، پھر ان تلوں کو چمیلی کے پھولوں کے ساتھ رکھا جاتا ہے، تب جا کر اس میں پھولوں کا اثر آتا ہے، دھلائی اور گھسائی کے بغیر اثر نہیں آئے گا بلکہ دھلائی اور گھسائی کے بعد ہی اثر آتا ہے۔

اسی طرح آدمی جب اللہ کے نیک بندوں کی صحبت اختیار کرتا ہے تو اس صحبت کے نتیجے میں کمالات جیسے: تقویٰ، گناہ سے بچنے کا مزاج وغیرہ اس کے اندر بھی آجاتے ہیں، البتہ اس کے لیے کچھ مجاہدات اور ریاضتوں کی ضرورت ہوتی ہے یعنی دھلائی اور گھسائی کی یہاں بھی ضرورت پڑتی ہے، تب جاکر اس کا اثر آتا ہے۔

گلستاں اور بوستاں کا مقام

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ ایسے مسائل کو بڑی آسانی سے حل کرتے ہیں۔ ہمارے استاذ حضرت شیخ رضا اجمیری رحمۃ اللہ علیہ ہمارے پڑھنے کے زمانے میں جب ہم بخاری شریف پڑھتے تھے تو کوئی دن ایسا جاتا نہیں تھا کہ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کی کوئی بات آئی نہ ہو اور فرمایا کرتے تھے کہ: یہ گلستاں اور بوستاں تو فارغ ہونے کے بعد پڑھانے کی کتابیں ہیں، اس کو دیکھا کرو۔

صحبت کے ثمرات شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کی نظر میں

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے گلستاں کے مقدمے میں صحبت کی تاثیر کو بڑے عجیب وغریب انداز سے چند اشعار میں بیان فرمایا ہے:

گِلِ خوشبوئے درحمام روزے		رسید از دست محبوبے بدستم
بدو گفتم کہ مشکی یا عبیری		کہ از بوئے دلاویزِ تو مستم
بگفتا من گلِ ناچیز بودم		ولیکن مدتے با گل نشستم
جمالِ ہمنشیں درمن اثر کرد		وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

اشعار کی تشریح

ہمارے زمانے میں جس طرح نہانے کے لیے صابون کا استعمال کرتے ہیں، اس زمانے میں خوشبو میں بسائی ہوئی مٹی کی ٹکیا کو غسل کے لیے استعمال کرتے تھے، مٹی کو پھولوں کی خوشبو کے ساتھ بسایا جاتا تھا اور اس مٹی میں پھولوں کی خوشبو آجاتی تھی اور اس کی ٹکیا بنائی جاتی تھی۔ یہ صابون بھی جو بنتے ہیں اس میں بھی بہت ساری چیزیں ڈالی جاتی ہیں، مٹی کے اجزاء بہت سارے ہوتے ہیں، اس میں کچھ خوشبو بھی ڈال دی جاتی ہے۔ اس زمانے میں اسی طرح مٹی کی ٹکیا خوشبو میں بسا کر تیار کی جاتی تھی جو صابون کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔

تو شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ایک مرتبہ، ایک دن غسل خانے میں مٹی کی ایک خوشبودار ٹکیا ایک محبوب کے ہاتھ سے میرے ہاتھ میں پہنچی۔ میں نے اس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ تو کون ہے؟ مشک ہے یا عنبر ہے؟ کہ تیری دل کو لبھانے والی خوشبو کی وجہ سے میرا تو دماغ مست ہو گیا، میری طبیعت پر ایک مستی، کیف اور سرور سا طاری ہو گیا، تو ہے کون؟۔ اس کے جواب میں وہ کہنے لگی: میں تو معمولی سی مٹی تھی؛ لیکن ایک زمانہ میں پھول کی صحبت میں رہی یعنی مجھے پھول کے ساتھ رکھا گیا، اسی کا یہ اثر ہے کہ یہ خوشبو میرے اندر آئی۔ میں جس کی صحبت میں رہی، اسی کے جمال اور خوب صورتی نے مجھ میں اپنا اثر کیا ہے؛ ورنہ تو میں آج بھی وہی مٹی ہوں لیکن اس کا اثر آ گیا اور اس کی وجہ سے میرا نام بدل گیا۔ یہ صحبت ہے۔

اگر ہم اور آپ چاہتے ہیں کہ اپنے آپ کو اللہ کی نافرمانی سے بچائیں تو اللہ والوں کی صحبت اختیار کرنی ہوگی۔ اللہ کے وہ بندے جو اپنے آپ کو اللہ کی نافرمانی سے بچاتے ہیں، گناہوں سے بچنے کا اہتمام کرتے ہیں، اللہ کی اطاعت اور فرماں برداری کا اہتمام کرتے ہیں، ان کے ساتھ اٹھو گے، بیٹھو گے تو یہ چیز آپ کے اندر بھی آئے گی۔

کتابیں لاکھ پڑھ لو، نو، دس سال تک نصاب پورا کرلو، ہدایہ پڑھ لو، بخاری پڑھ لو، خالی کتابیں پڑھنے سے یہ چیز حاصل ہونے والی نہیں ہے، جب تک کہ آدمی اہلِ صلاح کی صحبت اختیار نہ کرلے، یہ چیز پیدا نہیں ہوگی۔

وہ کیا نظر تھی جس نے مردوں کو مسیحا کردیا

آپ دیکھیں گے کہ دنیا کے اندر علماء کے لیے عجیب وغریب القاب استعمال کیے جاتے ہیں: محدّث، فقیہ، مفتی، قاری، مولوی، علامہ، یہ، فلاں، فلاں لیکن حضراتِ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے کسی کے لیے ایسا کوئی لقب نہیں ہے، بس ان کو صحابئ رسول کہا جاتا ہے: نبئ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحبت یافتہ، اس سے بڑا لقب اور کوئی ہو نہیں سکتا۔ حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت جنھوں نے اٹھائی، ان کی زندگیوں میں انقلاب پیدا ہوگیا۔

خود نہ تھے جو راہ پر، اوروں کے ہادی بن گئے
وہ کیا نظر تھی جس نے مُردوں کو مسیحا کردیا

وہ خود راہِ راست پر نہیں تھے، دوسروں کو راہِ راست دکھلانے لگے، جو خود مرے ہوئے تھے، وہ دوسروں کے مسیحا بن گئے، مسیحا یعنی دوسروں میں جان ڈالنے والا، ان

کے ہاتھوں سے دوسروں نے حیات پالی، حالاں کہ خود مردہ تھے۔ یہ نبیٔ کریم ﷺ کی صحبت کا اثر تھا۔

صحابہ کا مقام

ایک چھوٹے سے چھوٹا صحابی امت کے بڑے سے بڑے ولی سے افضل ہے، ہزار پیرانِ پیر اور شاہ عبدالقادر جیلانی آجائیں، ہزار امام ابوحنیفہ آجائیں لیکن وہ ایک چھوٹے سے صحابی کے برابر نہیں ہو سکتے، یہ ہمارا اہلِ سنت والجماعت کا عقیدہ ہے۔ یہ فضیلت ان میں نبیٔ کریم ﷺ کی صحبت ہی کی برکت سے آئی ہے۔

یہ صحبت بہت زیادہ ضروری چیز ہے، اسی لیے قرآن جہاں تقویٰ حاصل کرنے کا حکم دیتا ہے تو تقویٰ حاصل کرنے کا طریقہ بھی بتاتا ہے: ﴿كُونُوا۟ مَعَ ٱلصَّـٰدِقِينَ﴾: اللہ کے سچے اور نیک بندوں کے ساتھ رہو۔

صحبتِ صالح کا ادنیٰ اثر

حضرت مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دیکھو! اللہ کے نیک بندوں کی صحبت کا معمولی اثر یہ ہوتا ہے کہ آدمی کے دل میں گناہ سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ گناہ بہت کوشش کرنے کے باوجود نہیں چھوٹتے لیکن جب آپ نیک لوگوں کی صحبت اختیار کریں گے تو اس کے نتیجے میں سارے گناہ آسانی سے چھوٹ جائیں گے، اس کے لیے پھر زیادہ مجاہدے کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی، یہ صحبت کی تاثیر ہے، اس کا ادنی اثر ہے۔

پا جائے کوئی اختؔر گر اہلِ حق کی صحبت

آپ نے دیکھا ہوگا کہ باغ کے اندر کانٹے ہوتے ہیں، مالی اور باغبان ان کانٹوں کو اکھاڑ کر پھینک دیتا ہے لیکن جو کانٹے پھول کے ساتھ لگے ہوئے ہیں، ان کو ہاتھ نہیں لگاتا۔ حضرت مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: اگر آپ کانٹے ہیں تو آپ پھول کی صحبت اختیار کر لیجیے؛ تاکہ آپ کو اکھاڑ کر پھینکا نہ جائے۔ یہ جو اللہ کے نیک بندے ہیں، ان کی صحبت میں رہنے کے نتیجے میں اگر ایسا نہیں بنا، وہ مقام حاصل نہیں ہوا تو بھی کم سے کم گناہوں کی نفرت ہوگی اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں ان جیسا معاملہ کیا جائے گا۔

اسی وجہ سے پہلے زمانے میں لوگ تیس تیس سال، چالیس چالیس سال تک بزرگوں کی خدمت میں رہا کرتے تھے اور آج تو چالیس دن بھی کسی کی خدمت میں رہنا مشکل ہو گیا، اس کی بھی فرصت ملتی نہیں ہے۔ اگرچہ ہمارا دور قیامت کے قریب ہے، دنیوی مشغولیتیں بھی زیادہ ہیں، پھر بھی آدمی اس کا اہتمام کرے تو آسان ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ذرّہ نوازی

حدیث میں آتا ہے کہ جس میں اللہ کا ذکر اور اس کی یاد ہوتی ہے، اللہ کا نام لیا جاتا ہے جیسے ہماری یہ وعظ کی مجلس ہے، فرشتے آ کے اس کو گھیرے ہوئے ہیں۔ فرشتے جب اللہ تبارک وتعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے تو اللہ تعالیٰ تو سب جانتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان سے پوچھتے ہیں کہ دنیا سے آ رہے ہو، کہاں تھے؟ کون سی مجلس کے اندر

تھے؟ تو فرشتے جواب میں کہتے ہیں کہ فلاں جگہ ایک مجلس لگی ہوئی تھی، وہاں تھے۔ اللہ پوچھتے ہیں کہ وہ کیا کررہے تھے؟ جواب دیتے ہیں کہ اے اللہ! آپ کا تذکرہ کررہے تھے۔ اللہ پوچھتے ہیں کہ وہ کیا چاہ رہے تھے؟ جواب دیتے ہیں کہ وہ جنت چاہتے تھے۔ اللہ پوچھتے ہیں کہ وہ کس چیز سے پناہ چاہ رہے تھے؟ تو جواب دیتے ہیں کہ جہنم سے پناہ چاہ رہے تھے۔ باری تعالیٰ فرشتوں سے فرماتے ہیں کہ: گواہ رہو! وہ جس چیز کے طلب گار ہیں، میں نے ان کو وہ چیز دے دی اور جس چیز سے پناہ چاہ رہے تھے، میں نے اس چیز سے ان کو بچالیا اور پناہ دے دی۔

اُس وقت ایک فرشتہ عرض کرتا ہے کہ اے باری تعالیٰ! آپ کا ایک بندہ دور سے بس تماشا دیکھنے کے لیے آیا تھا، اس کی نیت اس مجلس میں شرکت کی نہیں تھی- چوں کہ ان کو گواہ بنایا ہے نا اور گواہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ حقیقتِ حال پیش کرے، کوئی بات نہ چھپاوے، جیسا ہے، ویسا بیان کرے- باری تعالیٰ جواب میں ارشاد فرماتے ہیں کہ میں نے اس کو بھی بخش دیا، اس کو بھی وہی درجہ دے دیا، هُمُ الجُلَسَاءُ لاَ يَشْقَى بِهِمْ جَلِيسُهُمْ[1]: وہ تو ایسے لوگ ہیں کہ ان کے ساتھ بیٹھنے والا بھی محروم نہیں رہا۔

پہناتی ہے درویش کو تاجِ سرِ دارا

بڑے لوگوں کے ساتھ جب قافلہ آتا ہے نا، جیسے آپ کے یہاں کوئی بڑا آدمی

---

(١) صحيح البخاری، عَنْ أَبِي مُوسَى رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، كِتَابُ الدَّعَوَاتِ، بَابُ فَضْلِ ذِكْرِ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ، ر:٦٤٠٨.

مہمان بن کر آ گیا تو اکیلا تو نہیں آتا، اس کے ساتھ کئی آدمی ہوتے ہیں۔ اب کیا ہوتا ہے؟ جو کھانا بڑے کو کھلاتے ہیں، وہی کھانا اس کے ساتھ والوں کو بھی کھلاتے ہیں، جو معاملہ آپ بڑے کے ساتھ کرتے ہیں، وہی اس کے ساتھ والوں کے ساتھ بھی کرتے ہیں۔ حالاں کہ یہی ساتھ والے اگر اکیلے آ جائیں تو ہوسکتا ہے کہ آپ بھاؤ بھی نہ پوچھیں، پانی بھی نہ پلائیں لیکن ان کے ساتھ آئے ہیں تو جو کھانا ان کے لیے، جو بستر، جو کمرہ ان کے لیے ہے، جو عزّت اور احترام کا سلوک ان کے لیے ہے، وہی اِن کے لیے بھی ہوگا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں بھی یہی بات ہے۔

صحبت نہ کند کرم فراموش

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے اس مسئلے کو بھی خوب اچھے انداز سے بیان فرمایا ہے، کیا فرماتے ہیں!

دیدم گلِ تازہ چند دستہ		برگنبدے نہادہ ازگیاہ بستہ

کہ: چند تازہ پھولوں کا ایک دستہ -جس کو ہم گلدستہ کہتے ہیں- ایک گھاس کے ذریعہ سے بندھا ہوا دیکھا۔ گلدستہ ہوتا ہے نا، اس کے بیچ میں پھول ہوتے ہیں اور اس کے چاروں طرف گھاس ہوتی ہے، اسی گھاس کے ذریعہ پھولوں کو جمایا جاتا ہے۔ تو فرماتے ہیں کہ چند تازہ پھولوں کے ایک دستے کو گھاس کے ذریعہ بندھا ہوا میں نے ایک گنبد پر رکھا ہوا دیکھا۔

گفتم چہ بود گیاہِ ناچیز		تا درصفِ گل نشیند او نیز

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے کہا کہ کیا بات ہے کہ یہ معمولی گھاس آج پھول کی صف میں آ کے بیٹھ گئی، یعنی جو مقام و مرتبہ پھول کو ملا، وہ اس کو حاصل ہو گیا، کیا بات ہے؟ اس نے کون سا بڑا تیر مارا ہے؟۔

بہ گریست گیاہ وگفت خاموش		صحبت نہ کند کرم فراموش

میرا یہ سوال اور میری یہ بات سن کر کے گھاس رو پڑی اور کہنے لگی کہ چپ ہو جاؤ، جب آپ شریف آدمی کے ساتھ جاؤ گے نا تو وہ صحبت کی یہ بات بھولتا نہیں ہے، اپنی شرافت کی وجہ سے صحبت کا فائدہ پہنچا تا ہے۔

گر نیست جمال ورنگ وبویم		آخر نہ گیاہِ باغِ اویم

اگر چہ میرے اندر پھولوں کی سی خوب صورتی اور اس کے جیسا رنگ اور اس کی سی خوشبو تو نہیں ہے لیکن آخر میں بھی اسی کے باغ کی گھاس ہوں، جہاں سے یہ پھول لایا گیا ہے؛ لہٰذا جو مقام اس کو دیا گیا، وہ مجھے بھی ملا۔

اہل اللہ کی صحبت کے نتیجے میں اللہ تبارک وتعالیٰ ان کے ساتھ رہنے والوں کو بھی محروم نہیں فرماتے ہیں؛ اس لیے اللہ والوں کی صحبت اختیار کرنے کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔

صحبت کو مؤثر بنانے کے لیے موانع کا دور کرنا ضروری

لیکن ایک بات ضرور ہے اور وہ یہ کہ صحبت کی تاثیر کے لیے موانع اور رکاوٹوں کا دور ہونا ضروری ہے، صحبت اپنا اثر تب دکھلائے گی جب درمیان میں رکاوٹیں نہ ہوں۔

میں نے کپڑے والی مثال دی نا، وہ کافور کی گولی کی خوشبو کپڑوں میں کب آئے گی؟ جب رکاوٹ نہیں ہوگی۔ اب آپ نے ان کپڑوں کو پلاسٹک کی تھیلی میں بند کر کے رکھا ہے اور اس طرح پیک کیا کہ اس میں ہوا کا بھی گذر نہ ہو، ایسی صورت میں اگر آپ اس میں کافور ہی کیا، مہنگے سے مہنگا عطر رکھیں گے، تب بھی اس میں خوشبو آنے والی نہیں ہے، رکاوٹ دور ہونی چاہیے۔

چمیلی کا تیل بنانے کا طریقہ بتایا نا؟ اس میں تِلوں میں چمیلی کے پھول کا اثر لانے کے لیے تلوں کے اوپر جو پتلی جھِلّی ہوتی ہے، گھسائی کر کے اس کو دور کیا جاتا ہے اور اندر کے مسامات کھول دئے جاتے ہیں، اب گویا وہ اس قابل ہو جاتی ہے کہ پھولوں کے اثر کو قبول کر سکے، اب اس میں پھولوں کی خوشبو کے اثرات آسکتے ہیں۔ اگر ایسے ہی تل لے کر پھولوں کے ساتھ رکھ دئے تو اس میں پھولوں کا اثر آنے والا نہیں ہے۔

اسی طریقے سے اہل اللہ کی صحبت کو مؤثر بنانے کے لیے دُھلائی اور گِھسائی کے ذریعے رکاوٹوں کو دور کرنا ضروری ہے۔

صحبت کو بے تاثیر کرنے والی ایک چیز: اعتراض

رکاوٹیں تو بہت ساری ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ آدمی اپنے دل میں اعتراض لے کر نہ جاوے۔ آج کل ایک عام مزاج بنا ہوا ہے کہ جب کسی اللہ والے کے پاس جاتے ہیں تو ان کے بارے میں دل میں اعتراض ہوتے ہیں، اعتراض کے نتیجے میں آدمی اللہ والوں کی صحبت کے فیض سے محروم رہ جاتا ہے۔

بھائی! نبیٔ کریم ﷺ کی مجلس میں کیا عبداللہ بن اُبی نہیں آتا تھا؟ کیا ابوجہل کی ملاقات آپ سے نہیں ہوتی تھی؟ حضور ﷺ کی بابرکت نگاہ کا تو یہ عالم تھا کہ ایک نگاہ پڑی اور آدمی کی حالت بدل گئی، یہ لوگ سالہا سال حضور ﷺ کو دیکھتے رہے اور عبداللہ بن اُبی تو اپنے آپ کو مسلمان کہہ کر آتا تھا، پھر بھی اثر کیوں نہیں ہوا؟ وہی دل میں اعتراض تھا۔

عقیدت ومحبت

عقیدت کے ساتھ آنا چاہیے، اگر عقیدت کے ساتھ آئے گا تو اثر ہوگا۔ عقیدت بھی ہو اور محبت بھی، دونوں ہوں۔ وہ مقولہ ہے نا ''کچھ لے کر کے آوے تو کچھ لے کر کے جاوے''، یعنی عقیدت لے کر آئے گا تو فیض لے کر جائے گا۔

دنیادار پیروں نے اس جملے کا مطلب کیا نکالا؟ انھوں نے یہ مطلب نکالا کہ ہدیہ لے کر آئے گا تو فائدہ لے کر جائے گا، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ، حقیقت یہ ہے کہ عقیدت اور محبت جب تک نہیں ہوگی، صحبت کا فائدہ نہیں ہوگا۔

ناجنس کی صحبت سے بچانا بھی بہت ضروری ہے

اپنے آپ کو ناجنس کی صحبت سے بچانا بھی بہت ضروری ہے یعنی صحبت کے اثرات کو باقی رکھنے اور ان کو دیر پا بنانے کے لیے دوسری لائن کے لوگوں سے اپنے آپ کو دور رکھنا ضروری ہے۔ جو لوگ اہل اللہ کو ماننے والے نہیں ہیں، ان کے ساتھ عقیدت نہیں رکھتے، آپ ان کے ساتھ بھی جاتے ہیں، اہل اللہ کے پاس بھی جاتے ہیں تو صحبت کا اثر

نہیں ہوگا۔

میں ایک مثال کے ذریعہ سمجھایا کرتا ہوں کہ جب آئس کریم بنائی جاتی ہے تو پہلے دودھ میں شکر اور دوسری چیزیں ڈال کر تیار کیا جاتا ہے، پھر اس کو ٹھنڈک میں رکھا جاتا ہے، ٹھنڈک کی ایک خاص مقدار اس کو حاصل ہوگی تو آئس کریم بنے گی۔ اب آپ اس کو تھوڑی دیر فریز کے اندر رکھیں اور تھوڑی دیر باہر رکھیں، پانچ منٹ اندر رکھیں اور پانچ منٹ باہر رکھیں تو آئس کریم کبھی بننے والی نہیں ہے۔

تقوے کے دو فائدے

بہر حال! اللہ تبارک وتعالیٰ نے تقوے کے حصول کا طریقہ بھی اس آیت میں بتا دیا ہے۔ تقویٰ ایسی چیز ہے جس کے بے شمار فوائد ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَمَن يَتَّقِ ٱللَّهَ يَجْعَل لَّهُۥ مَخْرَجًا ۝٢﴾: جو آدمی اللہ سے ڈرتا ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ اس کے لیے مشکلات سے راستہ نکال دیتے ہیں اور ﴿وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ﴾ [الطلاق ۝٣]: اللہ تبارک وتعالیٰ اس کو ایسی جگہ سے روزی دیتے ہیں جہاں سے اس کو گمان بھی نہ ہو۔ جو آدمی اللہ سے ڈرتا ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ اس کے لیے ایک نور عطا فرماتے ہیں۔

تقویٰ کا ایک اور عظیم فائدہ

تقوے کے بہت سارے فوائد اور خوبیاں قرآنِ پاک میں ہیں: ﴿أَنَّ ٱللَّهَ مَعَ ٱلْمُتَّقِينَ ۝٣٦﴾ [التوبة] اللہ تعالیٰ کی معیت حاصل ہوتی ہے، یہ سب سے بڑا فائدہ ہے کہ

اللہ تعالیٰ کی معیت اور اس کا ساتھ نصیب ہوتا ہے؛ بلکہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معیت بھی حاصل ہوتی ہے۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو جب نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یمن کی طرف روانہ فرمایا تو روایتوں میں آتا ہے کہ جب نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رخصت کرنے کے لیے مدینۂ منورہ سے باہر تشریف لائے، حضرت معاذ بن جبل کو رضی اللہ عنہ کو سواری پر سوار کرایا اور خود نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رخصت کرنے کے لیے ساتھ ساتھ پیدل چلنے لگے اور ان کو نصیحت کی اور نصیحت کرتے کرتے ایک بات یہ بھی ارشاد فرمائی کہ: شاید آئندہ مجھ سے ملاقات نہ ہو۔

جب یہ جملہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانِ مبارک سے سنا تو حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ پر جدائی کے تصوّر سے گریہ طاری ہوگیا۔ اس پر نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: إِنَّ أَوْلَى النَّاسِ بِي الْمُتَّقُونَ مَنْ كَانُوا حَيْثُ كَانُوا[۱]: تم کہیں پر بھی رہو، سات سمندر کے پار عمل کرتے رہو لیکن مجھ سے قریب وہ لوگ ہیں جو تقویٰ اختیار کریں۔

معیتِ رسول کے لیے قرب نہیں، تقویٰ ضروری ہے

ایک آدمی ہندوستان میں رہتے ہوئے تقوے والی زندگی اختیار کرتا ہے تو اس کو نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معیت حاصل ہوگی اور دوسرا آدمی مدینے میں رہتے ہوئے تقوے سے دور ہے تو اس کو معیت حاصل نہیں ہوگی۔ ابوجہل اور ابولہب روزانہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت کرتے تھے لیکن کیا ہوا؟ اور حضرت اویسِ قرنی رحمۃ اللہ علیہ اپنی ماں کی خدمت میں مشغول ہونے کی وجہ سے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضری نہیں دے سکے تو

---

۱ صحيح ابن حبان، عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ، ذِكْرُ الْخَبَرِ الدَّالِّ عَلَى أَنَّ إلخ، ر:٦٤٧.

ان کا مقام یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو تاکید کرتے ہیں کہ ان سے جب ملاقات ہو تو ان سے اپنے لیے دعا کروالینا[1]، کتنا اونچا مقام حاصل ہوا! یہ معیت ہے جس کی وجہ سے آدمی کا مقام بڑا اونچا ہو جاتا ہے۔

کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

آج دنیا میں گناہوں کا دور دورہ ہے۔ ہمارے دلوں سے گناہوں کا احساس ہی ختم ہو گیا اور بہت سے گناہ تو وہ ہیں کہ جن کو ہم گناہ ہی نہیں سمجھتے، بدنظری ہی کو دیکھ لو۔ ہم دن بھر میں آتے جاتے سینکڑوں مرتبہ پرائی عورتوں کو دیکھتے ہیں، کبیرہ گناہ کرتے ہیں، آنکھ کا زنا کرتے ہیں اور ہمیں اس کا احساس تک نہیں

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

اپنے آپ سے گناہوں سے بچنے کا عہد کیجیے

ہمیں کوئی بڑا بزرگ نہیں بننا۔ میں آپ کو بزرگی کا سرٹیفیکٹ دینے نہیں آیا ہوں، میں تو یہ کہتا ہوں کہ ہم اور آپ، ہر آدمی اپنی جگہ پر یہ طے کرلیں کہ آج سے میری طرف سے اللہ تبارک وتعالیٰ کے کسی حکم کی نافرمانی نہیں ہوگی۔ اپنے آپ کو گناہوں سے بچانے کا اہتمام کر لیجیے۔ یہی وہ چیز ہے جس کا ہر مسلمان سے مطالبہ کیا گیا ہے، یہی

---

① صحیح مسلم، عَنْ أُسَيْرِ بْنِ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، کتاب الفضائل، بَابُ مِنْ فَضَائِلِ أُوَيْسٍ الْقَرَنِيِّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، ر:۲۵۴۲.

وہ چیز ہے جس کے حاصل کرنے پر بارگاہِ نبوت سے ''سب سے بڑے عبادت گزار'' کا لقب دیا گیا ہے۔ ضرورت ہے کہ آج اس کا اہتمام کیا جائے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ مجھے، آپ کو اور سب کو اس کی توفیق اور سعادت عطا فرمائے۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

دین میں توبہ کی اہمیت

اور

اس کی ضرورت وافادیت

اقتباس

دنیا کے حاکموں کا تو حال یہ ہے کہ دن میں ان کا دربار اور آفس کھلا ہوا ہوتا ہے اور رات میں بند ہو جاتا ہے، آپ رات میں جائیں گے تو ان سے آپ کی ملاقات نہیں ہو پائے گی۔ لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کے دربار میں ۲۴ رگھنٹوں میں سے جب چاہے جائیں اور جا کر کے اپنی عرضی پیش کر دیجیے اور توبہ کا دروازہ ہر وقت کھلا ہوا ہے اور بہت وسیع اور بہت بڑا دروازہ ہے، سورج جب تک مغرب سے طلوع نہیں ہوگا، وہاں تک یہ دروازہ کھلا رہے گا۔

یہ ساری تفصیلات اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے یہ ساری تاکیدیں اور اللہ تعالیٰ کے پاک رسول ﷺ کی تاکید اور آپ کا عمل، ان ساری چیزوں کا تقاضا یہ ہے کہ ہم توبہ کا اہتمام کریں اور توبہ تو واجب ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الحمدللّٰه نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا، ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا، ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا، من يهده الله فلامضل له، ومن يضلله فلا هادي له، ونشهد أن لا إلٰه إلا الله وحده لاشريك له، ونشهد أن سيدنا ومولانا محمداً عبده ورسوله، أرسله إلىٰ كافّة الناس بشيراً ونذيراً، وداعياً إلى الله بإذنه وسراجاً منيراً، صلّى الله تعالىٰ عليه وعلىٰ آله وأصحابه وبارك وسلّم تسليماً كثيراً كثيراً.

أمابعد: فَأَعُوْذُ بِاللّٰه مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ: ﴿وَتُوبُوٓاْ إِلَى ٱللَّهِ جَمِيعًا أَيُّهَ ٱلۡمُؤۡمِنُونَ لَعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُونَ ﴿٣١﴾﴾[النور]

وقال تعالىٰ: ﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ تُوبُوٓاْ إِلَى ٱللَّهِ تَوۡبَةً نَّصُوحًا﴾[التحريم ﴿٨﴾]

وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: وَاللَّهِ إِنِّي لَأَسْتَغْفِرُ اللَّهَ وَأَتُوبُ إِلَيْهِ فِي الْيَوْمِ أَكْثَرَ مِنْ سَبْعِينَ مَرَّةً[١].

وَعَنْ الْأَغَرِّ الْمُزَنِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ، وَكَانَ مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ ﷺ، يُحَدِّثُ ابْنَ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: يَا أَيُّهَا النَّاسُ! تُوبُوا إِلَى اللّٰهِ، فَإِنِّي أَتُوبُ فِي الْيَوْمِ إِلَيْهِ مِائَةَ مَرَّةٍ[٢]. أو كما قال عليه الصلوة والسلام.

---

(١) صحيح البخارى، بَابُ اسْتِغْفَارِ النَّبِيِّ ﷺ فِي اليَوْمِ وَاللَّيْلَةِ، ر: ٦٣٠٧.
(٢) صحيح مسلم، بَابُ اسْتِحْبَابِ الِاسْتِغْفَارِ وَالِاسْتِكْثَارِ مِنْهُ، ر:٢٧٠٢.

قرآن وحدیث سے توبہ کا وجوب ثابت ہے

قرآن وحدیث میں توبہ کی بڑی تاکید آئی ہے اور اس کا حکم دیا گیا ہے، یہ جو دو آیتیں پڑھی ہیں:﴿وَتُوبُوٓاْ إِلَى ٱللَّهِ جَمِيعًا أَيُّهَ ٱلْمُؤْمِنُونَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝٣١﴾ اور﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ تُوبُوٓاْ إِلَى ٱللَّهِ تَوْبَةً نَّصُوحًا﴾ان دونوں آیتوں میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے صیغۂ امر استعمال فرمایا ہے اور اہلِ علم جانتے ہیں کہ صیغۂ امر کے ذریعہ جو حکم دیا جاتا ہے، وہ واجب اور ضروری ہوجاتا ہے۔

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے ''ریاض الصالحین'' میں لکھا ہے:قَالَ العلماءُ: التَّوْبَةُ وَاجبَةٌ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ کہ:علماء فرماتے ہیں کہ ہر گناہ سے توبہ کرنا واجب ہے[1]، یہ کوئی مستحب کام نہیں ہے بلکہ واجب ہے، اگر کسی آدمی نے گناہ کا ارتکاب کیا ہے تو اس کے اوپر فرض ہے کہ وہ توبہ کا اہتمام کرے،توبہ کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے واجب اور ضروری قرار دیا ہے۔

گناہ کی حقیقت

گناہ کس کو کہتے ہیں؟ گناہ کہتے ہیں اللہ تبارک وتعالیٰ کی نافرمانی کو، اللہ تبارک وتعالیٰ نے کسی کام کے کرنے کا حکم دیا، کوئی آدمی اگر اس کو نہیں کرتا تو یہ نافرمانی ہوئی، یہ گناہ ہوا، اللہ تبارک وتعالیٰ نے کسی کام سے بچنے اور رکنے کا حکم دیا، پھر کوئی آدمی اس سے رکتا نہیں ہے، بچتا نہیں ہے، باز نہیں رہتا تو یہ گناہ ہوا۔

---

① رياض الصالحين، ص١٤، باب التوبة.

اللہ تعالیٰ کی مرضیات اور نامرضیات

اللہ تبارک وتعالیٰ نے جو حضراتِ انبیائے کرام علیہم السلام کا سلسلہ جاری فرمایا، حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تک، ان حضراتِ انبیائے کرام علیہم السلام کے ذریعہ سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسانوں کو بتلایا کہ کون سے وہ کام ہیں کہ جن کے کرنے سے اللہ تبارک وتعالیٰ راضی ہوتے ہیں اور جن کے کرنے کا اللہ تبارک وتعالیٰ نے حکم فرمایا ہے اور کون سے وہ کام ہیں کہ جن کے کرنے سے اللہ تبارک وتعالیٰ ناراض ہوتے ہیں اور جن سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے بچنے کا حکم فرمایا ہے۔

حضراتِ انبیائے کرامؑ کی بعثت کی غرض

یہ جو حضراتِ انبیائے کرام علیہم السلام کی بعثت کا سلسلہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جاری فرمایا حضرت آدم سے لے کر نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذاتِ بابرکات تک، اس کا مقصد ہی یہ تھا، کیوں کہ بندوں کو پتہ نہ چلتا کہ کون سے کام سے اللہ تبارک وتعالیٰ راضی ہوتے ہیں اور کون سے کام سے ناراض ہوتے ہیں۔

ہم اپنے جیسے ایک انسان کے متعلق نہیں کہہ سکتے، اپنی عقل اور سوچ سے یہ نہیں بتا سکتے کہ یہ صاحب کون سے کام سے خوش ہوں گے اور کون سے کام سے ناراض ہوں گے، جب ایک انسان اپنے جیسے ایک انسان کے متعلق بغیر اس کے بتلائے ہوئے یہ پتہ نہیں چلا سکتا کہ وہ کس کام سے راضی ہوتا ہے اور کون سے کام سے ناراض ہوتا ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی مرضیات اور نامرضیات، کہ اللہ تعالیٰ کن کاموں سے

راضی ہوتے ہیں اور کن کاموں سے ناراض ہوتے ہیں، جب تک اللہ تبارک وتعالیٰ نہیں بتلائیں گے، ہمیں کیسے پتہ چلے گا۔

اسی چیز کو بتلانے کے لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضراتِ انبیائے کرام علیہم السلام کو بھیجا اور انسانیت کو آگاہ کیا کہ تم فلاں فلاں کام کرو، اگر تم یہ کام کروگے تو میں تم سے راضی ہوں گا اور تم سے راضی ہو کر تم کو جنت میں بھیجوں گا اور فلاں فلاں کام سے بچو، اگر تم ان کاموں کو کروگے تو میں تم سے ناراض ہوں گا اور تم کو اس کے نتیجے میں جہنم کے عذاب میں بھیجوں گا۔

قرآنِ پاک میں اقوامِ ماضیہ معذّبہ کا تذکرہ

قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ نے جگہ جگہ مختلف حضراتِ انبیائے کرام علیہم السلام کی بعثت اور ان کو ان کی قوموں کی طرف بھیجے جانے کا تذکرہ فرمایا اور ان کی قوم کا ان کی دعوت کو قبول نہ کرنا اور ان کی مخالفت کرنا اور ان سے عداوت اور دشمنی پر اتر آنا اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے باز نہ آنا، اس کا بھی تفصیلی تذکرہ قرآنِ پاک میں موجود ہے۔

بڑی بڑی قومیں اس دنیا کے اندر گذری ہیں، جیسے قومِ عاد ہے، جس کے بارے میں اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿ٱلَّتِي لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي ٱلْبِلَٰدِ ۝٨﴾ [الفجر] کہ: روئے زمین پر ایسی دوسری کوئی قوم پیدا نہیں کی گئی، جس قوم کے متعلق خود اللہ تبارک وتعالیٰ یہ فرمائیں کہ روئے زمین پر ایسی دوسری کوئی قوم پیدا نہیں کی گئی، اس سے ان کی قوت وطاقت کا اور ان کی صلاحیتوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ قوم کیسی ہوگی، کیسی

ترقی یافتہ اور مہذب قوم ہوگی۔ اپنے اپنے زمانے میں بہت سی مہذب اور ترقی یافتہ قومیں تھیں لیکن انھوں نے اللہ تعالیٰ کے حکموں کو توڑا، نافرمانی کی، ناراضگی والے کام کیے اور باوجود تنبیہ کیے جانے کے اور بتلائے جانے کے وہ اپنی غلط حرکتوں سے باز نہیں آئے تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کو ہلاک کر دیا، کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے چھڑالوں گا، کوئی بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی گرفت سے اپنے آپ کو چھڑا نہیں سکتا۔

قوم عاد پر اللہ تعالیٰ کا طوفان اور ہوا والا عذاب

قومِ عاد پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہوا کا ایسا عذاب بھیجا کہ وہ بڑے ڈیل ڈول والے تھے، ہوا نے ان کو ایسا پٹکا، جیسا کہ طوفان کے اندر بڑے بڑے درخت اکھاڑ دیئے جاتے ہیں اور ان کے تنے زمین کے اوپر پچھاڑ دیئے جاتے ہیں، اس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کو ہلاک کیا۔

قومِ ثمود کی نافرمانی کی وجہ سے ہلاکت

قومِ ثمود جن کو اپنے ہنر پر بڑا ناز تھا، پہاڑوں کو تراش کر اس کے اندر اپنے لیے مکانات بنایا کرتے تھے، آج سعودیہ کے اندر جائیے، وہاں ''مدائن صالح'' ہیں، ان مکانات کو ہم دیکھیں گے تو حیرت ہوتی ہے کہ اس زمانے میں جب کہ ایسے آلات بھی نہیں تھے، پہاڑوں کو کھود کر کس طرح انھوں نے یہ مکانات بنائے ہوں گے۔ لیکن انھوں نے اللہ تبارک وتعالیٰ کے حکم کی نافرمانی کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کے اوپر عذاب

بھیجا، ایک چیخ اور ایسی چنگھاڑ بھیجی کہ وہ اِس چنگھاڑ کی وجہ سے اپنے گھروں میں بیٹھے بیٹھے ہی ہلاک ہو گئے، ان کے کلیجے پھٹ گئے۔

قوم نوح ولوط کی ہلاکت

حضرت نوح علیہ السلام کی قوم نے نافرمانی کی، اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کے اوپر سیلاب کی شکل میں پانی کا عذاب بھیجا جس سے وہ ہلاک اور برباد ہو گئے۔ حضرت لوط علیہ السلام کی قوم جن گناہوں کے اندر مبتلا تھی، اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کی وجہ سے حضرت جبرئیل علیہ السلام کے واسطے سے ان کی پوری بستی کو جڑ سے اکھاڑ کر، اوپر آسمان تک لا کر پھر وہاں سے الٹ کر پھینک دیا اور ان کے اوپر پتھروں کی بارش برسائی۔

حضرت شعیبؑ کی قوم پر آگ کی بارش کا عذاب

حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم ناپ تول میں کمی کرتی تھی، ایمان نہیں لائی تو ان پر عذاب آیا، سات دن ایسی سخت گرمی پڑی کہ تالاب، کنوؤں اور چشموں وغیرہ کا سارا پانی خشک ہو گیا اور گرمی کی وجہ سے سب بالکل بے چین ہو گئے، اس کے بعد ایک بادل آیا تو وہ سمجھے کہ یہ پانی برسائے گا، یہ لوگ اس غرض سے کہ پانی برسے گا تو جسم کو راحت ملے گی، سب کے سب اس بادل کے نیچے گئے، اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اس بادل میں سے آگ برسائی گئی۔

ہوا اور بادل کو دیکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بے چینی اور اضطراب

بخاری شریف میں روایت موجود ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب ہوا

تیز چلنے لگتی تھی تو نبیٔ کریم ﷺ کے چہرے کا رنگ بدل جاتا تھا اور گھبرا جاتے تھے کہ اب پتہ نہیں کیا ہوگا، طبیعت پر بے چینی کی سی کیفیت طاری ہوجاتی تھی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ: ایک مرتبہ میں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! لوگ تو بادل کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں کہ بارش لائے گا اور میں دیکھتی ہوں کہ آپ بادل کو دیکھ کر گھبرا جاتے ہیں۔ نبیٔ کریم ﷺ نے فرمایا کہ اے عائشہ! اس بات کا کیا اطمینان ہے کہ یہ بادل بارش لے کر ہی آیا ہوگا، ایک قوم نے بادل کو دیکھ کر کہا تھا: ﴿هَٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا﴾ کہ: یہ بادل آیا ہے جو بارش برسائے گا، حالاں کہ اس میں اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا عذاب تھا[1]۔

یہ قومیں تھیں جن کو اپنی ترقی کے اوپر، اپنے علم و ہنر پر، اپنی طاقت وقوت پر، اپنے اسباب وآلات پر بڑا فخر اور ناز تھا، نبیوں کو جھٹلایا، ان کو احمق قرار دیا تو ان پر عذاب نازل ہوا اور وہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچا نہ سکے۔

قرآنِ پاک میں یہ قصے اللہ تبارک وتعالیٰ نے جگہ جگہ بیان فرمائے، قرآن کوئی قصہ کی کتاب نہیں ہے، وہ تو عبرت کے لیے بیان کیے گئے ہیں، اللہ تعالیٰ یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ کسی کو یہ خیال نہ ہو کہ میں اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی گرفت سے بچا لوں گا۔

بر و بحر میں فساد کا سبب انسانوں کے گناہ

یہ گناہ اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی بڑی خطرناک چیز ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

---

(۱) صحيح البخاری، عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنهَا، بَابُ قَوْلِهِ: فَلَمَّا رَأَوْهُ عَارِضًا إلخ، ر:٤٨٢٩.

﴿ظَهَرَ ٱلۡفَسَادُ فِي ٱلۡبَرِّ وَٱلۡبَحۡرِ بِمَا كَسَبَتۡ أَيۡدِي ٱلنَّاسِ لِيُذِيقَهُم بَعۡضَ ٱلَّذِي عَمِلُواْ لَعَلَّهُمۡ يَرۡجِعُونَ ۝٤١﴾ [الروم] باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ سمندر اور خشکی میں فساد پھیل گیا لوگوں کی کرتوتوں کی وجہ سے، اللہ تعالیٰ اس طرح ان کو ان کے بعض کرتوتوں کا مزہ چکھاتے ہیں، تاکہ وہ اپنی ان حرکتوں سے باز آجائیں۔ کبھی اللہ تعالیٰ اس طرح کی چیزیں بھیج کر کے موقع بھی دیتے ہیں، گویا وارننگ دی جاتی ہے کہ دیکھو! سنبھل جاؤ، ورنہ اس سے بھی زیادہ سخت حالات اور خطرناک عذاب پیش آسکتا ہے اور بہت سے لوگ سمجھدار ہوتے ہیں جو اس سے سنبھل کر توبہ بھی کر لیتے ہیں۔

درختوں میں کانٹے اور سمندر کے پانی میں کڑواہٹ کا سبب

بہرحال! یہ زمین اور سمندر میں جتنی خرابیاں ہیں، وہ سارا فساد گناہوں کا ہے، روح المعانی میں حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب اس کائنات کو پیدا فرمایا تو اس وقت کوئی درخت کانٹے دار نہیں تھا، پانی کڑوا نہیں تھا، سارے درخت پھل دار تھے، پانی بھی خوب میٹھا تھا، حضرت آدم کے بیٹے قابیل نے جب اپنے بھائی ہابیل کو قتل کیا، بس قتل کا یہ واقعہ پیش آتے ہی بہت سے درخت کانٹے دار ہو گئے اور پانی کے اندر کڑواہٹ آگئی[1]۔

---

① قال الضحاك: كانت الأرض خضرة مونقة لا يأتي ابن آدم شجرة إلا وجد عليها ثمرة وكان ماء البحر عذبا وكان لا يفترس الأسد البقر ولا الذئب الغنم فلما قتل قابيل هابيل اقشعر ما في الأرض وشاكت الأشجار وصار ماء البحر ملحا زعافا وقصد الحيوان بعضه بعضا. (روح المعانی، ۱۱/ ۴۸، تحت قوله تعالىٰ: ظَهَرَ الْفَسادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ الآية)

یہ خرابیاں، مصیبتیں اور آفات جو دنیا میں آتی ہیں، وہ انسان کے گناہوں کی وجہ سے آتی ہیں۔

گنہگار آدمی کی موت سے خلقِ خدا راحت پاتی ہے

اسی لیے حدیث میں آتا ہے، نبیٔ کریم ﷺ نے ایک مرتبہ ایک جنازہ دیکھا تو فرمایا: مُسْتَرِيحٌ أَوْ مُسْتَرَاحٌ مِنْهُ: یا تو خود دنیا کی مصیبتوں سے نجات پا کر جا رہا ہے یا لوگوں کو اس کے گناہوں کی وجہ سے آنے والے مصائب سے نجات ملی[1]۔

جو گنہگار ہوتا ہے، اس کے گناہوں کے نتیجے میں جو خرابیاں آتی ہیں، اس کی وجہ سے جانور بھی اس پر لعنت بھیجتے ہیں کہ اس کی وجہ سے ہمیں مصیبت میں گرفتار ہونا پڑا، اس لیے اس کو ''مستراح'' فرمایا کہ اس کے جانے سے مخلوق کو راحت حاصل ہوئی، گویا ''خس کم، جہاں پاک'' والا معاملہ ہو جاتا ہے۔

دلوں سے گناہوں کی قباحت ختم ہو چکی ہے

آدمی گناہ کو معمولی نہ سمجھے، آج ہمارا اور آپ کا واسطہ جس ماحول سے پڑا ہے اور جس ماحول میں ہم پلے بڑھے ہیں اور جس ماحول میں ہمارا اٹھنا بیٹھنا ہوتا ہے اور معاملات ہوتے ہیں، آخرت کو ایسا بھلائے ہوئے ہیں کہ گناہ کی برائی، اس کی قباحت اور شناعت اور اس کے نقصانات کی طرف آدمی کا ذہن ہی نہیں جاتا۔

---

(١) شعب الإيمان، عَنْ أَبِي قَتَادَةَ الْأَنْصَارِيِّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، بَابٌ فِي الصَّلَاةِ عَلَى مَنْ مَاتَ مِنْ أَهْلِ الْقِبْلَةِ، ر:٨٨٢٦.

ہم اور ہمارے اکابر

ہمارے اکابر کا تو یہ حال تھا کہ اگر ان کا چوپایہ، سواری کا جانور اگر ان کے کہنے کے مطابق نہ چلے اور بیوی کو کوئی بات کہی گئی اور وہ اس پر عمل نہ کرے تو وہ یوں کہا کرتے تھے کہ یہ میرے گناہوں کی سزا ہے، اس کی وجہ سے یہ حالات آ رہے ہیں۔

اور ہمارا حال یہ ہے کہ ہمارے اوپر بڑے بڑے مصائب آتے ہیں تو بھولے سے بھی یہ خیال نہیں آتا کہ یہ کسی گناہ کی وجہ سے ہوسکتا ہے، باری تعالیٰ تو یوں فرماتے ہیں: ﴿لِيُذِيقَهُم بَعْضَ ٱلَّذِى عَمِلُوا۟﴾ [الروم۴۱] کہ: جو مصائب آتے ہیں، وہ بعض گناہوں کی سزا کے طور پر ہیں۔

قرآنِ پاک میں ایمان والوں کو توبہ کا حکم دیا گیا ہے

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: قَالَ العلماءُ: التَّوْبَةُ وَاجبَةٌ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ کہ: علماء فرماتے ہیں کہ ہر گناہ سے توبہ کرنا واجب ہے، یہ آیتیں جو آپ کے سامنے پڑھی گئیں: ﴿وَتُوبُوٓا۟ إِلَى ٱللَّهِ جَمِيعًا أَيُّهَ ٱلْمُؤْمِنُونَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۳۱﴾ اور ﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ تُوبُوٓا۟ إِلَى ٱللَّهِ تَوْبَةً نَّصُوحًا﴾، اور خود نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت اَغر مزنی رضی اللہ عنہ والی روایت میں فرماتے ہیں: يَا أَيُّهَا النَّاسُ! تُوبُوا إِلَى اللهِ، فَإِنِّي أَتُوبُ فِي الْيَوْمِ إِلَيْهِ مِائَةَ مَرَّةٍ. ان نصوص میں توبہ کا حکم فرمایا گیا ہے۔

توبہ کے سلسلے میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معمول

بخاری شریف کی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ والی روایت میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود اپنا

معمول بتلایا: وَاللّٰهِ إِنِّي لَأَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ وَأَتُوبُ إِلَيْهِ فِي الْيَوْمِ أَكْثَرَ مِنْ سَبْعِينَ مَرَّةً کہ: اللہ کی قسم! میں ایک دن میں ستر سے زیادہ مرتبہ اللہ تعالیٰ سے توبہ اور استغفار کرتا ہوں۔ نبیٔ کریم ﷺ تو گناہوں سے معصوم تھے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ ﷺ کو یہ بشارت سنائی: ﴿لِّيَغْفِرَ لَكَ ٱللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِن ذَنۢبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ﴾[الفتح ۲] کہ: اللہ تعالیٰ نے آپ کی اگلی پچھلی خطائیں معاف کردیں، اس کے باوجود آپ ﷺ توبہ اور استغفار کا اہتمام فرما رہے ہیں، اس کی وجہ کیا ہے؟، امت کو اس کی اہمیت بتلانے کے لیے اور امت کی تعلیم کے لیے کہ یہ کتنا ضروری ہے، گویا توبہ اور استغفار ہماری زندگی کا ایک حصہ ہونا چاہیے۔

توبہ واستغفار پر مداومت کیجیے

ہمارے اکابر نے لکھا ہے کہ: آدمی کو جن اعمال کے اوپر مداومت کا اہتمام کرنا ہے اور روزانہ ان اعمال کو انجام دینا ہے، ان میں سے ایک توبہ اور استغفار ہے، جس کی وجہ سے آدمی اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی گرفت اور پکڑ سے بچا لیتا ہے۔

استغفار اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچانے والا عمل ہے

چناں چہ اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَمَا كَانَ ٱللَّهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنتَ فِيهِمْۚ وَمَا كَانَ ٱللَّهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُونَ ۳۳﴾[الأنفال] کہ: اے نبی! جب تک آپ کی ذات ان کے درمیان میں موجود ہے، ان کے اوپر عذاب نہیں آسکتا ہے اور جب تک وہ اپنے گناہوں سے استغفار کرتے رہیں گے، تب بھی ان پر عذاب نہیں آئے گا۔

گویا اللہ تعالیٰ کے عذاب سے امان اور بچانے والی دو چیزیں ہیں: ایک تو نبیٔ کریم ﷺ کی ذاتِ بابرکات کا وجود اور دوسرا استغفار، اب آپ ﷺ تو دنیا سے تشریف لے گئے لیکن استغفار ایک ایسا عمل اب بھی موجود ہے جس سے آدمی اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی گرفت اور عذاب سے بچا سکتا ہے۔ بہر حال! توبہ بڑی اہمیت رکھتی ہے اور توبہ کی وجہ سے اللہ تبارک وتعالیٰ خوش بھی بہت ہوتے ہیں۔

دنیا اور خالقِ دنیا کا دستور

دنیا کا دستور تو یہ ہے کہ اگر کسی ماتحت نے اپنے بڑے کی نافرمانی کی ہو، اس کو ناراض کرنے والا کام کیا ہو تو وہ معافی مانگنے کے لیے آتا ہے تو وہ اپنی ناراضگی کے اظہار کے لیے اس کو معافی کا جلدی موقع بھی نہیں دیتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی شانِ رحمت دیکھیے، فرماتے ہیں: ﴿قُلْ يَٰعِبَادِيَ ٱلَّذِينَ أَسْرَفُواْ عَلَىٰٓ أَنفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُواْ مِن رَّحْمَةِ ٱللَّهِۚ إِنَّ ٱللَّهَ يَغْفِرُ ٱلذُّنُوبَ جَمِيعًاۚ﴾[الزمر۵۳] کہ: اے میرے وہ بندو! جنھوں نے گناہ کرکے اپنی جانوں کے اوپر ظلم اور زیادتی کی ہے، اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا، اللہ تعالیٰ سارے گناہوں کو معاف کرنے والا ہے۔

گنہگار کے دل میں مایوسی پیدا کرنا شیطان کی ایک بڑی چال

شیطان کے جو مختلف حربے ہیں، مختلف مکائد ہیں، مختلف چالیں اور دھوکے ہیں، ان میں سے ایک چال یہ بھی ہے کہ وہ گنہگار کے دل میں مایوسی پیدا کرتا ہے، اس کے دل میں یہ خیال ڈالتا ہے کہ میں تو بہت بڑا گنہگار ہوں، میں نے اتنے سارے گناہ کیے

ہیں، بھلا میری کیا مغفرت ہوسکتی ہے۔

حضرت حکیم اختر صاحب رحمۃ اللہ علیہ، حضرت ڈاکٹر عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ- جو حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کے اجل خلفاء میں سے ہیں، ان- کا ایک مقولہ نقل فرماتے ہیں کہ وہ فرمایا کرتے تھے کہ: دیکھو! یہ کراچی جیسا بڑا شہر جس میں لاکھوں کی آبادی ہے، کروڑ تک پہنچی ہوئی ہے، ان کا سارا پیشاب، پاخانہ اور ساری غلاظتیں سمندر کے اندر جاتی ہیں، بحرِ عرب کے اندر پہنچتی ہیں تو کیا ان غلاظتوں کی وجہ سے سمندر ناپاک ہوجائے گا؟، نہیں! ایک موج آتی ہے اور ان ساری غلاظتوں کو ختم کر دیتی ہے۔

اسی طرح اللہ تبارک وتعالیٰ کی رحمت کی ایک موج بڑے سے بڑے گنہگار کے گناہوں کو ختم کرنے کے لیے کافی ہے، یہ نہ سوچا جائے کہ میں تو بڑا گنہگار ہوں اور میرے گناہ تو بہت بڑے بڑے ہیں، ان کی معافی کیسے ہوسکتی ہے!۔

اللہ تبارک وتعالیٰ جب سو آدمیوں کے قاتل کو صرف توبہ کے ارادے پر معاف کر کے جنت کے اندر بھیج سکتے ہیں، ابھی تو توبہ کی نوبت آئی بھی نہیں تھی۔

محض توبہ کا ارادہ کرنے پر سو آدمیوں کے قاتل کی معافی

بخاری شریف کی روایت ہے کہ: ایک آدمی نے ننانوے قتل کیے تھے، پھر اس کے دل میں خیال آیا کہ میرا کیا ہوگا؟ میری توبہ قبول ہوسکتی ہے یا نہیں؟ کچھ لوگوں سے پوچھا کہ میں کس سے معلوم کروں تو کسی نے ایک عابد کا حوالہ دیا، وہ عابد تھا، عالم نہیں تھا۔ یہ آدمی اس عابد کے پاس پہنچا اور کہا کہ میں نے ننانوے قتل کیے ہیں، میرے لیے

توبہ کی گنجائش ہے یا نہیں؟ اس عابد نے کہا کہ ننانوے قتل کیے ہیں؟ تیرے لیے تو توبہ کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ اس نے کہا کہ اچھا! ننانوے قتل ہیں، ایک اور سہی، یہ کہہ کر اس کو بھی قتل کر دیا۔

اس کے بعد پھر اپنے گناہوں کا خیال آیا تو کسی نے ایک عالم کا پتہ بتلایا، وہ اس عالم کے پاس پہنچا اور حقیقت بتلائی، اس عالم نے کہا کہ فلاں جگہ نیک لوگوں کی ایک بستی ہے، تم وہاں پہنچ جاؤ، ان کے درمیان میں رہو، ہوسکتا ہے کہ ان کے پاس رہنے کی برکت سے اللہ تعالیٰ تمھاری توبہ قبول فرمالے۔

یہ آدمی اس عالم کے مشورے کے مطابق اس بستی کی طرف جانے کے لیے روانہ ہوا، وہ ابھی راستے ہی میں تھا کہ اس کی موت کا وقت قریب آ گیا، فرشتوں نے اس کی روح قبض کر لی۔

روح قبض کرنے کے بعد اس کو جنت میں لے جائیں یا جہنم میں؟ اس سلسلے میں ملائکۂ رحمت اور ملائکۂ عذاب میں نزاع اور جھگڑا ہو گیا۔ رحمت کے فرشتے کہنے لگے کہ وہ تو توبہ کے ارادے سے جا رہا تھا یعنی وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا مستحق ہو چکا ہے اور عذاب والے فرشتے کہنے لگے کہ وہ ابھی اس بستی میں پہنچا تھوڑی ہے، ابھی تو راستے میں ہے، اس لیے وہ رحمت کا مستحق نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتے ہی کو ان کے پاس بھیجا، انھوں نے ان کو اپنے اس نزاع میں حَکَم بنایا تو اس فرشتے نے یہ فیصلہ سنایا کہ مسافت کو ناپ لو: جہاں سے نکلا ہے، وہاں سے لے کر اِس جگہ تک کی مسافت اور یہاں سے لے کر جس بستی کی طرف جا رہا تھا،

اُس کی مسافت ناپ لو، یہ آدمی جس جگہ کے قریب ہو، اس کے مطابق فیصلہ ہوگا۔

ویسے تو وہ بالکل بیچ ہی میں تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے اس بستی کو جس کی طرف وہ جارہا تھا، اس کو حکم دیا کہ تو ذرا اس آدمی کے قریب ہوجا، کیوں کہ مقربین کی بستی تھی اور جس بستی سے نکلا تھا، اس کو حکم دیا کہ تو ذرا دور ہوجا، جب ناپا گیا تو اِس بستی سے تھوڑا سا قریب تھا، جس کی طرف جارہا تھا، اس لیے جنت کا فیصلہ کردیا گیا(۱)۔

مذکورۂ بالا واقعہ سے ملنے والا سبق

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ صرف توبہ کا ارادہ کرنے اور توبہ کے لیے ایک بستی کی طرف جانے ہی پر سو آدمیوں کے قاتل کو معاف فرمادیا اور جنت میں داخل فرمادیا اور ہمارا جو یہ مجمع ہے، جہاں تک ہم سمجھتے ہیں، ان میں سے کوئی ایک بھی کسی کا قاتل نہیں ہوگا؛ اس لیے اپنے گناہوں کے متعلق سوچ کر مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ جب کوئی گنہگار توبہ کرتا ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ اس کی توبہ کی وجہ سے اتنے خوش ہوتے ہیں، اتنے خوش ہوتے ہیں کہ جس کا ہم اور آپ اندازہ نہیں کرسکتے۔

بندے کی توبہ پر اللہ تعالیٰ کی خوشی اور ایک مثال

حضرت انس رضی اللہ عنہ ـ جو نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خادم ہیں ـ روایت کرتے ہیں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: ایک آدمی صحرا کے اندر ہے اور اس کا کھانے پینے کا سارا سامان اونٹ پر ہے اور اس کا وہ اونٹ گُم ہوگیا اور وہاں کوئی ہے نہیں، نہ آدم، نہ آدم زاد،

(۱) صحيح البخارى، عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الخُدْرِيِّ رضي الله عنه، بَابُ حَدِيثِ الغَارِ، ر:۳۴۷۰.

چوں کہ اس کا کھانا، پینا اور ساری ضروریات اسی اونٹ کے اوپر لدی ہوئی تھی، اس لیے اس نے اونٹ کو خوب تلاش کیا کہ اگر یہ مل گیا تو ٹھیک ہے، ورنہ تو میری موت یقینی ہے۔ اس نے خوب تلاش وجستجو کی لیکن اونٹ نہیں ملا تو وہ مایوس ہو گیا کہ اب یہ ملنے والا نہیں ہے اور کھانا اور پانی نہ ہونے کی وجہ سے اب میری موت یقینی ہے، اس لیے اب وہ مایوس ہو کر ایک درخت کے نیچے جا کر، یہ سوچتے ہوئے لیٹ گیا کہ اب یہیں پر میری موت آنے والی ہے۔ ابھی وہ لیٹا ہوا ہے کہ اس نے لیٹے لیٹے اچانک دیکھا کہ اس کا اونٹ اس کے قریب ہے، اس اونٹ کو دیکھ کر مارے خوشی کے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہتا تھا لیکن اس کی زبان سے یہ الفاظ نکل گئے: اللهُمَّ أَنْتَ عَبْدِي وَأَنَا رَبُّكَ: اے اللہ! آپ میرے بندے اور میں آپ کا رب ہوں، کہنا تو یہ چاہتا تھا کہ میں آپ کا بندہ اور آپ میرے رب ہیں؛ لیکن فرطِ مسرت اور خوشی کی انتہا میں اس کی زبان پھسلی اور بجائے اس کے کہ وہ یوں کہتا کہ ''میں آپ کا بندہ اور آپ میرے رب ہیں'' وہ یوں کہہ بیٹھا: ''آپ میرے بندے اور میں آپ کا رب ہوں''، اس کی خوشی کی انتہا کو بتلانا مقصود ہے کہ یہ آدمی کتنا خوش ہو گیا؟۔

جب کوئی بندہ توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ سے اس بندے سے بھی زیادہ خوش ہوتے ہیں[۱]۔

آپ اندازہ لگائیں، اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں کے ساتھ کتنا تعلق ہے! جب اللہ کا کوئی بندہ اس طرح اللہ تعالیٰ کے دربار میں پہنچتا ہے، چاہے وہ سالہا سال سے کٹا ہوا

---

(۱) صحيح مسلم، عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رضي الله عنه، بَابٌ فِي الْحَضِّ عَلَى التَّوْبَةِ إلخ، ر: ۲۷٤۷.

ہوتو بھی اللہ تبارک وتعالیٰ اس سے بڑے خوش ہوتے ہیں۔

بہرحال! توبہ تو ایک ایسی چیز ہے کہ جس کا اللہ تبارک وتعالیٰ نے حکم دیا اور ساتھ ہی ساتھ اس پر اللہ تبارک وتعالیٰ خوش بھی ہوتے ہیں، اس کے لیے اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ہر وقت دروازے کھلے ہوئے ہیں۔

در تیری رحمت کے ہیں ہر دم کھلے

دنیا کے حاکموں کا تو حال یہ ہے کہ دن میں ان کا دربار اور آفس کھلا ہوا ہوتا ہے اور رات میں بند ہو جاتا ہے، آپ رات میں جائیں گے تو ان سے آپ کی ملاقات نہیں ہو پائے گی۔ لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کے دربار میں ۲۴ رگھنٹوں میں سے جب چاہے جائیں اور جا کر اپنی عرضی پیش کر دیجیے، توبہ کا دروازہ ہر وقت کھلا ہوا ہے اور بہت وسیع اور بہت بڑا دروازہ ہے، سورج جب تک مغرب سے طلوع نہیں ہوگا، وہاں تک یہ دروازہ کھلا رہے گا۔

یہ ساری تفصیلات، اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے یہ ساری تاکیدیں اور اللہ تعالیٰ کے پاک رسول ﷺ کی تاکید اور آپ کا عمل، ان ساری چیزوں کا تقاضا یہ ہے کہ ہم توبہ کا اہتمام کریں اور توبہ تو واجب ہے۔

توبہ راہِ سلوک کا پہلا قدم

اس توبہ کے بارے میں امام غزالیؒ فرماتے ہیں: اولُ أقدامِ المریدین: جو آدمی کسی پیر یا شیخ سے بیعت وارادت کا تعلّق قائم کرنا چاہتا ہے تو اس کا پہلا قدم توبہ

ہے[۱]۔ گویا ہم تقوے کے راستے پر چلنا چاہتے ہیں تو ہمارے تقوے کی شروعات توبہ سے ہوگی، گویا یہ اس راہ کا پہلا قدم ہے، یہاں ہم اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لیے آئے ہیں تو ہمیں اس پہلے قدم کا اہتمام کرنا چاہیے۔

توبہ کی لغوی تحقیق

توبہ کیا ہے؟ توبہ یہ عربی زبان کا لفظ ہے تَابَ یَتُوْبُ سے، جس کا معنی ہوتا ہے لوٹنا، واپس آنا۔ عربی زبان میں جو افعال اور صیغے ہوتے ہیں، ان کے صلے حروف کی شکل میں ہوتے ہیں اور ان صلوں کے بدلنے سے معانی میں بھی بڑی تبدیلی آجاتی ہے، تَابَ کا صلہ جب إِلیٰ آئے گا تو اس کا معنی ہوگا ''بندہ اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹا''۔

﴿وَتُوبُوٓاْ إِلَى ٱللَّهِ جَمِيعًا أَيُّهَ ٱلۡمُؤۡمِنُونَ لَعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُونَ ٣١﴾ اور ﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ تُوبُوٓاْ إِلَى ٱللَّهِ تَوۡبَةً نَّصُوحًا﴾، اے ایمان والو! تم سب کے سب اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹو۔

صلہ کے بدلنے سے توبہ کے معنی بدلنے کی وضاحت

بندہ گناہ کر کے گویا اللہ تعالیٰ سے ہٹ گیا تھا، اب وہ گناہ چھوڑ کر، اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرماں برداری اختیار کر کے دوبارہ اللہ تعالیٰ کے پاس حاضر ہو رہا ہے، لوٹ رہا ہے، اس لیے اس کو توبہ کہتے ہیں اور بندے کے اس فعلِ توبہ کے لیے صلہ کے طور پر لفظِ إِلیٰ استعمال کرتے ہیں۔

---

① إحياء علوم الدين٤/ ٢، كتاب التوبة.

اور جب توبہ کے کسی صیغے کی اسناد اللہ تعالیٰ کی طرف کی جاتی ہے تو اس کا صلہ عَلیٰ آتا ہے اور اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو توبہ کی توفیق عطا فرمائی، اس کی توبہ کو اللہ تعالیٰ نے قبول فرمایا۔

اس میں بھی لوٹنے والا معنیٰ ہے، کیوں کہ بندہ معصیت اور نافرمانی والی زندگی سے لوٹ کر اطاعت اور فرماں برداری والی زندگی میں آیا ہے، اس سے پہلے گناہ اور معاصی کی وجہ سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کو اپنی رحمت سے دور کر دیا تھا، اپنی رحمت سے محروم کر دیا تھا، اب جب توبہ کرے گا تو اللہ تبارک وتعالیٰ دوبارہ اس کے ساتھ رحمت کا اور مہربانی کا معاملہ فرمائیں گے، اللہ تعالیٰ دوبارہ اس پر مہربان ہوا۔

لفظِ تَوَّابٌ اللہ تعالیٰ اور بندوں دونوں پر بولا جاتا ہے

اللہ کے صفاتی ناموں میں سے ایک صفت تَوَّابٌ ہے اور بندے کے لیے بھی یہ لفظِ تَوَّابٌ استعمال کیا جاتا ہے، حدیث میں آتا ہے: كُلُّ ابْنِ آدَمَ خَطَّاءٌ، وَخَيْرُ الخَطَّائِينَ التَّوَّابُونَ: تم میں سے ہر ایک خطا کار ہے، گنہگار ہے، ہر ایک سے خطا کا صدور ہوتا ہے اور بہترین گنہگار وہ ہے جو کثرت سے توبہ کرنے والا ہو[1]۔

بہر حال! لفظِ تَوَّابٌ ایسی صفت ہوئی جس کا استعمال اللہ تعالیٰ کے لیے بھی ہوتا ہے اور بندوں کے لیے بھی؛ لیکن نسبت کے اعتبار سے دونوں کے معنیٰ میں فرق ہو جائے گا۔

---

(١) سنن الترمذی، عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ، ر:٢٤٩٩.

الغرض! توبہ کا لغوی معنی ''لوٹنا'' ہوا، یہاں بھی بندہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے فرماں برداری کی طرف لوٹتا ہے، اس لیے اس کو توبہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

لفظِ اِستغفار کی تحقیق

دوسرا لفظ استغفار ہے، استغفار کا لغوی معنی ہے: ''معافی چاہنا''، یہ مغفرت سے ہے اور مغفرت کا اصل معنی تو ''چھپانا'' ہوتا ہے، زرہ جو لڑائیوں کے موقع پر پہنی جاتی ہے، اس کو مِغْفَر کہتے ہیں، کیوں کہ وہ آدمی کے جسم کو چھپا دیتی ہے، اللہ تعالیٰ بندے کی معافی طلب کرنے سے اس کے گناہوں کو ڈھانپ دیتے ہیں، چھپا دیتے ہیں، اس لیے اس کو استغفار سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

توبہ اور استغفار میں پہلا فرق

استغفار توبہ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے لیکن دونوں میں تھوڑا سا فرق ہے، جو شرطیں توبہ کے لیے ہیں، استغفار ان شرطوں کی رعایت کے بغیر بھی ہوسکتا ہے اور توبہ اپنی شرطوں کے بغیر متحقق نہیں ہوتی۔

توبہ اور استغفار میں دوسرا فرق

پھر توبہ میں گنہگار ہی توبہ کرے گا، اگر گناہ میرا ہے تو میں توبہ کروں گا تو ہی توبہ قبول ہوگی، کوئی دوسرا میری طرف سے توبہ کرے تو اس سے میرا گناہ معاف نہیں ہوگا اور استغفار گنہگار آدمی کی طرف سے دوسرا آدمی بھی کرسکتا ہے کہ: یا اللہ! اس کے گناہوں کو معاف فرما۔

توبہ کی صحت کے لیے پہلی شرط

گناہ پر قائم اور باقی رہتے ہوئے توبہ نہیں ہوسکتی، علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے توبہ کے لیے تین شرطیں بیان فرمائی ہیں، پہلی شرط ہے: أَنْ يُقْلِعَ عَنِ الْمَعْصِيَةِ کہ: آدمی گناہ کو چھوڑ دے، جن جن گناہوں سے توبہ کر رہا ہے، پہلے ان گناہوں کو چھوڑ دے، گناہوں کو چھوڑے بغیر، گناہوں پر قائم رہتے ہوئے توبہ کرے گا تو وہ توبہ توبہ نہیں ہے، وہ قبول نہیں ہوگی۔

توبہ را ہم خندہ می آید بریں توبہ

بقول حضرت حکیم اختر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کہ: بہت سے لوگ عورتوں کو دیکھتے بھی جاتے ہیں اور زبان سے یہ بھی کہتے جاتے ہیں: ''توبہ، توبہ، توبہ'' دیکھو! یہ کیسے بے پردہ جارہی ہیں۔ یہ کیسی توبہ ہے؟ گناہ کرتے جارہے ہیں اور توبہ توبہ کہہ رہے ہیں، پہلے گناہ سے اپنے آپ کو نکالو، پھر توبہ کرو۔

ساری دنیا کا پانی بھی اس کو پاک نہیں کرسکتا

ایک آدمی نجاست کے گڑھے میں پڑا ہوا ہے، وہ نجاست سے پاک ہونا چاہتا ہے تو ہم اس سے کہیں گے کہ بھائی! تو پہلے نجاست کے اس گڑھے سے باہر نکل، اس کے بعد تجھ پر بالٹیوں سے یا نل لگا کر تجھ پر پانی چھوڑیں گے، وہ کہے کہ نہیں، میں تو اسی میں پڑا رہتا ہوں، گڑھے میں پڑا رہے گا تو ساری دنیا کا پانی اس کے اوپر بہائیں گے تو بھی وہ پاک ہونے والا نہیں ہے۔ اسی طرح گناہ پر باقی رہتے ہوئے توبہ نہیں ہوسکتی،

توبہ کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ آدمی پہلے اُس گناہ کو چھوڑ دے۔

توبہ کی صحت کے لیے دوسری شرط

توبہ کی صحت کے لیے علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے دوسری شرط یہ بیان فرمائی ہے:
وَيَنْدَم عَلَى فِعْلِهَا کہ: جو گناہ اس سے ہوگیا، اس پر ندامت ہو، پچھتاوا ہو۔

ندامت کہتے ہیں تَألُّمُ الْقَلْبِ کو یعنی دل کے اندر درد اور بے چینی کا پیدا ہونا، گویا اس کے دل کے اندر ایک بے چینی سی پیدا ہو جائے کہ میں نے یہ کیا کیا؟ کس ذات کی میں نے نافرمانی کرڈالی؟ کس اللہ کا حکم توڑ کر کے میں نے اس کو ناراض کیا؟۔

جیسے عاشق کا معشوق اور کسی محب کا محبوب کسی بات پر ناراض ہو جائے تو اس عاشق اور محب کو چین نہیں ملتا، اگر وہ بھوکا ہے اور اس کے سامنے زردہ اور پلاؤ رکھا جائے تو بھی اس کی بھوک مر جائے گی کہ میرا محبوب تو مجھ سے ناراض ہے میں کیسے کھا سکتا ہوں، کیسا ہی ایر کنڈیشن والا کمرہ ہو اور کیسا ہی نرم بستر ہو، اس کو نیند نہیں آئے گی، دل کی بے چینی کی وجہ سے کسی بھی پل وہ راحت محسوس نہیں کرے گا۔

اللہ تعالیٰ اور بندوں کے درمیان تعلق

اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ بندوں کا جو تعلق ہے، وہ ایسا ہی ہے، جیسا کہ ایک عاشق کو اپنے معشوق کے ساتھ اور ایک محب کو اپنے محبوب کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔

قرآن میں باری تعالیٰ فرماتے ہیں:﴿وَٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ أَشَدُّ حُبًّا لِّلَّهِ﴾[البقرة ۱۶۵]
کہ: ایمان والے اللہ تعالیٰ کے ساتھ بہت ٹوٹ کر اور بہت شدت کے ساتھ محبت

کرتے ہیں، یہ ایمان ہی محبت ہے، مؤمن یعنی محب: اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے والا۔

اگر ہم محبت کا دعوی کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کے ناراض ہوتے ہوئے ہمیں چین اور سکون نہیں ملنا چاہیے۔

حضور ﷺ کے ساتھ حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کی محبت کی انتہا

حضراتِ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو نبیٔ کریم ﷺ کے ساتھ جو تعلق تھا، جو محبت تھی اس کے پیشِ نظر نبیٔ کریم ﷺ کی ذرا سی ناراضگی کو اور آپ ﷺ کی ذرا سی بے التفاتی کو دیکھ کر وہ بے سکون اور پریشان ہو جاتے تھے۔

''حکایاتِ صحابہ'' میں آپ نے پڑھا ہوگا کہ ایک مرتبہ نبیٔ کریم ﷺ تشریف لے جا رہے تھے، قُبّہ نما ایک مکان پر آپ کی نظر پڑی تو آپ ﷺ نے پوچھا کہ: یہ کس کا مکان ہے؟ تو ان صحابی کا نام لے کر بتایا گیا کہ فلاں صحابی کا ہے۔

اس کے بعد دوسرے دن جب آپ ﷺ مجلس میں تشریف فرما تھے تو وہی صحابی -جن کے متعلق بتایا گیا تھا کہ یہ ان کا مکان ہے، وہ- آئے اور نبیٔ کریم ﷺ کے پاس حاضر ہو کر سلام کیا، حضور ﷺ نے ان کی طرف سے اپنا رخ پھیر لیا اور سلام کا جواب نہیں دیا تو بے چین ہو گئے اور وہاں موجود صحابہ سے پوچھنے لگے کہ کیا بات ہے کہ میں حضور ﷺ کو اپنے سے ناراض دیکھ رہا ہوں؟ کیا میری کوئی شکایت آپ ﷺ تک پہنچی ہے؟ آپ کے علم میں کچھ ہے؟۔ لوگوں نے بتلایا کہ کل ایسا ہوا تھا کہ آپ کے مکان کے پاس سے نبیٔ کریم ﷺ کا گذر ہوا تو اس وقت آپ نے پوچھا تھا کہ یہ کس کا

ہے؟ تو لوگوں نے بتلایا کا یہ آپ کا مکان ہے۔ ان کی سمجھ میں بات آ گئی، بس اسی وقت گئے اور مکان کوڈھا دیا لیکن ڈھانے کے بعد آ کر یہ نہیں کہہ رہے ہیں کہ اے اللہ کے رسول! آپ کے دل میں جو کانٹا تھا، جو پھانس تھی، وہ میں نے نکال دی ہے۔

حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم اور ہمارے درمیان ایک بہت بڑا فرق

ہم تو آ کر احسان جتلائیں گے کہ حضرت! جس چیز سے آپ کو بہت تکلیف ہو رہی تھی، الحمد للہ! میں نے اس کو دور کر دیا، گویا حضرت پر احسان رکھتے ہیں، حضراتِ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا ادب واحترام تو عجیب وغریب تھا، ہم اور آپ تو اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ بہر حال! انھوں نے آ کر بتلایا بھی نہیں کہ میں نے اس مکان کو گرا دیا بلکہ کچھ دنوں کے بعد نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا دوبارہ اس جگہ سے گذر ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے پوچھا کہ بھائی! یہاں قبہ نما مکان تھا، اس کا کیا ہوا؟ تب انھوں نے کہا کہ جن صاحب کا یہ مکان تھا، وہ آپ کی خدمت میں آئے تھے اور سلام کیا تھا لیکن آپ نے ان سے بے رخی اور ناراضگی کا معاملہ فرمایا تھا اور ان کو اس کا سبب پتہ چلا تو اسی وقت آ کر اس مکان کوڈھا دیا تھا۔

سلام کا جواب نہ ملنے پر حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی بے چینی

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ''ذوالہجرتین'' ہیں، ان صحابہ میں سے ہیں، جنھوں نے حبشہ کی بھی ہجرت کی تھی اور مدینۂ منورہ کی بھی ہجرت کی تھی، فرماتے ہیں کہ جب میں حبشہ سے مدینۂ منورہ آیا۔ یہ جس وقت مکۂ مکرمہ سے ہجرت کر کے حبشہ گئے تھے،

اس زمانے میں نماز کے دوران بات چیت کرنے کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجازت تھی، کوئی سلام کرتا تو سلام کا جواب دینے کی بھی اجازت تھی، یہ سارے مسئلے ان کے ذہن میں تھے، ان کے حبشہ قیام کے دوران یہ حکم منسوخ ہوگیا اور نماز کے درمیان بات چیت کرنے کی اجازت ختم کردی گئی اور سلام کا جواب دینے کی اجازت بھی باقی نہیں رہی، یہ مسئلہ ان کو معلوم نہیں تھا۔

وہ جب حبشہ سے ہجرت کر کے مدینۂ منورہ آئے تو فرماتے ہیں کہ جب میں نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پہنچا تو میں نے آپ کو سلام کیا، آپ نماز میں تھے، ان کو وہی پرانی بات یاد تھی کہ نماز کے دوران سلام کر سکتے ہیں اور نمازی کی طرف سے سلام کا جواب بھی ملے گا لیکن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سلام کا جواب نہیں دیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تو اس لیے جواب نہیں دیا کہ آپ نماز کے اندر تھے اور نماز کے دوران سلام کا جواب دینے کی ممانعت نازل ہو چکی تھی لیکن ان کو معلوم نہیں تھا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میرا اگلا پچھلا سارا ڈیٹا میری نگاہوں کے سامنے گھوم گیا کہ کیوں آخر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میرے سلام کا جواب نہیں دیا، یہاں تک کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز سے سلام پھیرا، اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: إِنَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ مِنْ أَمْرِهِ مَا يَشَاءُ کہ اللہ تعالیٰ جیسا چاہتے ہیں، اپنے حکموں کو بدلتے ہیں، پہلے نماز میں سلام کا جواب دینے کی اجازت تھی، اب باقی نہیں رہی، اس لیے میں نے آپ کے سلام کا جواب نہیں دیا، پھر آپ نے ان کے سلام کا جواب دیا،

تب ان کی جان میں جان آئی[۱]۔

اسی طرح اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ بندے کو محبت کا جو تعلق ہے، اس کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے بعد اس کے دل میں چین نہیں آنا چاہیے۔

گناہ ایک آگ ہے

اور ویسے بھی گناہ کی خاصیت ہے، گناہ ایک طرح کی آگ ہے، آدمی جب گناہ کرتا ہے تو جب تک وہ اپنے آپ کو اس گناہ سے نکالے گا نہیں اور توبہ نہیں کرے گا، وہاں تک اس کے دل میں چین نہیں آئے گا۔

سکون اللہ کی فرماں برداری میں ہے

اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿أَلَا بِذِكْرِ ٱللَّهِ تَطْمَئِنُّ ٱلْقُلُوبُ ۝٢٨﴾ [الرعد] کہ: اللہ کے ذکر ہی سے دلوں کو اطمینان اور سکون حاصل ہوتا ہے۔ ذکر کا مطلب ہی یہ ہے کہ آدمی ہر وقت اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرماں برداری کرے، اللہ تبارک وتعالیٰ کی اطاعت اور فرماں برداری ہی میں سکون اور چین ہے، اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں سکون اور چین نہیں آئے گا۔

دنیا میں جو بڑے بڑے مال دار ہیں، چاہے ملینیر ہو یا ٹریلینیر ہو اور ان کے پاس بڑے بڑے بنگلے ہوں، عمدہ سے عمدہ کاریں ہوں، دنیوی اعتبار سے راحت کے سارے اسباب موجود ہوں، پھر بھی ان کو سکون اور اطمینان نہیں ہے، ان کے دلوں میں

[۱] سنن أبي داود، عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ، الْكَلَامُ فِي الصَّلَاةِ، ر: ١١٤٥.

تو بے چینی ہی ہے، رات کو انھیں نیند نہیں آتی، نیند لانے کے لیے انھیں دوا اور ٹیبلیٹ لینی پڑتی ہے۔

معلوم ہوا کہ اصل چین اور سکون اللہ تعالیٰ کے ذکر میں ہے، اس کی اطاعت اور فرماں برداری میں ہے، سکون اور اطمینان کا اصل تعلق اللہ تعالیٰ کی ذات سے ہے، اگر آپ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرماں برداری میں ہیں تو آپ کو سکون ملے گا، چاہے آپ کے پاس کوئی بنگلہ نہ ہو، کوئی کار نہ ہو، کوئی بینک بیلنس نہ ہو، سوکھی روٹی اور چٹنی ہو تو اس پر بھی آپ کو سکون اور چین حاصل ہوگا۔

بے سکونی گناہ کا خاصّہ ہے

حقیقت یہ ہے کہ گناہ کرنے والا کبھی قلبی سکون اور چین نہیں پا سکتا، وہ بے چین ہی رہے گا، دنیا کے سبھی لوگوں کا آپ جائزہ لے کر دیکھ لیجیے، ان کے اندرونی حالات معلوم کرو تو آپ کو پتہ چل جائے گا، واقعات اسی کی شہادت دیتے ہیں۔ گناہ کا خاصہ ہی یہ ہے کہ وہ آدمی کے چین اور سکون کو چھین لیتا ہے۔ اگر تعلق اور محبت کی وجہ سے چین اور سکون چھین جائے اور پھر وہی تعلق اور محبت اس کو گناہ سے ہٹا کر دوبارہ اللہ کی اطاعت اور فرماں برداری کا ذریعہ بن جائے تو اس سے بڑی بات کیا ہوگی، اسی کو کہا تھا: وَيَنْدَم عَلَى فِعْلِهَا کہ: اس گناہ کے کرنے پر آدمی نادم اور بے چین ہو جائے۔

توبہ کی صحت کے لیے تیسری شرط

توبہ کی صحت کے لیے تیسری شرط یہ بیان فرمائی: وَيَعْزِم أَنْ لَا يَعُود إِلَيْهَا: اور

پختہ ارادہ کرے کہ وہ اس گناہ کی طرف دوبارہ نہیں لوٹے گا، میں مرجاؤں گا لیکن دوبارہ یہ گناہ نہیں کروں گا ①۔

دیکھو! توبہ کے وقت یہ پختہ ارادہ ہونا چاہیے، بعد میں آدمی کی اپنی کمزوری کی وجہ سے پہلی پڑی ہوئی عادت کی وجہ سے، غیر اختیاری طور پر، نہ چاہنے کے باوجود اس سے دوبارہ وہ گناہ ہوگیا تو دوسری مرتبہ اس گناہ کا ہوجانا، یہ پہلی والی توبہ کی راہ میں رکاوٹ نہیں ہوگی، کیوں کہ وہ اپنی جگہ پر پختہ توبہ ہے۔

گناہ کے بعد توبہ کرنے والا ایسا ہے، جیسا کہ اس کا کوئی گناہ نہ ہو

بعض لوگوں کو اس میں اشکال ہوتا ہے کہ جب دوبارہ گناہ ہوگیا تو یہ توبہ کیسی؟ لیکن ایسا نہیں ہے، جب توبہ کے وقت یہ پکا ارادہ ہے کہ میں مرجاؤں گا لیکن دوبارہ یہ گناہ نہیں کروں گا، اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کروں گا تو توبہ ہوگئی اور گناہ معاف ہوگیا، جیسا کہ حدیث میں ارشاد ہے: التَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهُ کہ: جو آدمی گناہ سے توبہ کرتا ہے، وہ ایسا ہے، جیسا کہ اس کا کوئی گناہ ہی نہ ہو ②۔

باز آ، باز آ، ہر آں کہ ہستی باز آ

تو اس کا گناہ معاف ہوگیا، اب اگر اس کے بعد دوبارہ گناہ ہوجاتا ہے تو دوبارہ

① المنهاج شرح صحيح مسلم ٢/ ٤٥، باب بيان نقصان الإيمان بالمعاصي إلخ

② شعب الإيمان، عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَبَّاسٍ رضي الله عنهما، بَابٌ فِي مُعَالَجَةِ كُلِّ ذَنْبٍ بِالتَّوْبَةِ، ر: ٦٧٧٠.

توبہ کرلیں گے، توبہ تو بار بار کی جاتی ہے،

باز آ، باز آ، ہر آں کہ ہستی باز آ		گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ
ایں درگہِ ما درگہِ نومیدی نیست		صد بار توبہ شکستی باز آ

آؤ، آؤ، لوٹ کر کے واپس آؤ، چاہے تم کافر بھی ہو، آتش پرست بھی ہو، بت پرست بھی ہو۔ باری تعالیٰ کی طرف سے یہ اعلان ہوتا ہے کہ تم آؤ، ہمارا یہ دربار ناامیدی کا نہیں ہے، سو بار بھی اگر تم سے توبہ ٹوٹی ہے تو بھی واپس آؤ۔

دنیا کا دستور تو یہ ہے کہ بیٹے نے باپ کی نافرمانی کی اور معافی مانگ لی اور معاف کردیا، دوسری مرتبہ معافی مانگ لی، تیسری مرتبہ معافی مانگ لی، چوتھی مرتبہ میں باپ کہے گا کہ اب میرے پاس معافی مانگنے کے لیے مت آئیو، ورنہ تیری آنکھیں پھوڑ دوں گا، یہاں تو دو تین مرتبہ کے بعد ہی باپ بھی ہاتھ جھاڑ لیتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا بندہ توبہ کو توڑ کر ہزار مرتبہ بھی اس کے دربار میں جائے گا تو وہاں سے اسے ناامید واپس نہیں کریں گے، ایسا پیارا خدا، ایسا مشفق، مہربان خدا! اور ہم اُس کے باوجود توبہ کا اہتمام نہ کریں! یہاں جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں ماحول دیا ہے تو اس کی قدر کر کے دعاؤں کے موقع پر توبہ کا اہتمام کرنا چاہیے۔

دل کو بھی مرمت اور رینوایشن کی ضرورت پڑتی رہتی ہے

یہاں (خانقاہ میں) آکر ہم نے تقوے کی راہ پر چلنے کے لیے پہلا قدم اٹھایا ہے تو ہمارا پہلا کام توبہ ہونا چاہیے، اس لیے توبہ کا اہتمام کریں اور استغفار سے بھی اپنے

آپ کو گناہوں سے پاک کرنے کی محنت کریں، ہمارے قلب میں جوٹوٹ پھوٹ ہوتی ہے تو اس کو ٹھیک ٹھاک اور مرمت کرنے کا، رینوایشن کا طریقہ یہ توبہ ہے، اس لیے اس کا اہتمام کرتے رہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

خلق اللہ کی تحقیر سے بچیے
اپنے قلب کو غلّ وغش سے پاک رکھیے

اس بیان کو مرتب کرتے وقت حسبِ ذیل مقامات کے مواعظ کو سامنے رکھا گیا ہے:

بمقام: جنوبی افریقہ، بوقت: ۷/ ۳/ ۲۰۱۰

بمقام: ڈابھیل، خانقاہ محمودیہ، بوقت: ۶/ ۷/ ۲۰۱۲

بمقام: مسجد نور، مانگرول، بوقت: ۱۵/ شعبان المعظم

بمقام: دبئی، بوقت: ۱۴/ ۱/ ۲۰۱۶

بوقت: ۹/ ۱/ ۲۰۱۶

بمقام: ساؤتھ پوائنٹ مسجد، بوقت: ۲۹/ ۹/ ۲۰۱۵

اقتباس

بہت سی مرتبہ کسی آدمی کی زندگی کا بہت سا وقت ایسے گناہوں میں گذر جاتا ہے پھر اللہ تعالیٰ ہدایت دیتے ہیں اور دین کے کام میں لگ جاتا ہے تو اس کی وجہ سے کبھی اس کے دل میں دوسروں کے متعلق تحقیر کے جذبات آجاتے ہیں، اس سے اپنے آپ کو بہت زیادہ بچانے کی ضرورت ہے، ہمیشہ اپنے آپ کا محاسبہ کرتے رہو کہ میرے دل میں کسی کے متعلق حقارت کا جذبہ تو نہیں ہے۔

نیکی کی راہ پر چلنے والا جو طبقہ ہے، وہ اس مرض اور بیماری میں مبتلا ہے، اس کی وجہ سے آدمی اللہ تعالیٰ کے یہاں اپنے مقام اور مرتبے کو کھو دیتا ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الحمدللّٰه نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا، ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا، ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا، من يهده الله فلا مضل له، ومن يضلله فلا هادي له، ونشهد أن لا إلٰه إلا الله وحده لا شريك له، ونشهد أن سيدنا ومولانا محمداً عبده ورسوله، أرسله إلىٰ كافّة الناس بشيراً ونذيراً، وداعياً إلى الله بإذنه وسراجاً منيراً، صلّى الله تعالىٰ عليه وعلىٰ آله وأصحابه وبارك وسلّم تسليماً كثيراً كثيراً.

أما بعد: فَأَعُوْذُ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ: ﴿وَٱلَّذِينَ جَآءُو مِنۢ بَعۡدِهِمۡ يَقُولُونَ رَبَّنَا ٱغۡفِرۡ لَنَا وَلِإِخۡوَٰنِنَا ٱلَّذِينَ سَبَقُونَا بِٱلۡإِيمَٰنِ وَلَا تَجۡعَلۡ فِي قُلُوبِنَا غِلࣰّا لِّلَّذِينَ ءَامَنُواْ رَبَّنَآ إِنَّكَ رَءُوفࣱ رَّحِيمٌ ﴿١٠﴾﴾[الحشر]

وقال النبی ﷺ لِخَادِمِهِ أَنَسٍ رضی اللہ عنہ: يَا بُنَيَّ! إِنْ قَدَرْتَ أَنْ تُصْبِحَ وَتُمْسِيَ لَيْسَ فِي قَلْبِكَ غِشٌّ لأَحَدٍ فَافْعَلْ ثُمَّ قَالَ لِي: يَا بُنَيَّ وَذَلِكَ مِنْ سُنَّتِي، وَمَنْ أَحَبَّ سُنَّتِي فَقَدْ أَحَبَّنِي وَمَنْ أَحَبَّنِي كَانَ مَعِي فِي الجَنَّةِ[١].

وقال النبی ﷺ: الْمُسْلِمُ أَخُو الْمُسْلِمِ، لَا يَظْلِمُهُ وَلَا يَخْذُلُهُ، وَلَا يَحْقِرُهُ التَّقْوَى هَاهُنَا، وَيُشِيرُ إِلَى صَدْرِهِ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ، بِحَسْبِ امْرِئٍ مِنَ الشَّرِّ أَنْ يَحْقِرَ

---

① سنن الترمذی، بَابُ مَا جَاءَ فِي الأَخْذِ بِالسُّنَّةِ وَاجْتِنَابِ البِدَعِ، ر:٢٦٧٨.

أَخَاهُ الْمُسْلِمَ، كُلُّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ حَرَامٌ، دَمُهُ، وَمَالُهُ، وَعِرْضُهُ①.

وقال النبي ﷺ: لَا تَبَاغَضُوا، وَلَا تَحَاسَدُوا، وَلَا تَدَابَرُوا، وَكُونُوا عِبَادَ اللهِ إِخْوَانًا①.

وقال النبي ﷺ: إِيَّاكُمْ وَالْحَسَدَ، فَإِنَّ الْحَسَدَ يَأْكُلُ الْحَسَنَاتِ كَمَا تَأْكُلُ النَّارُ الْحَطَبَ③.

وقال النبي ﷺ: دَبَّ إِلَيْكُمْ دَاءُ الْأُمَمِ مِنْ قَبْلِكُمْ، الْحَسَدُ وَالْبَغْضَاءُ، وَالْبَغْضَاءُ هِيَ الْحَالِقَةُ، لَا أَقُولُ تَحْلِقُ الشَّعْرَ، وَلَكِنَّهَا تَحْلِقُ الدِّينَ④.

أو كما قال عليه الصلوة والسلام.

متقدمین کے لیے دعائے مغفرت اور مؤمنین کے متعلق کینہ نہ رکھنا

محترم حضرات! یہ آیتِ کریمہ جو میں نے آپ کے سامنے خطبے میں تلاوت کی، اس آیت سے پہلے حضراتِ مہاجرین اور انصار رضوان اللہ علیہم اجمعین کا تذکرہ کیا گیا۔ حضراتِ مہاجرین کو صحابہ میں اوّلین درجہ حاصل ہے، ان کے بعد انصار کا مقام ہے۔ ان دونوں کا تذکرہ کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَالَّذِينَ جَآءُو مِنْ

---

① صحيح مسلم، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضي الله عنه، بَابُ تَحْرِيمِ ظُلْمِ الْمُسْلِمِ إلخ، ر:٢٥٦٤.

② صحيح ابن حبان، بَابُ مَا جَاءَ فِي التَّبَاغُضِ إلخ، ر:٥٦٦٠. صحيح مسلم، عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رضي الله عنه، بَابُ النَّهْيِ عَنِ التَّحَاسُدِ وَالتَّبَاغُضِ وَالتَّدَابُرِ، ر:١٥٥٨.

③ سنن أبی داود، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضي الله عنه، بَابٌ فِي الْحَسَدِ، ر:٤٩٠٣.

④ شعب الإيمان، عَنِ الزُّبَيْرِ بْنِ الْعَوَّامِ رضي الله عنه، بَابٌ فِي الْحَثِّ عَلَى تَرْكِ الْغِلِّ وَالْحَسَدِ، ر:٨٣٧٣.

بَعۡدِهِمۡ يَقُولُونَ رَبَّنَا ٱغۡفِرۡ لَنَا وَلِإِخۡوَٰنِنَا ٱلَّذِينَ سَبَقُونَا بِٱلۡإِيمَٰنِ وَلَا تَجۡعَلۡ فِي قُلُوبِنَا غِلّٗا لِّلَّذِينَ ءَامَنُواْ رَبَّنَآ إِنَّكَ رَءُوفٞ رَّحِيمٌ ﴿١٠﴾ وہ لوگ جو ان انصار اور مہاجرین کے بعد آئے (اس کے اندر قیامت تک آنے والے اہلِ ایمان کو شامل کرلیا گیا) وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہوئے کہتے ہیں: اے اللہ! تو ہماری مغفرت فرما اور ہمارے وہ بھائی جو ہم سے پہلے ایمان لے آئے (یعنی مہاجرین اور انصار) ان کی بھی مغفرت فرما۔

﴿وَلَا تَجۡعَلۡ فِي قُلُوبِنَا غِلّٗا لِّلَّذِينَ ءَامَنُواْ﴾: اور ہمارے دِلوں میں ایمان والوں کے متعلق میل غلّ و غش اور گندگی (بُغض، کینہ، حسد وغیرہ) نہ رکھ۔ ﴿رَبَّنَآ إِنَّكَ رَءُوفٞ رَّحِيمٌ﴾: اے اللہ! تو مہربان، رحمت کرنے والا ہے۔

اس میں گویا قیامت تک آنے والے اہلِ ایمان کا ایک وظیفہ اور ان کا ایک معمول ذکر کیا گیا، ان کے لیے ضروری ہے کہ اس کا اہتمام کریں، یعنی ایک مؤمن کے لیے دعائے مغفرت کرنا۔

ہم آج یہ کریں گے تو ہمارے زمانے سے لے کر نبیٔ کریم ﷺ کے زمانے تک، مہاجرین اور انصار تک جتنے اہلِ ایمان گذرے، سب کے لیے یہ چیز ہوگی اور تمام اہلِ ایمان چاہے اپنے زمانے کے ہوں یا پہلے کے ہوں ان کے متعلق اپنے دل میں کوئی میل نہ ہو، اس کی دعا کروائی گئی، منگوائی گئی۔ معلوم ہوا کہ یہ بہت اہم چیز ہے کہ ایک مسلمان کے دل میں دوسرے مسلمان کے متعلق کوئی غلط اور بُرا جذبہ نہ ہو۔

بندوں پر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی موسلا دھار بارش

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی بے شمار نعمتوں سے ہمیں نواز رکھا ہے، ہمیں اپنی نعمتوں سے ڈھانپ رکھا ہے: ﴿وَأَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهُۥ ظَٰهِرَةً وَبَاطِنَةً﴾ [لقمان۲۰]، اللہ تبارک وتعالیٰ کی نعمتوں میں ہم دن رات لوٹ پوٹ ہوتے رہتے ہیں اور ہر لمحہ، ہر گھڑی ہم اللہ تبارک وتعالیٰ کی نعمتوں کو استعمال کرتے رہتے ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ کی نعمتیں ہر لمحہ ہم پر بارش کی طرح برستی رہتی ہیں۔ باری تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَإِن تَعُدُّواْ نِعْمَتَ ٱللَّهِ لَا تُحْصُوهَآ﴾ [ابراھیم ۳۴] حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری، مہاجرِ مدنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: یہاں واحد کا صیغہ استعمال کیا گیا، اس لیے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ایک نعمت میں اتنی نعمتیں ہیں کہ تم ان کو شمار کرو تو شمار نہیں کرسکتے۔

ریگستان کی ریت کے دانے گنے جاسکتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی نعمتیں نہیں

بہ قول حکیم الاسلام حضرت قاری طیّب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے: بارش کے قطروں کو شمار کیا جاسکتا ہے، صحرا کی ریت کے ذرّات کو شمار کیا جاسکتا ہے، آسمان کے ستاروں کو شمار کرسکتے ہیں لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کی نعمتوں کو شمار کرنا ممکن نہیں ہے، خود باری تعالیٰ نے فرمادیا ہے: ﴿وَإِن تَعُدُّواْ نِعْمَتَ ٱللَّهِ لَا تُحْصُوهَآ﴾ بلکہ بارش کا ہر قطرہ اور آسمان کا ہر ستارہ بھی اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے۔

وہ نعمتیں جو کائنات کی ہر مخلوق کو شاملِ حال ہیں

اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمیں جو نعمتیں عطا فرمائی ہیں، ان میں سے بہت سی نعمتیں

تو وہ ہیں جو کائنات کی ہر مخلوق کو شاملِ حال ہیں، کائنات کی ہر چیز اس سے فائدہ اٹھاتی ہے: سورج کی روشنی، چاند کی روشنی، ہوا، آسمان وزمین، پانی اور بہت ساری چیزیں جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے کائنات میں پیدا فرمائیں، ان تمام نعمتوں سے اللہ تبارک وتعالیٰ کی ہر جان دار اور غیر جان دار مخلوق فائدہ اٹھاتی ہے۔

حیوانات کے ساتھ مخصوص نعمتیں

بعض نعمتیں وہ ہیں جو حیوانات کے ساتھ خاص ہیں، صرف جان دار ہی اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں، جیسے: اللہ تعالیٰ نے زندگی عطا فرمائی، جسم عطا فرمایا، جسم کے اندر ظاہری اور باطنی قُویٰ رکھے، آنکھیں عطا فرمائیں، کان دیئے، زبان دی، ہاتھ دیئے، پاؤں دیئے اور دوسرے بے شمار اعضاء دے کر اس میں حکمتیں اور مصلحتیں رکھ دیں، جن سے جان دار فائدہ اٹھاتے ہیں۔

یہ نعمتیں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہر حیوان کو عطا فرمائی ہیں، کسی کی کوئی تخصیص نہیں ہے، کسی کے لیے کوئی رکاوٹ اور پابندی نہیں ہے: ﴿كُلًّا نُّمِدُّ هَـٰٓؤُلَآءِ وَهَـٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ۚ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُورًا ﴿٢٠﴾﴾ [بنی اسرائیل]: **مسلمان ہو یا کافر، بلکہ** انسان ہو یا کوئی اور جان دار ہو، ہر ایک کو اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں اور کائنات کی چیزوں سے فائدہ پہنچایا جاتا ہے، کسی پر کوئی بندش نہیں ہے۔

انسان کے ساتھ مخصوص نعمتیں

کچھ نعمتیں وہ ہیں جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کو عطا فرمائیں: ایک مخصوص قسم

کا جسم اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کو عطا فرمایا، پھر اس میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے مختلف قسم کی صلاحیتیں عطا فرمائیں: دیکھنے کے لیے آنکھیں، سننے کے لیے کان، بولنے کے لیے زبان، سوچنے، سمجھنے اور یاد رکھنے کے لیے دل ودماغ عطا فرمایا، ہاتھ، پاؤں دیئے، مختلف قُویٰ اور صلاحیتیں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہر انسان کو عطا فرمائیں۔

انسان کو کم اور زیادہ ملنے والی نعمتیں

پھر اللہ تبارک وتعالیٰ کی بعض نعمتیں وہ ہیں جو بعض انسانوں کو زیادہ اور بعض کو کم دی گئی ہیں، بعض کو دیں اور بعض کو نہیں دی ہیں: دولت وثروت ہے جو بعض کے پاس زیادہ مقدار میں ہے، بعض کے پاس کم مقدار میں ہے۔ علم وعمل ہے، بعض کے پاس زیادہ ہے، بعض کے پاس کم ہے۔ صلاح اور تقویٰ ہے جو بعض کے پاس زیادہ ہے، بعض کے پاس کم ہے۔ عہدہ اور منصب ہے، بعض کے پاس ہے، بعض کے پاس نہیں ہے۔ ایسے ہی حسن وجمال ہے، یہ وہ نعمتیں ہیں جو کسی کے پاس ہیں، کسی کے پاس نہیں ہیں، بعض کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے زیادہ مقدار میں عطا فرمائی ہیں اور بعض کو کم مقدار میں عطا فرمائی ہیں۔

عطائی نعمتیں

کچھ نعمتیں وہ ہیں جو مخصوص طور پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے بندوں کو عطا فرمائیں، اللہ تبارک وتعالیٰ کی یہ جو مخصوص قسم کی نعمتیں ہیں، ان نعمتوں میں بھی بعض نعمتیں تو وہ ہیں جن کے متعلق ہر صاحبِ نعمت یہ سمجھتا ہے کہ اس نعمت کے حاصل ہونے

میں میری کسی کوشش اور سعی کا دخل نہیں، کسی محنت کو دخل نہیں ہے، مثال کے طور پر حسن اور جمال ہے، کوئی آدمی حسین وجمیل ہے، یہ بہت بڑی نعمت ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کو یہ نعمت عطا فرمائی تو وہ آدمی خود بھی سمجھتا ہے کہ یہ حسن وجمال والی نعمت جو اللہ تبارک وتعالیٰ مجھے عطا فرمائی ہے، اس کے حصول میں میری کسی کوشش اور سعی کا دخل نہیں، یہ نعمت اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے عطا فرمائی ہے۔

اسی طریقے سے حسنِ صوت ہے، اچھی آواز ہے، اس کے متعلق خود آپ بھی سوچیں گے کہ اس کے لیے آپ نے کوئی محنت نہیں کی، اللہ تبارک وتعالیٰ نے محض اپنے فضل سے عطا فرمائی۔

کوئی آدمی صاحبِ حسب ونسب ہے اور اس کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے خاندانی شرافت عطا فرمائی ہے تو ظاہر ہے کہ یہ ایسی نعمت ہے کہ جس کے حصول میں اس کی کسی سعی وعمل اور محنت کا دخل نہیں ہے، وہ تو پیدا ہوتے ہی یہ چیز لے کر کے آیا ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے فضل سے اس کو عطا فرمائی ہے۔

ظاہری کسبی نعمتیں

اور بعض نعمتیں وہ ہیں جن کے متعلق بعض لوگوں کو یہ خیال اور گمان ہوتا ہے کہ اس نعمت کے حصول میں میرے عمل کو، میری محنت اور سعی کو دخل ہے، جیسے کسی کے پاس دولت اور ثروت ہے: ایک تاجر ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے اسے دولت وثروت عطا فرمائی ہے، ملینیر ہے، ٹریلینیر ہے، لکھ پتی ہے، کروڑ پتی ہے، اب اس کو پوچھیں گے تو

وہ کہے گا کہ میں نے محنت سے ایک فیکٹری لگائی اور بہت خون پسینہ ایک کرنے کے بعد اور بڑی محنتوں کے بعد مجھے یہ دولت ملی ہے۔

اسی طرح کوئی عالم وفاضل ہے، وہ یوں سمجھتا ہے کہ میں نے بڑی محنت سے علم حاصل کیا ہے، عمل کے لیے میں نے بڑے مجاہدات کیے ہیں۔ اسی طرح کوئی بڑے عہدے اور منصب پر فائز ہے، وہ بھی یوں کہتا ہے کہ میں نے اس مقام اور مرتبے تک پہنچنے کے لیے اور یہ عہدہ اور منصب حاصل کرنے کے لیے بہت پاپڑ بیلے ہیں۔

دولت وثروت بھی اللہ تعالیٰ ہی کی عطا کردہ نعمت ہے

حالاں کہ اگر اس میں دیکھا جائے تو یہ بھی محض اللہ کا فضل ہے، آپ بازاروں کا مشاہدہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک ساتھ ایک ہی چیز کی کئی دوکانیں موجود ہیں، اس کو کہا جائے کہ ذرا اپنے اردگرد نظر دوڑا، اس دولت کو حاصل کرنے کے لیے جتنی محنت کرتا ہے، اتنی بلکہ اس سے زیادہ محنت کرنے والے تیرے درمیان میں موجود ہیں، تیری دوکان پر گاہکوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے اور دوسرا دوکان دار بے چارہ مکھیاں مارتا رہتا ہے جس کی وجہ سے اس کے پاس اتنی دولت نہیں ہے، آخر تیری دکان میں اتنے گاہکوں کو کون بھیجتا ہے؟۔

بے شک محنت آپ نے بھی کی ہے کہ آپ نے دکان لگائی، مال لائے لیکن آپ کی دوکان پر اس کثرت سے گاہکوں کا خریداری کے واسطے آنا، یہ تو آپ کے اختیار میں نہیں تھا، ان کو تو اللہ میاں نے بھیجا ہے، یہ گاہک خریدیں گے، تبھی تو آپ کی دوکان

چلے گی اور آپ اہلِ مال اور ثروت ہوں گے، معلوم ہوا کہ یہ دولت وثروت کی کثرت بھی محض اللہ تبارک وتعالیٰ کا فضل ہے۔

علم وفضل بھی اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمت ہے

یہی حال علم وفضل کا ہے کہ عالم یہ سمجھتا ہے: میں نے محنت کی، اس لیے علم حاصل ہوا تو وہ بھی ذرا اطراف وجوانب میں دیکھے کہ ایک ہی طرح کے دو طالبِ علم ہیں، ایک ہی درجے میں پڑھتے ہیں، دونوں رات رات بھر محنت کرتے ہیں لیکن ایک اول نمبر پر کامیاب ہوتا ہے اور ایک ناکام ہوتا ہے، اِس کو آ گیا، اُس کو نہیں آیا تو یہ کس نے دیا اور کس نے روک رکھا؟، دراصل یہ بھی اللہ تبارک وتعالیٰ ہی کی عطا ہے۔

عمل کی توفیق بھی اللہ تعالیٰ کا انعام ہے

اسی طرح اللہ تبارک وتعالیٰ نے کسی کو عمل کی توفیق دی، اطاعت اور فرماں برداری کی توفیق دی، یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ نے اگر ہمیں نماز پڑھنے کی توفیق اور سلیقہ عطا فرمایا ہے تو یہ بھی سمجھئے کہ یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل اور احسان ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَلَوْلَا فَضْلُ ٱللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُۥ مَا زَكَىٰ مِنكُم مِّنْ أَحَدٍ أَبَدًا وَلَٰكِنَّ ٱللَّهَ يُزَكِّي مَن يَشَآءُ﴾[النور۲۱] کیسا عجیب وغریب ارشاد ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت اگر تمھیں شامل حال نہ ہوتی تو ﴿مَا زَكَىٰ مِنكُم مِّنْ أَحَدٍ أَبَدًا﴾ عربی جاننے والے علماء یہاں موجود ہیں کہ نکرہ نفی کے ماتحت آیا ہے، اس لیے مطلب یہ ہے کہ تم میں سے کوئی آدمی نیک نہیں بن سکتا تھا۔

یہ قدم اٹھتے نہیں اٹھائے جاتے ہیں

اگر مسجد میں آئے ہیں، تہجد پڑھ رہے ہیں، نیکی کے کام کر رہے ہیں اور تعلیم و تعلم، درس و تدریس، وعظ و نصیحت، دعوت و تبلیغ، کسی بھی نیک کام میں لگے ہوئے ہیں، یہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا فضل ہے، اس میں ہمارا کوئی کمال نہیں ہے، ﴿وَلَوْلَا فَضْلُ ٱللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُۥ مَا زَكَىٰ مِنكُم مِّنْ أَحَدٍ أَبَدًا﴾ اگر اللہ تبارک و تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت تمھیں شاملِ حال نہ ہوتی تو کوئی بھی نیک نہیں بن سکتا تھا، ﴿وَلَٰكِنَّ ٱللَّهَ يُزَكِّي مَن يَشَآءُ﴾ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں، نیک بناتے ہیں، وہ جس کو توفیق دیں، وہ نیک بنتا ہے۔

شیطان کیوں گمراہ ہوا؟

یہ دو پیسے والے غریب کو جتنا حقیر سمجھتے ہیں، یہ دو رکعت پڑھنے والے نہ پڑھنے والوں کو اس سے زیادہ حقیر سمجھتے ہیں، دین داروں کے طبقے میں یہ چیز بہت زیادہ پائی جاتی ہے۔ اس غرّے میں نہ رہیں کہ میں کوئی بہت بڑا ہوں، نہیں، اگر اللہ تعالیٰ ابھی توفیق چھین لیں تو پتہ چل جائے گا۔ بڑے بڑوں کو دیکھا ہے ان کے مرتبے سے نیچے گرتے ہوئے، آخر ابلیس ''فرشتوں کا معلم'' قرار دیا گیا تھا، اس کے پاس علم و عمل کی کوئی کمی نہیں تھی، عبادت کی اس کے پاس کوئی کمی نہیں تھی، بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے سات لاکھ سال تک اللہ تعالیٰ کی عبادت کی!۔

تھوڑی سی عبادت بھی ہمیں غرور میں مبتلا کر دیتی ہے

اور ہمارا حال یہ ہے کہ اگر ایک رات اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے جاگ لیں تو

دوسرے دن صبح ہم اپنے آپ کو نبوت کے درجے پر فائز سمجھنے لگیں گے اور وحی کے لیے حضرت جبرئیل علیہ السلام کا انتظار کرنے لگیں گے کہ وہ ابھی ہمارے پاس وحی لے کر اتریں گے۔ اور شیطان اتنا بڑا عابد تھا؛ لیکن آخر وہ کیوں گرا؟ یہ توفیق اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا فضل ہے۔

اتنی نہ بیاں کر اپنی پاکئ داماں کی حکایت

اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿فَلَا تُزَكُّوٓاْ أَنفُسَكُمۡۖ هُوَ أَعۡلَمُ بِمَنِ ٱتَّقَىٰٓ ۝٣٢﴾ [النجم] قرآن میں باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ: اپنی پاکی مت بیان کرو:

اتنی نہ بیاں کر پاکئ داماں کی حکایت		دامن کو ذرا دیکھ، ذرا بند قبا دیکھ

یعنی اپنے حال پر نظر کرنی چاہیے، آدمی یہ نہ سوچے کہ میں بہت بڑا علاّمہ ہوں، بڑا نیک اور پارسا ہوں، میں دین کے بہت سارے کام انجام دے رہا ہوں بلکہ اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے کہ یا اللہ! میری تو کوئی حیثیت نہیں، میرا کوئی کمال نہیں، یہ تو تیرا فضل ہے، محض تو اپنے فضل سے مجھ سے یہ کام لے رہا ہے اور اگر آج ہی تو یہ توفیق مجھ سے چھین لے تو میں کہاں سے کہاں پہنچ سکتا ہوں۔ بہر حال! جن نعمتوں کے متعلق یہ خیال ہوتا ہے کہ اس میں آدمی کی محنت اور عمل کو دخل ہے، اس میں حقیقتِ حال یہی ہے۔ جیسے دولت وثروت کے متعلق ایسا ہی خیال ہوتا ہے۔

ایک بے وقوف کا قصہ

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مواعظ میں ایک واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ

ایک آدمی صحرا کے اندر اونٹ کے اوپر بوجھ لادے ہوئے جارہا تھا، اس کے ساتھ سفر میں ایک اور آدمی بھی ہو گیا، یہ دوسرا بڑا عالم تھا، جان کار اور سمجھ دار تھا، اس نے اونٹ والے سے پوچھا کہ یہ اونٹ پر تو نے دو بوریاں لاد رکھی ہیں، اس میں کیا ہے؟، اس نے جواب دیا کہ ایک بوری میں گیہوں ہیں اور دوسرے میں ریت بھرا ہوا ہے، اس عالم نے کہا کہ ریت کی کیا ضرورت ہے؟ آخر یہ صحرا ہے، ریت ہی ریت ہے، جتنی چاہے، جہاں چاہے لے جاؤ، آخر اس اونٹ پر لاد کر کیوں لے جارہا ہے؟ تو اس نے جواب دیا کہ بیلنس برابر کرنے کے لیے ایسا کیا ہے کہ گیہوں کی ایک ہی بوری ہے، اس کو ایک طرف رکھتا ہوں تو دوسری طرف کچھ نہ ہونے کی وجہ سے توازن اور بیلنس باقی نہیں رہے گا، دوسری طرف کچھ ہوگا تو بیلنس برابر رہے گا۔

اس عالم نے کہا کہ اللہ کے بندے! بیلنس قائم رکھنے کے لیے آخر تجھ کو یہی سوجھی! اسی گیہوں کے دو حصے کر کے دو بوریاں کر دیتا اور آدھی اِدھر رکھ دیتا اور آدھی اُدھر رکھ دیتا تو بھی بیلنس قائم ہو جاتا، اونٹ کا بوجھ بھی کم ہو جاتا اور سفر بھی آسانی کے ساتھ کٹ جاتا۔ اس نے کہا کہ بات تو تمھاری بالکل صحیح ہے، چناں چہ اس نے گیہوں کی بوری اتاری اور دوسری بوری سے ریت خالی کر کے آدھے گیہوں اس میں رکھ دئے۔

اب یہ اونٹ والا اپنے جی میں یہ سوچ رہا ہے کہ اس نے مجھے اتنا اچھا مشورہ دیا اور ماشاء اللہ! اس کو اتنی اچھی سمجھ ہے تو اس کے پاس تو بہت کچھ ہوگا، مجھ جیسے ناسمجھ کے پاس جب اتنا مال ہے: گائیں ہیں، بکریاں ہیں، اونٹ ہیں، کھیتی باڑی ہے، اس لیے اس نے اس عالم سے پوچھا کہ بھائی! آپ کے پاس کتنے اونٹ ہیں؟ تو اس نے

جواب دیا کہ ایک بھی اونٹ نہیں ہے، پھر پوچھا کہ آپ کے پاس کتنی گائیں ہیں؟ تو کہا کہ ایک بھی گائے نہیں ہے، پھر پوچھا کہ آپ کے پاس کتنی بکریاں ہیں؟ تو کہا کہ ایک بھی بکری نہیں ہے۔ کتنی زمین ہے؟ تو کہا کہ کچھ بھی نہیں ہے۔ اس نے کہا کہ تو بڑا منحوس آدمی ہے، اگر میں تیری بات پر عمل کروں گا تو میں بھی تیرے جیسا بن جاؤں گا، چناں چہ ریت والی بوری میں ڈالے ہوئے گیہوں بھی واپس نکال لیے اور اس میں دوبارہ ریت بھر کر اسی طرح اونٹ کا بیلنس قائم کیا اور آگے روانہ ہوگیا۔

اگر روزی کا مدار عقل پر ہوتا

حضرت شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: اگر روزی کا مدار عقل پر ہوتا تو بے وقوف سے زیادہ بھوکا مرنے والا کوئی نہ ہوتا لیکن جو بڑے بڑے ذی علم اور اونچی اونچی ڈگری والے ہیں، وہ ایسے مال داروں کے یہاں ملازمت کرتے نظر آتے ہیں کہ جن کی کوئی تعلیم نہیں ہوتی۔

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ دولت کے متعلق آدمی یہ سوچتا ہے کہ میں اس کو اپنی محنت اور کوشش سے حاصل کرتا ہوں، یہ صحیح نہیں ہے، اس لیے حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جو یہ نعمتیں ہیں، وہ نعمتیں جس کے پاس بھی ہیں، ان نعمتوں کے متعلق یہ بات طے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے وہ نعمتیں عطا فرمائی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی نعمتیں بندوں کی مصلحتوں کے مطابق تقسیم ہوتی

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی حکمتوں سے یہ نعمتیں اپنے بندوں میں تقسیم کی، جس کے

لیے جو مناسب تھا، عطا فرمایا، ایسا نہیں ہے کہ جس کو نہیں ملا تو -نعوذ باللہ- اللہ تبارک وتعالیٰ کے خزانے میں کوئی کمی ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ تو فرماتے ہیں: ﴿وَإِن مِّن شَيۡءٍ إِلَّا عِندَنَا خَزَآئِنُهُۥ﴾ [الحجر۲۱] کہ: ہمارے یہاں ہر چیز کے خزانے موجود ہیں، ساری دنیا کے ہر ہر انسان کو اللہ تبارک وتعالیٰ اس کی خواہش کے مطابق سب کچھ عطا فرما دیتے تو بھی اللہ تعالیٰ کے خزانے میں کوئی کمی نہیں آتی لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی حکمتوں سے ان نعمتوں کو اپنے بندوں کے درمیان ان کی مصلحتوں کے مطابق تقسیم فرمایا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا کسی کو نعمت دینا اور کسی کو نہ دینا آزمائش کے لیے ہوتا ہے

کیوں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس دنیا کو آزمائش کے لیے پیدا فرمایا ہے، چناں چہ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿ٱلَّذِي خَلَقَ ٱلۡمَوۡتَ وَٱلۡحَيَوٰةَ لِيَبۡلُوَكُمۡ أَيُّكُمۡ أَحۡسَنُ عَمَلٗاۚ﴾ [الملك۲] کہ: یہ زندگی اور موت لوگوں کی آزمائش کے لیے ہے کہ کون اچھے اعمال کرتا ہے۔ اس آزمائش کے خاطر اللہ تبارک وتعالیٰ کسی کو دیتے ہیں اور کسی کو نہیں دیتے۔

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ گلستاں میں فرماتے ہیں:

پدر را عسل بسیار است، لیکن پسر گرمی دار ست

کہ باپ کے پاس شہد تو بہت ہے لیکن بیٹے کے مزاج میں گرمی ہے، اس لیے شہد کثرت سے ہونے کے باوجود باپ بیٹے کو شہد کھانے کے لیے نہیں دیتا۔

ہم کو دولت نہیں ملی تو اسی میں اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے، پتہ نہیں! ملتی تو کیا ہوتا، اللہ تعالیٰ نے اپنی یہ نعمتیں اپنی خاص حکمتوں کے ساتھ بندوں میں تقسیم فرمائی ہیں۔

نعمتوں کے اعتبار سے لوگوں کی دو قسمیں

لیکن اللہ تعالیٰ کی ان مختلف نعمتوں کے ملنے کے بعد لوگوں کے قلوب میں مختلف کیفیات پیدا ہوتی ہیں، اس اعتبار سے بندوں کے دو گروہ ہیں، دو جماعت ہیں: ایک جماعت تو وہ ہے جس کے پاس یہ نعمت ہے: دولت وثروت کی نعمت جس کے پاس ہے، عہدہ اور منصب کی نعمت جس کے پاس ہے، علم وعمل کی نعمت جس کے پاس ہے، صلاح وتقویٰ ہے۔

اور دوسرے وہ لوگ ہیں جن کے پاس یہ چیزیں نہیں ہیں: دولت وثروت نہیں ہے، علم وعمل نہیں ہے، عہدہ اور منصب نہیں ہے، صلاح وتقویٰ نہیں ہے۔

یہ دونوں ہی گروہ آزمائش میں مبتلا ہیں، جن کے پاس یہ نعمتیں ہیں، وہ بھی آزمائش میں مبتلا ہیں اور جن کے پاس یہ نعمتیں نہیں ہیں، وہ بھی آزمائش میں مبتلا ہیں۔

نعمت والے کا دوسروں کو حقیر سمجھنا

نعمت والا اگر یہ سوچتا کہ یہ نعمت تو محض اللہ تعالیٰ کا فضل ہے تو جس کے پاس وہ نعمت نہیں ہے، اس کے متعلق اس کے دل میں کوئی برا خیال نہ آتا لیکن ایسا نہیں ہوتا، دولت والا جب دوسرے آدمی کو دیکھتا ہے کہ جس کے پاس دولت نہیں ہے، وہ مفلوک الحال ہے، غریب ہے، مسکین ہے تو اس کی غربت اور مسکنت کی وجہ سے اور جیسی دولت اللہ تعالیٰ نے اس کو دے رکھی ہے، ویسی دولت اس کے پاس نہ ہونے کی وجہ سے اس کو وہ حقیر سمجھتا ہے، اس کے متعلق اس کے دل میں حقارت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

ایک آدمی عالم ہے، علم کے بہت اونچے مقام پر فائز ہے اور دوسرا بے چارہ علم پڑھا ہوا نہیں ہے تو جس کے پاس علم کی دولت ہے، اس کے دل میں بے پڑھے ہوئے اور جاہل کے متعلق تحقیر کا جذبہ آتا ہے کہ اس کی میرے سامنے کیا وقعت اور حیثیت ہے۔

ایک صاحبِ حسن و جمال ہے، حالاں کہ اس کی اس نعمت کے متعلق خود اس کا بھی یہ خیال ہے کہ یہ نعمت میری اپنی محنت اور کوشش سے حاصل نہیں ہوئی ہے، پھر بھی اس کے مقابلے میں کوئی کم حسین وجمیل ہے تو اس کو وہ حقیر سمجھتا ہے۔

عام طور پر لوگوں کا ایک ایسا مزاج بنا ہوا ہے کہ ایک نعمت جو اپنے پاس ہے، وہ دوسرے کے پاس نہیں ہوتی تو اس کے متعلق دل میں حقارت کا جذبہ آتا ہے۔

عدیم النعمت کا صاحبِ نعمت سے حسد کرنا

اور اُدھر جو دوسری جماعت ہے، اپوزیشن پارٹی، جس کے پاس یہ نعمتیں نہیں ہیں، جس کے پاس دولت وثروت نہیں ہے، وہ اپنے دل میں دولت اور ثروت والے کے متعلق حسد کا جذبہ رکھتا ہے کہ یہ نعمت اس کے پاس سے چھین جائے۔

جس کے پاس علم وعمل کی نعمت نہیں ہے تو اس کے دل میں عالم کے متعلق حسد کا جذبہ ہے کہ اس کو اتنا علم کہاں سے مل گیا، یہ بھی آزمائش کے اندر مبتلا ہے۔

دونوں گروہ گنہگار ہیں

یہ دونوں ہی گروہ گنہگار ہیں، یہ حقارت کا جذبہ اپنے دل کے اندر رکھنے کی وجہ سے گنہگار ہے اور یہ حسد کے جذبے کی وجہ سے گنہگار ہوا، شریعت نہ تو اِس کی اجازت دیتی

ہے، نہ اُس کی اجازت دیتی ہے۔

ایک مسلمان دوسرے مسلمان پر ظلم وزیادتی نہیں کرتا

نبیٔ کریم ﷺ کا ارشاد جو ابھی میں نے آپ کے سامنے پڑھا: اَلْمُسْلِمُ أَخُو الْمُسْلِمِ: ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، لَا يَظْلِمُهُ وَلَا يَخْذُلُهُ، وَلَا يَحْقِرُهُ کہ: وہ اس کی نہ حق تلفی کرتا ہے، نہ اس کے ساتھ ظلم وزیادتی کا معاملہ کرتا ہے اور نہ اس کو بے یار ومددگار چھوڑتا ہے۔

بھائی! ایک مسلمان ہمارے سامنے تکلیف میں مبتلا ہے، کوئی اس پر ظلم وزیادتی کر رہا ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کو طاقت اور قوت دی ہے، آپ اس مصیبت میں اس کی مدد کر سکتے ہیں تو آپ کے لیے اس کو یوں ہی بے یار ومددگار چھوڑنا جائز نہیں ہے، اس کی مدد آپ کے ذمہ ضروری ہے۔

کسی ظاہری شکل وصورت کا نام تقویٰ نہیں

وَلَا يَحْقِرُهُ: اور اس کو حقیر بھی نہیں سمجھتا، حقارت سے نبیٔ کریم ﷺ نے منع فرمایا۔

آگے فرماتے ہیں: التَّقْوَى هَاهُنَا، وَيُشِيرُ إِلَى صَدْرِهِ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ، كُلُّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ حَرَامٌ، دَمُهُ، وَمَالُهُ، وَعِرْضُهُ: یہ فرما کر نبیٔ کریم ﷺ نے اپنے دست مبارک سے اپنے سینے کی طرف اشارہ فرمایا کہ: تقویٰ یہاں ہے، تین مرتبہ یہ ارشاد فرمایا۔

تقویٰ دل میں ہوتا ہے، کسی ظاہری شکل وصورت کا نام تقویٰ نہیں ہے، اللہ تعالیٰ

جانتے ہیں کہ کون متقی ہے، ﴿هُوَ أَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقَىٰ ﴿٣٢﴾﴾[النجم]، ﴿إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ﴾، اللہ تبارک وتعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ باعزت وہ ہے، جس کے دل میں تقویٰ ہو، کس کے دل میں کیا ہے؟، ہم اور آپ اس کو نہیں جانتے، ظاہری صورتوں سے فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔

حضرت زاہر رضی اللہ عنہ کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تعلق

شمائلِ ترمذی میں ایک واقعہ ہے، ایک صحابی تھے حضرت زاہر رضی اللہ عنہ، دیہات کے رہنے والے تھے، وہ بدصورت تھے، حسین وجمیل نہیں تھے، دیہات سے مدینۂ منورہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضری دیتے تھے، جب وہ آتے تھے تو نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے ساتھ ظرافت اور دل لگی کا معاملہ کیا کرتے تھے۔

جب وہ دیہات سے آتے تو دیہات کی جو چیزیں شہر میں عام طور پر نہیں ملتیں: دودھ، چھاچھ، گھی، سبزی، ترکاری وغیرہ، وہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے ہدیے کے طور پر لے آتے تھے اور جب واپس جاتے تھے تو شہر کی چیزیں جن کی دیہات والوں کو ضرورت ہوتی، نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کو خرید کر دیا کرتے تھے۔

زاہر ہمارا دیہات ہے اور ہم ان کا شہر ہیں

نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرمایا کرتے تھے: إِنَّ زَاهِرًا بَادِيَتُنَا وَنَحْنُ حَاضِرُوهُ کہ زاہر ہمارا دیہات ہے اور ہم ان کا شہر ہیں یعنی دیہات کے رہنے والے کو شہر کی جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے، ہم وہ پورا کرتے ہیں اور ایک شہر کے رہنے والے کو دیہات کی جن

چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے، وہ یہ پورا کرتے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حضرت زاہر رضی اللہ عنہ کے ساتھ ظرافت

ایک مرتبہ دیہات سے کچھ چیزیں بیچنے کے لیے لائے تھے، وہ بیچ رہے تھے کہ نبئ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پیچھے سے آ کران کی ''کولی'' بھرلی- آپ پیچھے سے جا کر جس طرح دوستوں کو پکڑتے ہیں نا- اوران کی آنکھیں بند کردیں۔اب یہ ''کون ہیں؟ چھوڑو! کون ہیں، چھوڑو!'' کہہ رہے ہیں۔ یہ منظر سب لوگ دیکھ رہے ہیں۔اتنے میں انھوں نے محسوس کیا کہ نبئ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، پھرتو انھوں نے اپنی پیٹھ کو نبئ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سینۂ مبارک کے ساتھ اور بھی زیادہ چپکانے کی کوشش کی، نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: مَنْ يَشْتَرِي هَذَا الْعَبْدَ؟: کون ہے جو اس غلام کو مجھ سے خریدے؟۔

حضرت زاہر رضی اللہ عنہ کو غلام کہنے کی ایک وجہ

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مزاح فرمارہے ہیں، سوال یہ ہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانِ مبارک پر خلافِ واقعہ کوئی بات آتی نہیں تھی، آپ ان کو غلام فرمارہے ہیں، حالاں کہ یہ تو آزاد تھے؟ اس کا جواب دیتے ہوئے شراحِ حدیث نے لکھا ہے کہ وہ مال کو اور اپنے سامان کو بیچنے میں ایسے مشغول تھے کہ اس مشغولی کی وجہ سے اس وقت ان کا دل ذکر اللہ سے غافل تھا اور دنیا کی طرف متوجہ تھا، گویا انھوں نے مال کو بیچنے کی مشغولی میں اپنے آپ کو دنیا کا غلام بنارکھا تھا؛ اس لیے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو غلام قرار دیا[1]۔

---

(۱) منتهى السؤل على وسائل الوصول إلى شمائل الرسول ﷺ، ۲/ ۵۵۹.

اوراسی وجہ سے حضور ﷺ نے کولی بھری کہ آپ ﷺ کے ساتھ ملابست کی وجہ سے وہ غفلت بھی دور ہو جاوے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں تم کم قیمت نہیں ہو

جب آپ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا کہ کون ہے جو اس غلام کو مجھ سے خریدے؟ تو اس کے جواب میں انھوں نے کہا: يَا رَسُولَ اللَّهِ إِذًا وَاللَّهِ تَجِدُنِي كَاسِدًا: اے اللہ کے رسول! اگر آپ بہ حیثیت غلام کے مجھ کو بیچیں گے تو چوں کہ میں تو بڑا بد صورت آدمی ہوں؛ اس لیے بہت کم قیمت آئے گی، اس پر نبیٔ کریم ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا: لَكِنْ عِنْدَ اللَّهِ لَسْتَ بِكَاسِدٍ: لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں تم کم قیمت نہیں ہو، تم اللہ تعالیٰ کے یہاں بہت بیش قیمت ہو[1]۔

اس لیے کسی کی ظاہری شکل وصورت دیکھ کر فیصلہ کبھی مت کرنا، کسی کے متعلق یہ مت کہنا ہے کہ یہ متقی نہیں ہے، گنہگار ہے، ہم اس کے دل کے متعلق نہیں جانتے، پتہ نہیں، اس کا کون سا عمل اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول ہے، ہم اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔

کسی مخلوق کو حقیر سمجھنا اللہ تعالیٰ کی خلقت پر اعتراض کرنا ہے

علامہ عبد الرؤف مناوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے کسی کو حقیر مت سمجھو، جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کو پیدا فرمایا تو پیدائش کے وقت اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی توجہ، اپنا التفات اس کی طرف مبذول فرمایا، یعنی اللہ تعالیٰ نے اس کی

(١) الشمائل للترمذی، عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رضی اللہ عنہ، بَابُ مَا جَاءَ فِي صِفَةِ مِزَاحِ رَسُولِ اللهِ ﷺ.

طرف توجہ فرمائی، تب تو وہ وجود میں آیا، اگر اللہ تعالیٰ اس کی طرف توجہ نہ فرماتے تو وجود میں کہاں آتا، گویا وہ اس قابل تھا کہ اللہ تعالیٰ کی توجہ اس کی طرف مبذول ہوتی، اس سے زیادہ اور کیا چاہیے، اگر تم اللہ تعالیٰ کی کسی مخلوق کو حقیر سمجھتے ہو تو گویا تم اپنی زبانِ حال سے یوں کہنا چاہتے ہو کہ -نعوذ باللہ- اللہ تعالیٰ نے اس کو حقیر اور خراب پیدا کیا ہے، یہ تو اللہ تعالیٰ کی خلقت پر اعتراض ہے، علامہ مناوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ بہت خطرناک خیال ہے۔ ایک آدمی کوئی چیز بنا رہا ہے، ہم اس سے کہیں کہ آپ نے یہ کیا چیز بنائی! تو وہ اس کو اپنی توہین سمجھتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے متعلق اپنے دل میں تحقیر کا جذبہ رکھنا بہت زیادہ خطرناک ہے، اس لیے شریعت نے اس کی اجازت نہیں دی۔

مسلمان بھائی کو حقیر سمجھنا آدمی کی برائی کے لیے کافی ہے

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: بِحَسْبِ امْرِئٍ مِنَ الشَّرِّ أَنْ يَحْقِرَ أَخَاهُ الْمُسْلِمَ: ایک آدمی کی برائی کے لیے اتنا کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے۔ آج کل یہ بیماری بہت عام ہوگئی ہے، کسی کے پاس دو پیسے آ گئے تو دوسروں کو حقیر سمجھتا ہے، کسی کو علم کے دو بول آ گئے تو دوسروں کو حقیر سمجھتا ہے، دین کے کام میں لگ گیا، اللہ تعالیٰ نے توفیق دے دی تو دوسروں کو حقیر سمجھتا ہے۔ لکھا ہے کہ نہ تو اس کی دنیوی مفلوک الحالی کی وجہ سے اس کو حقیر سمجھو اور نہ دینی بدحالی کی وجہ سے اس کو حقیر سمجھو۔

حضرت عیسیٰ اور حواریین کا ایک سبق آموز سوال وجواب

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایک مرتبہ اپنے حواریین سے کہا کہ بتلاؤ: تمہارا کوئی بھائی

سورہا ہوا اور ہوا اس کا کپڑا اُڑا دے تو تم اس کو ڈھانپ دو گے یا ننگا کر دو گے؟۔

انھوں نے کہا کہ ہم تو اس کے کپڑے کو ڈھانپ دیں گے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ نہیں، تم تو اس کو زیادہ ننگا کرتے ہو۔ انھوں نے عرض کیا: اے اللہ کے نبی! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ سبحان اللہ ہم ایسا نہیں کر سکتے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ تم ایسا کرتے ہو۔ تمہارے بھائی کی جب کوئی بات تمہارے پاس آتی ہے تو تم بڑھا چڑھا کر لوگوں کے سامنے اس کو پیش کرتے ہو۔ یہ اس کو ننگا کرنا نہیں تو اور کیا ہے؟ اور زیادہ تم اس کو بدنام کرتے ہو، رُسوا کرنے کی کوشش کرتے ہو [1]۔ یہ بہت خطرناک چیز ہے۔ شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔

حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کا حکیمانہ جملہ

حضرت حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ہمیشہ فرمایا کرتے تھے کہ میں ہر مسلمان کو ''فی الحال'' اپنے سے بہتر سمجھتا ہوں اور کافر کو ''فی المآل'' (آئندہ کے اعتبار سے) اپنے سے بہتر سمجھتا ہوں، اس لیے کہ پتہ نہیں کہ اس کی اندرونی کیفیت کیا ہے، اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کا معاملہ کیا ہے؟۔ بہت سی مرتبہ آدمی ظاہری حال ایسا ہی نظر آتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کا معاملہ بڑا اونچا ہوتا ہے

کسی کی تحقیر کا برا انجام

''طبقات ابن سعد'' میں واقعہ ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر عرفات میں جب

---

(۱) إحياء علوم الدين ٢/ ١٧٨، كِتَابُ آدَابِ الْأُلْفَةِ وَالْأُخُوَّةِ إلخ.

سورج غروب ہوا اور وہاں سے مزدلفہ کی طرف چلنے کا وقت آیا، نبیٔ کریم ﷺ اپنے اونٹ پر سوار روانگی کے لیے تیار ہیں لیکن ایسا محسوس ہوتا تھا کہ آپ کسی کا انتظار فرما رہے ہیں، جانے کا وقت ہو گیا ہے لیکن آپ ﷺ جانے کے لیے تیار نظر نہیں آتے، اس وقت نبیٔ کریم ﷺ کے پاس یمن کے اونچے گھرانے، شاہی گھرانے کے کچھ لوگ کھڑے تھے، وہ سوچنے لگے کہ نبیٔ کریم ﷺ کس کا انتظار کر رہے ہیں؟۔

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے حضور ﷺ کا لگاؤ

اتنے میں حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما جو حضور ﷺ کے بہت لاڈلے تھے، یہ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے بیٹے ہیں جو حضور کے آزاد کردہ غلام تھے، حضور ﷺ نے ان کو اپنا منہ بولا بیٹا بنایا تھا، وہ چوں کہ حضور ﷺ کے بڑے لاڈلے تھے تو ان کے صاحب زادے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ بھی حضور کے بڑے لاڈلے تھے، ''حِبُّ الرسول'' ان کا لقب تھا: رسول اللہ ﷺ کے لاڈلے، چہیتے اور عام طور پر حضور ﷺ اپنی سواری پر ان ہی کو اپنے پیچھے بٹھاتے تھے۔

حجۃ الوداع کے موقع پر جب عرفات سے مزدلفہ کی طرف چلنے کا وقت آیا تو لوگوں نے دیکھا کہ حضور ﷺ انتظار کر رہے ہیں۔ اس وقت حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ قضائے حاجت کے لیے گئے تھے، وہ فارغ ہو کر حضور ﷺ کے پاس آئے، یہ یمن کے شاہی گھرانے کے لوگ ان کو پہچانتے نہیں تھے، بہر حال! جب وہ آئے تو حضور ﷺ نے ان کو اپنے پیچھے بٹھایا اور روانہ ہو گئے۔

اہلِ یمن کے فتنۂ ارتداد میں مبتلا ہونے کی وجہ

یہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ بالکل چھریرے بدن کے تھے، ناک چپٹی، سیاہ فام یعنی سانولے رنگ کے تھے، چہرہ پر بھی کوئی حسن نہیں تھا، دیکھنے میں حسین نہیں تھے، ان کو دیکھ کر یمن کے شاہی گھرانے کے لوگ کہنے لگے کہ اچھا! ان کی وجہ سے ہم کو رکنا پڑا! ان کے دل میں تحقیر آئی۔

اس واقعے کو حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے صاحبِ طبقات نے نقل کیا ہے، اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد صاحبِ طبقات نے حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کا جملہ نقل کیا ہے: فَلِذَلِكَ كَفَرَ أَهْلُ الْيَمَنِ مِنْ أَجْلِ ذَا: اہل یمن اپنے اسی جملے کی وجہ سے ارتداد کی آزمائش میں مبتلا ہوئے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد ارتداد پھیلا، بہت سے لوگ مرتد ہو گئے، تو فرماتے ہیں کہ یمن کے یہ قبیلے جو ارتداد میں مبتلا ہوئے، ان کے اس جملے کی وجہ سے مبتلا ہوئے۔ (یعنی انھوں نے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہما کو دیکھ کر جب کہا تھا: ''اچھا! ان کی وجہ سے ہم کو رکنا پڑا'' اس جملے کی نحوست کی وجہ سے ان کو ارتداد کے فتنے میں مبتلا ہونے کی نوبت آئی۔) صاحبِ طبقات کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کا یہ جملہ اپنے استاذ یزید بن ہارون — جو بہت بڑے محدث ہیں — کے سامنے بیان کیا اور حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے اس جملے کا مطلب پوچھا تو انھوں نے اس کا یہی مطلب مجھ سے بیان فرمایا، معلوم ہوا کہ کسی کو حقیر سمجھنے کی وجہ سے انسان کو ایسے فتنوں میں بھی

مبتلا ہونا پڑتا ہے[۱]۔

کسی کی تحقیر کا خیال اپنے دل میں لانا بڑی خطرناک چیز ہے، یاد رکھنا! کسی کی تحقیر اللہ تعالیٰ معاف نہیں فرماتے، چوں کہ دین داروں کا بھی طبقہ ہے اور مال داروں کا بھی طبقہ ہے، دونوں ہی کے لیے یہ چیز آزمائش ہے۔

بدکاری سے نفرت کیجیے، بدکار سے نہیں

یہ تحقیر تو دنیوی اعتبار سے تھی، اگر تحقیر دینی اعتبار سے ہو، مثلا کوئی شخص شرابی کبابی ہے اور ہم پابندی کے ساتھ پہلی صف میں نماز پڑھتے ہیں تو شریعت ہمیں اس کی اجازت نہیں دیتی کہ اس شرابی کبابی کو اس کی بدعملی کی وجہ سے ہم حقیر سمجھیں، اس کی اس بدعملی سے تو ہمیں نفرت کرنی ہے لیکن اس کی ذات سے نفرت کرنے کی شریعت ہمیں اجازت نہیں دیتی۔

ہم یہ نہ سمجھیں کہ ہم ہمیشہ پہلی صف میں نماز پڑھتے ہیں، تہجد پڑھتے ہیں، اوابین، چاشت اور اشراق پڑھتے ہیں اور یہ تو پانچوں نمازوں میں سے کسی نماز کے لیے نہیں آتا اور شراب پیتا ہے۔

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کی نصیحت

اگر کسی کو کسی گناہ کے اندر مبتلا دیکھو تو اس گناہ کی وجہ سے اس کو کم وقعت مت سمجھو، حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: اس کو گناہ کے اندر مبتلا دیکھ کر اپنے آپ کو قصوروار

---

۱ الطبقات الكبرى لابن سعد، ٤/ ٦٣، أُسَامَةُ الْحِبُّ بْنُ زَيْدِ بْنِ حَارِثَةَ.

سمجھو کہ میں نے اللہ تعالیٰ کے اس بندے کو گناہ سے نکالنے اور نیکی کی راہ پر لانے کے لیے کیا محنتیں کی؟ جب میں نے کچھ نہیں کیا تو مجھے کیا حق پہنچتا ہے کہ اس کے گناہ میں مبتلا ہونے کی وجہ سے میں اس کی حقارت کو اپنے دل کے اندر لاؤں تو دینی کمزوری کی وجہ سے بھی شریعت کسی کو حقیر اور بے وقعت سمجھنے کی اجازت نہیں دیتی۔

واقعۂ افک میں مبتلا ہونے والوں کے متعلق بلیغ تاکید

جب اِفک کا واقعہ پیش آیا تھا، اس موقع پر جو آیتیں نازل کی گئی تھیں، ان میں سے ایک آیت یہ بھی تھی: ﴿وَلَوْلَا فَضْلُ ٱللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُۥ مَا زَكَىٰ مِنكُم مِّنْ أَحَدٍ أَبَدًا وَلَٰكِنَّ ٱللَّهَ يُزَكِّي مَن يَشَآءُ﴾ [النور۲۱] کہ: جو لوگ منافقین کی ریشہ دوانیوں اور غلط پروپیگنڈے کی وجہ سے اس واقعے میں مبتلا ہو گئے تھے اور انھوں نے بھی اس میں حصہ لیا اور ان پر حد بھی جاری کی گئی، ان کے متعلق اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ لوگ اس گناہ میں پھنس گئے اور تمھاری اللہ تعالیٰ نے حفاظت فرمائی، تو اس کی وجہ سے اترائیو مت، غرور میں مت آنا، ﴿وَلَوْلَا فَضْلُ ٱللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُۥ﴾ اگر اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت تمھیں شاملِ حال نہ ہوتی، ﴿مَا زَكَىٰ مِنكُم مِّنْ أَحَدٍ أَبَدًا﴾: تم میں سے کوئی کبھی بھی نیک بن نہیں سکتا تھا، گناہ سے اپنے آپ کو بچا نہیں سکتا تھا۔

کتنی بڑی تاکید ہے، اہلِ علم جانتے ہیں کہ نکرہ نفی کے ماتحت ہے اور پھر اس کو أَبَدًا کے ذریعہ مؤکد کر دیا گیا یعنی تم میں سے کوئی ایک بھی کبھی بھی نیک نہیں بن سکتا تھا، ﴿وَلَٰكِنَّ ٱللَّهَ يُزَكِّي مَن يَشَآءُ﴾: اللہ جسے چاہیں، اسی کو نیک کام کرنے کی توفیق ملتی

ہے، میں اور آپ اگر نماز پڑھتے ہیں، قرآن کی تلاوت کرتے ہیں تو اس پر اترانے کی ضرورت نہیں ہے، اللہ نے توفیق دی تو ہم نے نماز پڑھ لی۔

کسی گناہ پر دوسرے کو عار دلانے کی سزا

ترمذی شریف کی روایت ہے، نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: مَنْ عَيَّرَ أَخَاهُ بِذَنْبٍ لَمْ يَمُتْ حَتَّى يَعْمَلَهُ کہ کوئی آدمی اگر اپنے کسی بھائی کو کسی گناہ کی بات پر عار و شرم دلائے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قسم کھا کر فرماتے ہیں کہ وہ مرے گا نہیں جب تک کہ وہ اس بُرائی میں مبتلا نہیں ہوگا[۱]۔

اپنی زبان کو قابو میں رکھنے کی عادت بنائیے

آج کل ہم لوگوں کو بولنے پر بھی قابو نہیں، آدمی عام طور پر اپنی زبان اور کام کی وجہ سے آزمائشوں میں پڑتا ہے۔ دوسرے کا بچہ غلط راستے پر پڑتا ہے تو کہتے ہیں کہ تیرا لڑکا بگڑ گیا یعنی اسے حقیر سمجھتے ہیں۔

ایک تو ہے ہمدردی، جیسے کوئی بیمار ہو جائے تو اس کی بیماری کو دیکھ کر دل میں ایک ہمدردی ہوتی ہے کہ وہ بیمار ہے اور اس کے لیے دعا کرے، یہ صحیح ہے اور اگر اس کو حقیر سمجھتے ہوئے یہ جملے بولیں گے تو پھر مصیبت آئے گی۔ ہم پر جو آفات و حالات آتے ہیں اس کی ایک بڑی وجہ ہماری زبان بھی ہے۔

ایک مؤمن کی اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں بہت ہی زیادہ عظمت اور قدر و قیمت

---

(۱) سنن الترمذی، عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ رضی اللہ عنہ، أَبْوَابُ صِفَةِ الْقِيَامَةِ، ر: ۲۵۰۵۔

ہے، کسی حال میں ہم اس کے اوپر حملہ نہیں کر سکتے، اس کو نشانہ نہیں بنا سکتے۔

اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک مؤمن کا مرتبہ کعبۃ اللہ سے بھی بلند ہے

ابن ماجہ میں حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی روایت ہے، فرماتے ہیں: میں نے دیکھا کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کعبۃ اللہ کا طواف کررہے ہیں اور کعبہ کا طواف کرتے ہوئے اس کو خطاب کر کے فرمارہے ہیں: مَا أَطْيَبَكِ وَأَطْيَبَ رِيحَكِ، مَا أَعْظَمَكِ وَأَعْظَمَ حُرْمَتَكِ، وَالَّذِی نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ! لَحُرْمَةُ الْمُؤْمِنِ أَعْظَمُ عِنْدَ اللّٰهِ حُرْمَةً مِنْكِ مَالِهِ وَدَمِهِ وَأَنْ نَظُنَّ بِهِ إِلاَّ خَيْرًا: اے کعبہ! تو کیسا پاکیزہ ہے اور کیسی پاکیزہ ہے تیری خوشبو اور تو کیسا عظمت والا ہے اور کیسا عظمت والا ہے تیرا درجہ، لیکن قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضے میں محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی جان ہے کہ ایک مؤمن کی عظمت اور بڑائی اللہ تعالیٰ کی نگاہوں میں تجھ سے بڑھ کر ہے، اس کی جان کی بھی، اس کے مال کی بھی اور اس کی عزت اور آبرو کی بھی[۱]۔

دل میں کسی کے متعلق حقارت کا جذبہ آنے پر فوراً توبہ کر لیجیے

اللہ تعالیٰ کے یہاں ایک مؤمن کا مقام بہت اونچا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ: کسی بھی مؤمن کو حقیر سمجھنا آدمی کی برائی کے لیے کافی ہے، اس لیے خدانخواستہ اگر ایسا خیال کسی کے دل میں غیر اختیاری طور پر آجاوے تو فوراً اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کر کے توبہ کرو، استغفار کرو، ورنہ پتہ نہیں، کیسی کیسی آزمائشوں میں مبتلا ہونے کی نوبت

---

(۱) سنن ابن ماجة، باب حرمة دم المؤمن وماله، ر:۳۹۳۲.

آسکتی ہے۔

ہمیشہ اپنی ذات کا محاسبہ کرتے رہیے

بہت سی مرتبہ کسی آدمی کی زندگی کا بہت سا وقت ایسے گناہوں میں گذر جاتا ہے پھر اللہ تعالیٰ ہدایت دیتے ہیں اور دین کے کام میں لگ جاتا ہے تو اس کی وجہ سے کبھی اس کے دل میں دوسروں کے متعلق تحقیر کے جذبات آجاتے ہیں، اس سے اپنے آپ کو بہت زیادہ بچانے کی ضرورت ہے، ہمیشہ اپنے آپ کا محاسبہ کرتے رہو کہ میرے دل میں کسی کے متعلق حقارت کا جذبہ تو نہیں ہے۔

نیکی کی راہ پر چلنے والا جو طبقہ ہے، وہ اس مرض اور بیماری میں مبتلا ہے اور اس کی وجہ سے آدمی اللہ تعالیٰ کے یہاں اپنے مقام اور مرتبے کو کھو دیتا ہے۔

شراب پینے والے ایک صحابی کو ملامت کرنے پر حضور ﷺ کی تنبیہ

بخاری شریف میں روایت ہے، ایک صحابی رضی اللہ عنہ تھے، ان کا نام عبداللہ اور لقب ''الحِمار'' تھا، اس لقب سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ معاشرے میں ان کو کیسا سمجھا جاتا تھا۔ شراب کی حرمت نازل ہو چکی تھی لیکن شراب کی حرمت سے پہلے شراب پینے کا عام رواج تھا، جب شراب کی حرمت نازل ہوئی تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے یکلخت اس کو چھوڑ دیا لیکن کسی چیز کی ایسی عادت جو طبیعت میں پیوست ہو چکی ہوتی ہے تو بعض لوگ صبر نہیں کر پاتے، ان سے بھی کوتاہی ہوئی، فروگذاشت ہوئی اور شراب پی، اس لیے شریعت نے کوڑوں کی شکل میں شراب پینے کی جو سزا مقرر کی ہے، وہ سزا ان پر بھی جاری کی گئی۔

دو تین مرتبہ ایسا ہوا اور ان کو پکڑ کر لایا گیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ جب وہ لائے گئے تو ایک صحابی کی زبان سے یہ جملہ نکلا: اللّٰھُمَّ العَنْهُ، مَا أَكْثَرَ مَا يُؤْتَى بِهِ! کہ: اے اللہ! اس پر لعنت فرما، کتنی مرتبہ ان کو شراب پینے کے جرم میں لایا جارہا ہے! جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ سنا تو ارشاد فرمایا: لَا تَلْعَنُوهُ، فَوَاللهِ مَا عَلِمْتُ أَنَّهُ يُحِبُّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ: اس پر لعنت مت بھیجو، جہاں تک میں جانتا ہوں، یہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت رکھتا ہے [۱]، تمھیں یہ حق نہیں پہنچتا کہ اس کے لیے اس طرح کے جملے استعمال کرو۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ کی ظرافت

ان ہی کے متعلق لکھا ہے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہنسایا کرتے تھے، ان کے اندر ظرافت تھی، کبھی کوئی تجارتی قافلہ آیا اور ان کے پاس سے شہد یا کوئی اچھی چیز گھی وغیرہ خریدی اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آکر ہدیہ کے طور پر پیش کیا، بعد میں جب وہ قیمت کا مطالبہ کرتے تو یہ ان کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں لے کر آتے اور کہتے کہ: اے اللہ کے رسول! وہ شہد جو میں نے آپ کو پیش کیا تھا، اس کی قیمت ان کو دے دیجیے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے کہ وہ تو تم ہدیہ کے طور پر لائے تھے؟ تو وہ کہتے کہ: اے اللہ کے رسول! جب وہ شہد بکتے ہوئے میں نے دیکھا تو میرے جی میں آیا کہ آپ اس کو تناول فرماویں، میرے پاس قیمت تو تھی نہیں، اس لیے میں نے ادھار خرید لیا اور آپ

---

(۱) صحيح البخاری، عَنْ عُمَرَ بْنِ الخَطَّابِ رضی اللہ عنہ، بَابُ مَا يُكْرَهُ مِنْ لَعْنِ شَارِبِ الخَمْرِ إلخ، ر:٦٧٨٠.

کی خدمت میں پیش کردیا، اب آپ ہی قیمت ادا کردیجیے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسکرا کر قیمت ادا کردیا کرتے تھے ①۔

بعض روایتوں میں یہ قصہ حضرت نُعیمان کے بارے میں آتا ہے اور بعض نے ابنِ نُعیمان بتایا ہے ② بعض کہتے ہیں کہ نعیمان اور یہ دونوں ایک ہیں ③۔

میں تو یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ دیکھئے! یہ دینی بدحالی ہے، شراب پینے کے جرم میں گرفتار کرکے لائے جارہے ہیں، اس پر ایک آدمی کی زبان سے لعنت کا یہ جملہ نکلا تو نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فوراً تنبیہ فرمائی کہ ایسا مت کہو۔

تقویٰ ناپنے کا کوئی آلہ کسی کے پاس نہیں

خلاصہ یہ ہے کہ کسی کو گناہ میں مبتلا دیکھ کر اس کے متعلق دل میں حقارت کا جذبہ لانا اور اپنی ذات کو اس سے افضل سمجھ لینا، اس کی شریعت اجازت نہیں دیتی: ﴿فَلَا تُزَكُّوٓا

① فتح الباری ١٢/ ٧٧، باب ما يكره من لعن شارب الخمر. مجمع الزوائد ومنبع الفوائد ٤/ ١٤٨، عن ابن عمر رضی اللہ عنہما، باب ثواب الهدية والثناء والمكافأة، ر:٦٧٧١.

② بخاری شریف میں نشے کی حالت میں لائے جانے والے صحابی کا یہی نام تردید کے ساتھ مذکور ہے: عَنْ عُقْبَةَ بْنِ الحَارِثِ: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ أُتِيَ بِنُعَيْمَانَ أَوْ بِابْنِ نُعَيْمَانَ، وَهُوَ سَكْرَانُ، إلخ (بَابُ الضَّرْبِ بِالْجَرِيدِ وَالنِّعَالِ، ر:٦٧٧١.)

③ علامہ ابن الاثیرؒ نے اسد الغابہ میں دونوں کو ایک ہی قرار دیا ہے، چناں چہ نعیمان بن عمرو کے ترجمے کے تحت فرماتے ہیں: وأخباره فِي مزاحه مشهورة، وَكَانَ يشرب الخمر، فكان يؤتى بِهِ النَّبِيّ ﷺ فيضربه بنعله، ويأمر أصحابه فيضربونه بنعالهم، ويحثون عَلَيْهِ ا لتراب، فلما كثر ذَلِكَ مِنْه قَالَ لَهُ رجل من أصحاب النَّبِيّ ﷺ: لعنك الله، فقال النَّبِيّ ﷺ: لا تفعل، فإنه يحب الله ورسوله. (٥/ ٣٣١)

أَنفُسَكُمْ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنِ ٱتَّقَىٰٓ ﴿٣٢﴾ [النجم]: اپنی ذاتوں کو بہت بڑا عابد اور متقی مت قرار دو، کس کے دل میں کتنا تقویٰ ہے، اس کو تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں، تقویٰ ناپنے کا کوئی آلہ اور تھرمامیٹر کسی کے پاس بھی نہیں ہے۔

سارے انسان ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں

اور اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ إِنَّا خَلَقۡنَٰكُم مِّن ذَكَرٖ وَأُنثَىٰ وَجَعَلۡنَٰكُمۡ شُعُوبٗا وَقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوٓاْۚ إِنَّ أَكۡرَمَكُمۡ عِندَ ٱللَّهِ أَتۡقَىٰكُمۡۚ إِنَّ ٱللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٞ ﴿١٣﴾﴾ [الحجرات] کہ: اے لوگو! ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا۔ اس ساری دنیا میں جتنے بھی انسان بستے ہیں، وہ سارے حضرت آدم اور حضرت حوا علیہا السلام کی نسل سے ہیں، سب ایک ماں باپ کی اولاد ہیں، جب سب ایک ماں باپ کی اولاد ہیں تو ایک کو دوسرے پر کیا فوقیت ہوگی؟۔

قبائل اور خاندان محض آپس کی جان پہچان کے لیے بنائے گئے ہیں

﴿وَجَعَلۡنَٰكُمۡ شُعُوبٗا وَقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوٓاْۚ﴾ اور تمھارے مختلف قبیلے اور خاندان بنائے اور یہ کوئی فخر کرنے کے لیے نہیں بلکہ صرف آپس کی پہچان اور تعارف کے لیے بنائے ہیں، ایک نام کے کئی آدمی ہیں، یوسف اِس کا بھی نام ہے اور یوسف اُس کا بھی نام ہے تو دونوں کو ان کے خاندان اور قبیلے سے پہچانیں گے کہ یہ یوسف فلانے خاندان والا اور وہ یوسف فلانے قبیلے والا ہے، یہ خاندان اور قبیلے اس طرح کی پہچان کے لیے بنائے ہیں، کوئی آدمی کسی قبیلے اور خاندان سے تعلق رکھتا ہے تو اس سے کوئی فضیلت

حاصل نہیں ہوتی، کسی قوم میں ہونے کی وجہ سے کوئی بڑا نہیں بن جاتا، آدمی اپنے عمل سے اللہ کے یہاں بڑا مرتبہ پاتا ہے۔

سب سے زیادہ عزت والا کون؟

﴿إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ ٱللَّهِ أَتْقَىٰكُمْ﴾: اصل چیز اور وصف جس کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ کے یہاں کسی کا مقام اونچا ہوسکتا ہے، وہ تقویٰ ہے، تم میں سب سے زیادہ عزت اور اکرام والا اللہ تعالیٰ کے یہاں وہی ہے جو سب سے زیادہ تقوے والا ہو، اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے سب سے زیادہ بچنے والا ہو۔

تقویٰ قلبی چیز ہے

بہرحال نبیٔ کریم ﷺ فرماتے ہیں: التَّقْوٰی هَاهُنَا کہ: تقویٰ یہاں ہے، گناہوں اور اللہ کی نافرمانی سے کون کتنا بچتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ جانتے ہیں، میرے دل میں کیا ہے، وہ آپ نہیں جانتے اور آپ کے دل میں کیا ہے، وہ میں نہیں جانتا، اس کو صرف اللہ تعالیٰ جانتے ہیں، مجھے اور آپ کو کسی کا درجہ طے کرنے کا حق اللہ تعالیٰ نے نہیں دیا ہے، بس جو اللہ تعالیٰ سے جتنا ڈرے گا، جو جتنا اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچائے گا، اتنا وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک عزت والا ہے۔

آیتِ مذکورہ کا شانِ نزول

یہ آیت کب نازل ہوئی؟، مکۂ مکرمہ کو جب نبیٔ کریم ﷺ نے فتح کیا اور اس کے بعد آپ ﷺ کعبۃ اللہ میں داخل ہوئے اور لوگوں کی معافی کا اعلان کیا، اسی میں ظہر کا

وقت ہوگیا، جب ظہر کا وقت ہوگیا تو نبیٔ کریم ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ کعبۃ اللہ کی چھت پر چڑھ کر ظہر کی نماز کے لیے اذان کہو۔

حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی اذان پر بعض قریشیوں کی چہ می گوئیاں

انھوں نے کعبۃ اللہ کی چھت پر چڑھ کر اذان کہنا شروع کیا تو یہ مکہ والے جو بہت سے ابھی ایمان لائے نہیں تھے: عتاب بن اسید، خالد بن اسید، ابوسفیان، صفوان بن امیہ اور حارث بن ہشام۔ یہ حارث بن ہشام ابوجہل کے بھائی ہیں، بعد میں اللہ تعالیٰ نے ان کو ایمان کی توفیق عطا فرمائی۔ یہ سب لوگ حرم میں بیٹھے ہوئے ہیں اور ابھی مسلمان نہیں ہوئے ہیں، جب حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے کعبۃ اللہ پر چڑھ کر اذان کہنی شروع کی تو اس حارث بن ہشام نے کہا کہ محمد (ﷺ) کو کیا سوجھی کہ اس کالے کوے کو کعبۃ اللہ پر چڑھا دیا۔ العیاذ باللہ۔ کوئی دوسرا آدمی انھیں ملا ہی نہیں کہ ان سے اذان کہلوا رہے ہیں؟ چوں کہ اس وقت ایمان نہیں لائے تھے، اس لیے یہ بات کہی، بعد میں ایمان لائے اور بہت اچھے مؤمن ہوئے۔

جب انھوں نے یہ کہا تو عتاب بن اسید اور خالد بن اسید، یہ بھی قریش کے بڑے لوگوں میں سے تھے تو عتاب بن اسید کہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ میرے والد کا اس واقعے سے پہلے انتقال ہوگیا اور یہ سین (seen) دیکھنے کی نوبت نہیں آئی، اللہ نے ان کی عزت رکھ لی۔ ابوسفیان کہنے لگے کہ میں تو کچھ بولوں گا نا تو مجھے ڈر ہے کہ یہ کنکریاں بھی میرے خلاف گواہی دینے اٹھ کھڑی ہوں گی۔

بذریعۂ وحی ان چہ می گوئیوں کی حضور ﷺ کو اطلاع

اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ ساری باتیں بہ ذریعۂ وحی نبیٔ کریم ﷺ کو بتلادیں کہ فلاں یہ کہہ رہا ہے اور فلاں اس سلسلے میں یہ کہہ رہا ہے اور یہ آیت نازل فرمائی: ﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَٰكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَٰكُمْ شُعُوبًا وَقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوٓا۟ ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ ٱللَّهِ أَتْقَىٰكُمْ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ﴿١٣﴾﴾ [الحجرات] کہ: اے لوگو! ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمھاری قومیں اور خاندان آپس کی پہچان کے لیے بنائے، تم میں سب سے زیادہ عزت والا قریشی ہے؟ نہیں! جو جتنا زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرے گا، وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا ہے اور بلال تم میں سب سے زیادہ بچتے ہیں، اللہ سے ڈرتے ہیں، وہ افضل ہیں۔

نبیٔ کریم ﷺ ان کے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ تم لوگوں نے ابھی یہ یہ بات کہی تھی نا؟ ان لوگوں نے سوچا کہ ہم میں سے کوئی آدمی یہاں سے ہلا بھی نہیں ہے، پھر محمد (ﷺ) کو ہماری یہ سب باتیں کیسے معلوم ہو گئیں!؟ یہ کہہ کر سب ایمان لے آئے۔ پھر نبیٔ کریم ﷺ نے ان کو یہ آیت سنائی جس میں قیامت تک آنے والے لوگوں کو یہ سبق دیا گیا کہ کسی کی ظاہری شکل وصورت کو دیکھ کر فیصلہ نہیں کرنا چاہیے، اگرچہ بلال حبشی ہیں، کالے ہیں، غلامی سے آزاد ہوئے ہیں اور قریش کا خاندان بڑا اونچا سمجھا جاتا ہے، نبیٔ کریم ﷺ کا اسی سے تعلق ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو اس بات کی اجازت نہیں دی کہ وہ قریشی ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو حضرت بلال

رضی اللہ عنہ سے اونچا سمجھیں۔

دوسروں کو حقیر سمجھنے والا سخت آزمائشوں سے گذرتا ہے

یہ ہے وَلَا يَحْقِرُهُ کا مطلب۔ کبھی کسی کو حقیر مت سمجھنا، جو آدمی دوسروں کو حقیر سمجھتا ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ اس کو بڑی سزا دیتے ہیں، بڑے حالات میں مبتلا کرتے ہیں اور سخت آزمائشوں سے گذرتا ہے، اس لیے اس تحقیر سے اپنے آپ کو بہت زیادہ بچانے کی ضرورت ہے۔

معاشرے کا معیار اور شریعت کا معیار

حضرت انس رضی اللہ عنہ جو نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خادم ہیں، ان کے ایک بھائی ہیں حضرت براء بن مالک رضی اللہ عنہ، بہت سادہ اور چھریرے بدن والے تھے۔ بعض اوقات آدمی دکھنے میں بہت بڑا معلوم ہوتا ہے؛ مگر یہ دکھنے میں معمولی آدمی تھے۔ بخاری شریف میں حضرت سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ ایک بڑا آدمی جو سوسائٹی میں بڑا باوقعت اور مرتبے والا سمجھا جاتا تھا، وہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مجلس کے پاس سے گذرا تو نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے پاس بیٹھے ہوئے حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم سے پوچھا: مَا تَقُولُونَ فِي هَذَا؟: اس آدمی کے سلسلے میں تم کیا کہتے ہو؟ جواب میں حضراتِ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے عرض کیا: حَرِيٌّ إِنْ خَطَبَ أَنْ يُنْكَحَ، وَإِنْ شَفَعَ أَنْ يُشَفَّعَ، وَإِنْ قَالَ أَنْ يُسْتَمَعَ: اے اللہ کے رسول! یہ ایسا آدمی ہے کہ اگر کسی کے گھر پیغامِ نکاح بھیج دے تو وہ اس کے پیغام کو رد نہیں کرسکتے، اس کا نکاح وہاں ہوجائے گا، اگر کسی کی سفارش کردے تو

اس کی سفارش قبول کرلی جائے گی، رد نہیں کی جائے گی، اور اگر کوئی بات کہے تو لوگ کان دھر کے بہت غور سے سنیں گے، بے توجہی نہیں برتیں گے، اس لیے کہ بڑا آدمی ہے۔

اس کے بعد راوی کہتے ہیں کہ کچھ دیر خاموشی چھائی رہی: فَمَرَّ رَجُلٌ مِنْ فُقَرَاءِ الْمُسْلِمِينَ: اس کے بعد ایک اور آدمی گذرا جو بے چارہ غریب مسلمان تھا تو حضور ﷺ نے دریافت فرمایا: مَا تَقُولُونَ فِي هَذَا؟ یعنی اس آدمی کے متعلق تم کیا کہتے ہو؟ تو جواب میں حضراتِ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے عرض کیا: حَرِيٌّ إِنْ خَطَبَ أَنْ لاَ يُنْكَحَ، وَإِنْ شَفَعَ أَنْ لاَ يُشَفَّعَ، وَإِنْ قَالَ أَنْ لاَ يُسْتَمَعَ: کہیں پیغامِ نکاح بھیجے تو کوئی ان کو چھوکری نہیں دے گا، سب انکار کردیں گے کہ اس کے گھر میں ہے کیا؟ نہ گھر ہے، نہ دوکان ہے، اس کو لڑکی دے کر کیا کریں گے! اور کسی کی سفارش کرے گا تو کوئی قبول نہیں کرے گا، سب رد کردیں گے اور کوئی بات کرے گا تو کوئی دھیان سے نہیں سنے گا۔

اس جواب کو سن کر حضور ﷺ نے عجیب بات ارشاد فرمائی، راوی کہتے ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ نے فرمایا: هَذَا خَيْرٌ مِنْ مِلْءِ الأَرْضِ مِثْلَ هَذَا: اُس جیسے لوگ زمین بھر کر بھی ہو جائے تو یہ اُن سے افضل ہیں[1]۔ حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حدیث میں اتنا بڑا مبالغہ میری نظر سے نہیں گذرا[2]۔ اُس جیسے زمین بھر کے ہوں تو بھی اِس ایک کے برابر نہیں ہو سکتے۔ ہم لوگ تو سطحی نظر کے حامل ہیں، کسی کے متعلق ظاہری شکل وصورت دیکھ کر فیصلہ کردیتے ہیں۔

---

(۱) صحيح البخارى، عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ رضي الله عنه، كِتَابُ النِّكَاحِ، بَابُ الأَكْفَاءِ فِي الدِّينِ، ر: ۵۰۹۱.

(۱) فيض الباري على صحيح البخاري، ۵/ ۵۰۵، تحت الحديث المذكور

حضرت براء بن مالک رضی اللہ عنہ کا مقام ومرتبہ

حضرت انس رضی اللہ عنہ کے بھائی حضرت براء بن مالک رضی اللہ عنہ بھی ایسے ہی تھے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے متعلق ایک مرتبہ ارشاد فرمایا: رُبَّ أَشْعَثَ أَغْبَرَ ذِي طِمْرَيْنِ تَنْبُو عَنْهُ أَعْيَنُ النَّاسِ لَوْ أَقْسَمَ عَلَى اللهِ لَأَبَرَّهُ: بہت سے ایسے لوگ ہیں جو پراگندہ بال، بکھرے ہوئے بال، میلے کچیلے کپڑے، دو معمولی چادریں پہنے ہوئے، جن پر لوگوں کی نگاہ ٹکتی نہیں ہے- ایسے بدحال قسم کے لوگ جن کے جسم پر معمولی کپڑا ہوتا ہے، ان سے آدمی نگاہ ہٹالیتا ہے، دیر تک نظر بھر کر دیکھنے کا جی نہیں چاہتا اور عمدہ کپڑا ہوتا ہے تو ذرا دیکھتا ہے- نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ لوگوں کی نگاہیں وہاں معمولی لباس کی وجہ سے ٹکتی نہیں ہیں لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں اس کا مقام یہ ہے کہ اگر وہ اللہ تعالیٰ پر قسم کھالے تو اس کو اس قسم میں بری کردیں، اللہ تعالیٰ اس کو ضرور پورا کریں۔

ایک اور روایت ہے، اس میں صراحت ہے: مِنْهُمُ الْبَرَاءُ بْنُ مَالِكٍ: ان ہی میں سے حضرت براء بن مالک رضی اللہ عنہ ہیں [۱]۔

---

① ترمذی میں یہ حدیث الفاظ کی کچھ کمی بیشی کے ساتھ موجود ہے: كَمْ مِنْ أَشْعَثَ أَغْبَرَ ذِى طِمْرَيْنِ لاَ يُؤْبَهُ لَهُ لَوْ أَقْسَمَ عَلَى اللّٰهِ لأَبَرَّهُ مِنْهُمُ الْبَرَاءُ بْنُ مَالِكٍ(عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رضی اللہ عنہ، باب مَنَاقِبِ الْبَرَاءِ بْنِ مَالِكٍ رضی اللہ عنہ) دلائل النبوۃ اور مسند ابی یعلی وغیرہ میں بھی یہ حدیث کسی قدر تغیر کے ساتھ مذکور ہے البتہ کنز العمال میں یہ حدیث بلفظہ موجود ہے (كنز العمال، الفصل الثاني: في تعديد الأخلاق المحمودة على ترتيب الحروف المعجمة،عن أبي هريرة)۔

تستر قلعے کی فتح کے لیے دعا کروانا

روایتوں میں ہے کہ: حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں اسلامی لشکر کئی دنوں سے تستر کا قلعہ فتح کرنے کی کوشش کر رہا تھا، کئی روز تک قلعہ کا محاصرہ جاری رہا لیکن کامیابی حاصل نہیں ہو رہی تھی، قلعہ فتح نہیں ہو رہا تھا، اس لشکر میں حضرت براء بن مالک رضی اللہ عنہ بھی تھے، لوگوں نے ان کو پکڑ لیا اور کہا کہ: آپ کو دعا کرنی پڑے گی؛ کیوں کہ تمھارے متعلق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے: لَوْ أَقْسَمَ عَلَى اللهِ لَأَبَرَّهُ: اگر وہ اللہ کے اوپر قسم کھالے یعنی اللہ کی قسم کھالے تو اللہ بری کر دے؛ اس لیے آپ کو دعا کرنی پڑے گی، چناں چہ لوگوں نے جب خوب اصرار کیا اور پیچھا نہیں چھوڑا، تو انھوں نے ہاتھ اٹھائے اور دعا کی: اے اللہ! ان دشمنوں پر ہمیں فتح عطا فرما اور قلعہ کو فتح کرنے کی ہماری کوششوں کو کامیابی سے ہم کنار فرما اور دشمنوں کو ہمارے ہاتھوں قیدی بنا دے اور مجھے تیرے حبیب سے ملا دے۔ اللہ تعالیٰ نے دعا قبول فرمائی، چناں چہ اس کے بعد جنگ ہوئی، یہ تو شہید ہو گئے لیکن قلعہ فتح ہو گیا[1]۔

عرض کرنے کا منشا یہ ہے کہ ظاہری شکل وصورت کی وجہ سے کسی کی تحقیر دل میں نہیں آنی چاہیے۔

میں نے اللہ تعالیٰ کو قسم دی تھی

لکھا ہے کہ ایک مرتبہ بصرہ کے اندر آگ لگی، سارے جھونپڑے جل گئے، ایک

---

(١) البداية والنهاية ٧ / ٩٩، ذكر فتح تستر ثانية وأسر الهرمزان إلخ.

جھونپڑا جو اِن سب کے بیچ میں تھا، بچ گیا، حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: اس جھونپڑے کے مالک کو میں نے قسم دے کر پوچھا کہ تیرا جھونپڑا کیسے بچ گیا؟ تو اس نے کہا کہ: میں نے اللہ تعالیٰ کو قسم دی تھی کہ میرا جھونپڑا نہ جلنے پاوے۔ اس لیے جو جھونپڑے میں رہتے ہیں، ان کو حقیر نہ سمجھا جائے۔

کسی بھی مخلوق کو حقیر سمجھنا اپنے اعمال کو ضائع کرنا ہے

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے احیاء العلوم میں لکھا ہے کہ: جس نے اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے کسی ایک سے بھی اپنے آپ کو بہتر سمجھا، اس نے اپنی حماقت سے اپنے اعمال کو ضائع اور برباد کر دیا[۱]۔

حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تنبیہ

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف سے گورنر تھے، ان کی خدمت میں ایک وفد پہنچا، جس میں کچھ عرب حضرات بھی تھے، کچھ عجمی حضرات بھی تھے۔ انہوں نے عرب حضرات کا اکرام کیا، ان کے ساتھ اچھا داد و دہش کا سلوک کیا اور عجمی حضرات کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا تو باقاعدہ ان کو تنبیہ فرمائی اور فرمایا: أَلَّا سَوَّيْتَ بَيْنَهُمْ؟ کہ ان کے درمیان سلوک میں برابری کیوں نہیں کی؟ مؤمن تو دونوں ہیں اور پھر یہ حدیث ارشاد فرمائی: بِحَسْبِ امْرِئٍ مِنَ الشَّرِّ أَنْ يَحْقِرَ أَخَاهُ الْمُسْلِمَ: کسی مسلمان کی بُرائی کے لیے یہ کافی ہے کہ اپنے مسلمان

---

(۱) احياء علوم الدين، ۳/ ۳۵۰، كتاب ذم الكبر والعجب.

بھائی کو حقیر سمجھے[۱]۔

حسد کی ممانعت

نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے کسی کی تحقیر سے بھی منع فرمایا اور حسد سے بھی منع فرمایا، لَا تَبَاغَضُوا، وَلَا تَحَاسَدُوا، وَلَا تَدَابَرُوا: کسی سے بغض وعداوت بھی مت رکھو اور کسی سے حسد کا جذبہ بھی مت رکھو۔

حسد کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے کسی کو کوئی نعمت دے رکھی ہے، اس کی اس نعمت کو دیکھ کر ہمارے دل میں جلن پیدا ہو کہ اللہ تعالیٰ اس سے اِس نعمت کو چھین لے۔

حسد کرنا اللہ پر اعتراض کرنا ہے

حقیقت میں ایسا سوچنے والا اللہ تعالیٰ کے اوپر اعتراض کرنا چاہتا ہے، وہ یوں کہنا چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو یہ نعمت کیوں دے دی؟۔ بھائی! آپ اپنے کسی ماتحت کو کوئی چیز دیں اور دوسرا اس پر اعتراض کرے کہ آپ نے اس کو یہ چیز کیوں دی؟ تو کیا آپ اس کو گوارا کریں گے؟ آپ کہیں گے کہ میری چیز تھی، میں جسے چاہے دوں، اس پر اعتراض کرنے والے تم کون ہوتے ہو؟﴿ذَٰلِكَ فَضْلُ ٱللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَآءُ﴾: یہ نعمت اللہ تعالیٰ کا فضل ہے، اللہ تعالیٰ جسے چاہے دیں۔

---

[۱] كنز العمال في سنن الأقوال والأفعال ٤/ ٥٧٦، عن الحسن البصري رَحِمَهُ ٱللَّهُ، الأرزاق والعطايا، ر:١١٦٩١.

اور باری تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿أَمْ يَحْسُدُونَ ٱلنَّاسَ عَلَىٰ مَآ ءَاتَىٰهُمُ ٱللَّهُ مِن فَضْلِهِۦ﴾ [النساء ۵۴]: اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے کسی کو کوئی نعمت عطا فرمائی، کیا تم اس پر جلتے ہو؟ تم کو کیا حق پہنچتا ہے؟۔

رشتۂ اخوت کا تقاضا

اسی حسد کی بنیاد پر آپس میں دشمناوٹیں پیدا ہوتی ہیں، وَلَا تَدَابَرُوا: ایک دوسرے سے منہ مت پھیرو۔ جب دو آدمیوں کے درمیان دشمناوٹ ہوتی ہے تو جب یہ آتا ہے تو وہ اُس کی طرف سے اپنا منہ پھیر لیتا ہے اور جب وہ آتا ہے تو یہ اُس کی طرف سے اپنا منہ پھیر لیتا ہے، وَكُونُوا عِبَادَ اللهِ: تم اللہ کے بندے آپس میں بھائی بھائی بن کر کے رہو۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے مسلمانوں کو ایک دوسرے کا بھائی بنایا اور اسلام کی وجہ سے آپس میں اخوت اور بھائی چارگی کا رشتہ قائم فرمایا، چناں چہ قرآن میں باری تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿إِنَّمَا ٱلْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ﴾ [الحجرات ۱۰] کہ ایمان والے ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ اس رشتۂ اخوت اور بھائی چارگی کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنے دلوں میں کسی بھی مسلمان کے متعلق کوئی میل، کینہ، بغض، عداوت، دشمناوٹ، حسد جیسی کوئی چیز نہ رکھیں، دل بالکل صاف ہو۔

حسد کے دیگر نقصانات

نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: إِيَّاكُمْ وَالْحَسَدَ، فَإِنَّ الْحَسَدَ يَأْكُلُ الْحَسَنَاتِ كَمَا تَأْكُلُ النَّارُ الْحَطَبَ کہ: اپنے آپ کو حسد سے بچاؤ، اس لیے کہ حسد نیکیوں کو اس طرح

کھا جاتا ہے، جس طرح آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے۔

ایک اور موقع سے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: دَبَّ إِلَيْكُمْ دَاءُ الْأُمَمِ مِنْ قَبْلِكُمْ، الْحَسَدُ وَالْبَغْضَاءُ، وَالْبَغْضَاءُ هِيَ الْحَالِقَةُ، لَا أَقُولُ تَحْلِقُ الشَّعْرَ، وَلَكِنَّهَا تَحْلِقُ الدِّينَ یعنی: اگلی امتوں کے اندر جو دو بیماریاں تھیں، وہ دھیرے دھیرے تمھارے اندر بھی سرایت کر رہی ہیں: حسد اور دشمناوٹ، پھر فرمایا کہ یہ حسد مونڈنے والی ہے، کس چیز کو مونڈتی ہے؟ تو فرمایا کہ: میں یہ نہیں کہتا کہ بالوں کو مونڈتی ہے بلکہ یہ تو دین کو مونڈ ڈالتی ہے۔

جب دو آدمیوں کے درمیان دشمنی ہوگی تو یہ اس کی برائی کرے گا اور وہ اِس کی برائی کرے گا، ایک دوسرے کی غیبت کریں گے، تہمت لگائیں گے، ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کے درپے ہوں گے۔ آج گھر گھر میں پریشانی ہے، بھائی بھائی کی طرف سے پریشانی میں مبتلا ہے، بھائی بھائی کو نقصان پہنچا رہا ہے، یہ حسد اور دشمناوٹ بہت خطرناک جذبے ہیں، ان سے اپنے دلوں کو صاف کیجیے۔ اس مبارک رات (شب براءت) میں جن لوگوں کی مغفرت نہیں ہوتی، اکثر روایتوں میں دو کا تو خاص ذکر ہے: مشرک اور مشاحن یعنی کینہ رکھنے والا، دل کے اندر میل رکھنے والا، اس لیے اپنے دلوں کو اپنے مسلمان بھائیوں کی طرف سے ہمیشہ صاف رکھنے کا اہتمام کرنا چاہیے۔

دل ہی تو ہے نہ کہ سنگ وخشت

کوئی معاملہ ہو جائے، ٹھیک ہے، شریعت نے بھی تین دن کی اجازت دی ہے۔

انسانی جذبات کی شریعت بھی رعایت کرتی ہے، کسی نے کوئی ناگواری کی بات کی، تو ہمارا دل متأثر ہوتا ہے۔

دل ہی تو ہے نہ کہ سنگ وخشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں رُلائے کیوں

کوئی ناروا سلوک ہم سے کرتا ہے تو دل کو تکلیف تو پہنچتی ہے، نبیٔ کریم ﷺ کو بھی پہنچی ہے؛ اس لیے شریعت نے اجازت دی ہے کہ آپ اپنی ناراضگی کا اظہار کرنے کے لیے ایک دو تین دن تک اس سے کٹّی کرنا چاہیں تو کریں۔

مسلمان بھائی سے قطع تعلق کرنے پر سخت وعید

لیکن تین دن سے زیادہ بات چیت بند رکھنے کی اجازت نہیں، اس لیے کہ نبیٔ کریم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں، ابوداؤد شریف کی روایت ہے: لَا يَحِلُّ لِمُسْلِمٍ أَنْ يَهْجُرَ أَخَاهُ فَوْقَ ثَلَاثٍ، فَمَنْ هَجَرَ فَوْقَ ثَلَاثٍ فَمَاتَ دَخَلَ النَّارَ: اپنے مسلمان بھائی سے تین دن سے زیادہ کٹی نہیں کر سکتے، اگر تین دن سے زیادہ تعلق کاٹے ہوئے رکھے اور اس حال میں موت آ گئی تو وہ آدمی جہنم میں جائے گا، بہت خطرناک وعید سنائی ہے [1]۔

بہرحال شریعت بھی ویسے رعایت تو کرتی ہے، لیکن یہ جو ہمارے معاشرے میں عام ہو گیا ہے، بھائی بھائی کی لڑائی اور پڑوسیوں کے ساتھ ذرا سی کوئی ناگواری کی بات ہوئی تو معاف کرنے کے لیے تیار ہی نہیں۔ یہ بڑا خطرناک ہے۔

(۱) سنن أبی داود، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ، بَابٌ فِيمَنْ يَهْجُرُ أَخَاهُ الْمُسْلِمَ، ر: ٤٩١٤.

حضرت ابوطلحہ اور حضرت انس رضی اللہ عنہما کی رشتے داری

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب مکۂ مکرمہ سے ہجرت فرما کر مدینۂ منورہ تشریف لائے تو حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کے سوتیلے والد تھے، حضرت انس رضی اللہ عنہ کے حقیقی والد کا انتقال ہو چکا تھا، اس کے بعد حضرت انس رضی اللہ عنہ کی والدہ کا نکاح ان ہی حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہوا تھا، اس لیے حضرت انس رضی اللہ عنہ ان کی پرورش میں تھے، یہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کے سوتیلے ابا تھے۔

خادمِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت انس رضی اللہ عنہ کا مقام ومرتبہ

حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: کوئی ایسا خادم، چھوٹا بچہ جو گھر کی خدمت کر سکتا ہو، ہمیں بتلاؤ؛ تاکہ وہ ہمیں باہر سے کوئی چیز لانی ہو تو لادیا کرے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے مجھے اونٹ پر پیچھے بٹھلایا اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں لے گئے، اس وقت حضرت انس رضی اللہ عنہ کی عمر دس سال کی تھی۔ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا کہ: یہ انس ہیں، یہ آپ کی خدمت کریں گے۔ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو قبول فرمالیا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات تک انھوں نے نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت کی یعنی دس سال تک خدمت کی، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے وقت حضرت انس رضی اللہ عنہ کی عمر ۲۰ / سال تھی۔ آج کسی بزرگ کی خدمت میں کوئی آدمی دس دن رہا ہو تو پھولا نہیں سماتا اور انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت دس سال تک کی تو ان کا کیا مقام ہوگا؟، یہ ان کی بہت بڑی سعادت ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعا اور اس کے اثرات

ایک مرتبہ ان کی والدہ حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا ان کو لے کر نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا کہ: اے اللہ کے رسول! یہ آپ کے خادم انس ہیں، آپ ان کے لیے دعا فرما دیجیے تو نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعا فرمائی کہ: اے اللہ! ان کی عمر میں، ان کی اولاد میں اور ان کے مال میں برکت عطا فرما۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ دعا قبول فرمائی، چناں چہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کو بڑی عمر عطا فرمائی، بصرہ میں حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم میں سب سے اخیر میں انتقال کرنے والے یہی حضرت انس رضی اللہ عنہ ہیں۔

اولاد میں بھی اللہ تعالیٰ نے ان کو خوب برکت عطا فرمائی، سو سے زیادہ اولاد تو انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لی اور اولاد کی اولاد الگ ہے۔

مال میں اتنی برکت عطا فرمائی کہ ان کے باغات سال میں دو مرتبہ پھل دیتے تھے، دوسروں کے باغات میں تو سال میں ایک مرتبہ پھل آتا تھا لیکن حضرت انس رضی اللہ عنہ کے باغات میں سال میں دو مرتبہ پھل آتا تھا[۱]، ان کے باغ میں ایک پھول تھا جس کے اندر سے مشک کی سی خوشبو آیا کرتی تھی۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک اہم نصیحت ووصیت

یہ حضرت انس رضی اللہ عنہ جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خادم تھے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کو وصیت فرما

---

۱ الطبقات الکبری لابن سعد، ۷/ ۱۹.

رہے ہیں: يَا بُنَيَّ! إِنْ قَدَرْتَ أَنْ تُصْبِحَ وَتُمْسِيَ لَيْسَ فِي قَلْبِكَ غِشٌّ لأَحَدٍ فَافْعَلْ: اے میرے پیارے بیٹے! اگر تم ایسا کر سکتے ہو کہ تم صبح وشام ایسی حالت میں کرو کہ تمھارے دل میں کسی کے متعلق میل نہیں ہے، کسی کا کینہ نہیں ہے، حسد نہیں ہے، کوئی غلط جذبہ نہیں ہے تو ایسا ضرور کرو، ثُمَّ قَالَ لِي: اس کے بعد حضور ﷺ نے فرمایا: يَا بُنَيَّ وَذَلِكَ مِنْ سُنَّتِي: اے میرے پیارے بیٹے! یہ میری سنت ہے، یہ میرا طریقہ ہے: وَمَنْ أَحَبَّ سُنَّتِي فَقَدْ أَحَبَّنِي: اور جس نے میری سنت سے محبت کی یعنی میری سنت کو زندہ کیا، اس نے مجھ سے محبت کی، وَمَنْ أَحَبَّنِي كَانَ مَعِي فِي الجَنَّةِ: اور جس نے مجھ سے محبت کی، وہ میرے ساتھ جنت میں ہوگا۔

اپنے دل کو پاک صاف رکھنے کا نبوی اہتمام

نبیٔ کریم ﷺ ہمیشہ اس بات کا اہتمام کرتے تھے کہ آپ کے قلبِ مبارک کے اندر کسی کے متعلق کوئی میل نہ رہے، اسی لیے کبھی منافقین حضور ﷺ کے بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کے متعلق جھوٹی شکایتیں لے کر نبیٔ کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے تو حضور ﷺ فرماتے تھے کہ تم میرے صحابہ کے متعلق ایسی شکایتیں میرے پاس مت لاؤ، میں چاہتا ہوں کہ میں ان کے پاس اس حال میں آؤں کہ میرا دل ان کی طرف سے پاک اور صاف ہو۔

دل کی صفائی چہرے کو بھی صاف شفاف بنا دیتی ہے

حضرت ابو دجانہ رضی اللہ عنہ بڑے جلیل القدر صحابی ہیں، غزوۂ احد کے موقع پر نبیٔ کریم

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حفاظت کرتے ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دفاع کرتے ہوئے بڑے شجاعانہ اور بہادرانہ کارنامے انجام دیے۔

ایک مرتبہ وہ بیمار ہو گئے، حضرت زید بن اسلم رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم ان کی عیادت کے لیے گئے تو ان کا چہرہ بہت چمک رہا تھا، ہم نے عرض کیا کہ: حضرت! آپ کا چہرہ بہت چمک رہا ہے۔ حضرت ابو دجانہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: میرے پاس کوئی ایسا عمل نہیں ہے کہ جس پر میں اعتماد کر سکوں، البتہ دو باتیں ہیں: ایک یہ ہے کہ میں اپنے وقت کو ضائع نہیں کرتا اور دوسری بات یہ ہے کہ ہر مسلمان کے متعلق میں اپنے دل کو پاک اور صاف رکھتا ہوں [۱]۔

ابھی ایک جنتی آدمی آرہا ہے

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے مسندِ احمد میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کے حوالے سے ایک روایت نقل کی ہے کہ: نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجدِ نبوی میں تشریف فرما ہیں، حضراتِ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین آپ کو گھیرے ہوئے بیٹھے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ابھی ایک جنتی آدمی آرہا ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم چوکنے ہو گئے کہ دیکھو! کون آرہا ہے؟ کس کے نام کی لاٹری نکلتی ہے، دیکھا کہ ایک صحابی مسجد میں داخل ہوئے، تازہ وضو کیا ہوا تھا، جس کی وجہ سے وضو کا پانی چہرے سے ٹپک رہا تھا، بائیں ہاتھ میں جوتے پکڑے مسجد میں آئے اور ایک کونے میں دو رکعت ''تحیۃ المسجد'' کی نیت باندھی اور نماز سے فارغ ہو کر مجلس میں شریک

---

۱ صفة الصفوة ٤٧، أبو دُجانة سِماك بن خرشة، ١/ ١٨٤.

ہوگئے، ان کو پتہ نہیں کہ ان کے متعلق حضور ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا ہے۔ خیر! بات آئی گئی ہوگئی۔

دوسرے دن نبیٔ کریم ﷺ اسی طرح تشریف فرما ہیں، حضراتِ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین آپ کو گھیرے ہوئے بیٹھے ہیں اور آج پھر آپ نے وہی بات ارشاد فرمائی: ابھی ایک جنتی آدمی آرہا ہے۔ آج پھر حضراتِ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین چوکنے ہوگئے اور دیکھا کہ وہی صحابی ہیں، کل والی حالت ہے، تازہ وضو کیا ہوا تھا، وضو کا پانی چہرے سے ٹپک رہا تھا، بائیں ہاتھ میں جوتے پکڑے مسجد میں آئے اور کل ہی کی طرح دو رکعت ''تحیۃ المسجد'' ادا کی اور حضور ﷺ کی مجلس میں آکر شریک ہوگئے۔ ان کو پتہ نہیں کہ ان کے متعلق حضور ﷺ نے یہ بات فرمائی ہے۔ تیسرے دن بھی ایسا ہی ہوا۔ تین دن تک مسلسل ان کے متعلق حضور ﷺ جنت کی بشارت سناتے رہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ بڑے جلیل القدر صحابی ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ میرے دل میں خیال آیا: کیا بات ہے؟ آخر ان میں ایسا کون سا کمال ہے اور کونسا ایسا عمل ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ تین دن سے مسلسل ان کے متعلق جنتی ہونے کی بشارت دے رہے ہیں، اس کی تحقیق ہونی چاہیے۔

حضور ﷺ کی مجلس ختم ہوئی تو انھوں نے باہر آکر ان سے کہا کہ: آج میرا گھر والوں کے ساتھ کچھ انّیس بیس کا معاملہ ہوگیا ہے، میری کچھ ناگواری سی ہوگئی ہے، میں نے سوچا ہے کہ میں تین دن تک گھر نہیں جاؤں گا، کیا آپ مجھے اپنے پاس رہنے کی اجازت دیتے ہیں؟ اگر آپ اپنے ساتھ مجھے رہنے کی اجازت دے دیں تو میں آپ

کے ساتھ رہوں گا۔ انھوں نے اجازت دے دی۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: میں تین دن ان کے ساتھ رہا، ۲۴ ر گھنٹے برابر ان کی نگرانی کرتا تھا اور ان کے اعمال کو بہ غور دیکھتا تھا کہ ان کا کونسا عمل ایسا ہے جو ان کو جنتی ٹھہرا رہا ہے، کہتے ہیں کہ: تین دن رات ان کے ساتھ رہ کر میں نے خوب نگرانی کی؛ لیکن کوئی ایسا عمل مجھے نظر نہیں آیا جس کے متعلق میرا دل یوں کہے اور گواہی دے کہ اس کی وجہ سے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے متعلق یہ بشارت دی ہے، میں نے ان کو تہجد کے لیے اٹھتے ہوئے بھی نہیں دیکھا، ہاں! جب آنکھ کھلتی تھی تو ذکر کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ کا نام لیتے تھے، ایک عام مسلمان جیسا عمل کرتا ہے، ویسا ہی ان کا عمل تھا۔

تین دن جب پورے ہوئے تو بالآخر میں نے ان سے کہا کہ بھائی! دیکھو، میرا گھر والوں کے ساتھ کوئی جھگڑا نہیں تھا، کوئی ناگواری اور ناچاقی نہیں ہوئی تھی، بات دراصل یہ ہے کہ تین دن تک نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک آدمی کے لیے جنت کی بشارت سناتے رہے اور یہ جملہ ارشاد فرماتے رہے کہ: ''ابھی ایک جنتی آدمی آ رہا ہے'' اور تینوں دن تم ہی آتے رہے تو میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ آخر تمھارا وہ کون سا عمل ہے جس کی وجہ سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمھیں یہ بشارت سنائی، میں تین دن رات تمھارے ساتھ رہا لیکن مجھے تمھارا ایسا کوئی عمل نظر نہیں آیا جس کے متعلق میرا دل مجھے یہ گواہی دے کہ اس عمل کی وجہ سے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپ کے لیے یہ بشارت سنائی ہوگی۔ ایک عام مسلمان جس طرح پانچ وقت کی نماز پڑھتا ہے، ویسا ہی تم کرتے ہو، کوئی خاص عمل تو مجھے نظر

نہیں آیا، اب آپ ہی وہ عمل بتادیجئے۔ انھوں نے کہا کہ تم نے دیکھ تو لیا کہ میرے اندر ایسا کوئی عمل نہیں ہے۔

دل کا کینے سے خالی ہونا جنت میں داخلے کا باعث

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: میں مایوس ہو کر لوٹ رہا تھا کہ انھوں نے مجھے بلایا اور کہا کہ ایک بات ہے کہ میں اپنے دل میں کسی مسلمان کے متعلق میل اور کینہ نہیں رکھتا ہوں۔ اس پر حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے کہا کہ: بس! یہی وہ عمل ہے کہ جس کی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپ کے متعلق یہ بشارت سنائی ہے[1]۔ کتنا سستا سودا ہے جنت میں جانے کا! نہ رات بھر عبادت کرنے کی ضرورت ہے اور نہ تہجد کے لیے اٹھنے کی ضرورت ہے، نہ دن بھر روزہ رکھنے کی ضرورت ہے، نہ مجاہدات کی ضرورت پیش آئے گی، نہ ریاضات کی ضرورت پڑے گی، بس اپنے دل کو ہر مسلمان کی طرف سے پاک صاف رکھو۔ بہت آسان عمل ہے اور جنت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معیت دلانے والا عمل ہے، اللہ تعالیٰ مجھے آپ کو اس کی توفیق نصیب فرماوے۔

واقعۂ افک سے حاصل ہونے والا سبق

سب جانتے ہیں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت والا قصہ پیش آیا اور بعد میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی براءت اور جو تہمت ان پر لگائی تھی، اس سے ان کا پاک ہونا اللہ تبارک

---

① مسند الإمام أحمد بن حنبل، مُسْنَدُ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ. شعب الإيمان، عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، بَابٌ فِي الْحَثِّ عَلَى تَرْكِ الْغِلِّ وَالْحَسَدِ، ر:٦١٨١.

وتعالیٰ نے قرآن میں نازل کیا۔

تہمت میں جن لوگوں نے حصہ لیا تھا، ان میں ایک صحابی ہیں حضرت مِسطَح بن اثاثہ رضی اللہ عنہ، ان کی والدہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خالہ زاد بہن ہوتی تھیں، وہ غریب تھے۔ ان پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ خرچ کرتے تھے، جب براءت نازل ہوئی، تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے خرچ کرنا بند کردیا۔

دیکھو کتنی انصاف کی بات ہے! جب تک براءت نازل نہیں ہوئی تھی، تب تک بند نہیں کیا۔ ہم اور آپ ہوتے تو پہلے ہی روز میں نپٹا دیتے کہ اچھا! میں کھلاتا ہوں اور میرے ساتھ ہی یہ معاملہ؟۔ نہیں، انھوں نے وہاں تک کوئی اقدام نہیں کیا، کوئی ایکشن نہیں لیا، جب قرآن کی آیت نازل ہوگئی اور بات صاف ہوگئی کہ یہ غلط تھے، تب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بند کیا اور وہ بھی اپنی بیٹی ہونے کی وجہ سے نہیں، نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زوجہ تھیں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا؛ اس لیے انھوں نے بند کردیا اور قسم کھالی کہ: آئندہ ان پر خرچ نہیں کروں گا۔

حضرت مسطح رضی اللہ عنہ کا نفقہ بند کرنے پر مستقل آیتِ کریمہ کا نزول

اللہ تعالیٰ کو ان کی دل جوئی کیسی منظور ہے!؟ آیت نازل ہوئی: ﴿وَلَا يَأْتَلِ أُوْلُواْ ٱلْفَضْلِ مِنكُمْ وَٱلسَّعَةِ أَن يُؤْتُوٓاْ أُوْلِى ٱلْقُرْبَىٰ وَٱلْمَسَٰكِينَ وَٱلْمُهَٰجِرِينَ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ ۖ وَلْيَعْفُواْ وَلْيَصْفَحُوٓاْ ۗ أَلَا تُحِبُّونَ أَن يَغْفِرَ ٱللَّهُ لَكُمْ ۗ وَٱللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٢٢﴾﴾ [النور]: تم میں جو لوگ فضیلت اور کشادگی والے ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ نے مال دیا ہے، اونچا

مرتبہ دیا ہے، وہ ایسی قسمیں نہ کھائیں کہ اپنے رشتہ داروں پر خرچ نہیں کریں گے -دیکھو! ان کی سفارش اللہ کر رہے ہیں- اور پھر آگے اللہ فرماتے ہیں: ﴿أَلَا تُحِبُّونَ أَن يَغْفِرَ ٱللَّهُ لَكُمْ﴾: کیا تم یہ نہیں چاہتے کہ اللہ تمہاری غلطیوں کو معاف کر دے؟۔

آیت کریمہ سنتے ہی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ردعمل

جب یہ آیت نازل ہوئی، تو نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بلوایا اور یہ آیتیں پڑھ کر سنائیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: بَلَى أَنَا أُحِبُّ أَنْ يَغْفِرَ اللّٰهُ لِي: کیوں نہیں، میں یہ چاہتا ہوں کہ اللہ میرے گناہوں کو معاف کرے۔ چناں چہ اسی وقت اعلان کر دیا کہ آئندہ ڈبل خرچ دوں گا۔

ایسے مواقع پر ہمارا ردِّ عمل

ہم لوگ ایسی کوئی نصیحت کی بات سنتے ہیں تو بھی ضد پر ہی رہتے ہیں۔ حدیث سنتے تو ہیں لیکن کہتے ہیں کہ یہ تو بڑے لوگوں اور متقی حضرات کا کام ہے، ہم تو چھوٹے لوگ ہیں، ہم سے ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟ یعنی عمل نہیں کرنا۔ اور حضراتِ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا مزاج کیا تھا؟ جہاں انہیں متنبہ کیا فوراً تسلیم کر لیا اور اپنا حال درست کر لیا۔ ہم لوگوں کے دل ایسے اُلٹ چکے ہیں کہ غلطی ماننے کے لیے بھی تیار نہیں۔

بہر حال! آپس کے تعلقات کی استواری بہت اہم ہے، نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: صَلَاحُ ذَاتِ الْبَيْنِ، وَإِيَّاكُمْ وَالْبِغْضَةَ، فَإِنَّهَا هِيَ الْحَالِقَةُ: آپس کے تعلقات کو درست کرو اور تعلقات کی خرابی اور باہمی دشمنی سے بہت بچو، یہ بہت خطرناک

ہے، دین کو مونڈنے والی ہے [۱]۔

ہماری مجلسوں میں کیا ہوتا ہے؟ ہمارے تعلقات میں جو خرابی آتی ہے، اس کی وجہ یہی مجالس ہیں، جس میں ہم تذکرہ کرتے ہیں کہ وہ ایسا ہے اور فلاں ایسا ہے۔

دل اللہ تعالیٰ کی محبت کے لیے ہے

اس زمانے میں اپنے دلوں کو پاک صاف رکھنے کی بہت زیادہ ضرورت ہے، اپنے دل کو پاک صاف رکھئے، یہ دل اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی محبت کے لیے عطا فرمایا ہے، اس طرح کا کوڑا کباڑ رکھنے کے لیے یہ دل نہیں بنایا ہے، یہ تو پاکیزہ چیز ہے، اس میں بس اللہ کی محبت آنی چاہیے اور اللہ تعالیٰ کی محبت اس میں اسی وقت آسکتی ہے جب کہ اس کو اس طرح کی گندگیوں سے پاک صاف رکھیں گے۔

سینے کو آئینے کی طرح صاف رکھیں

ہمارے اکابر ایک شعر پڑھا کرتے تھے، حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں ایک شعر ہے:

آئینِ ما است سینہ چوں آئینہ داشتن
کفر است در طریقتِ ما کینہ داشتن

ہمارا طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنے سینے کو آئینے کی طرح بالکل صاف اور شفاف رکھتے ہیں، ہماری اس راہ میں کسی کے متعلق دل میں کینہ رکھنا کفر ہے۔

---

(۱) شعب الإيمان، عَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ رضي الله عنه، بَابٌ فِي رَحِمِ الصَّغِيرِ وَتَوْقِيرِ الْكَبِيرِ، ر:۱۰۵۷۸.

اللہ تبارک وتعالیٰ مجھے، آپ کو سب کو اس کی توفیق اور سعادت عطا فرمائے، آمین۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

مجاہدۂ نفس کا ایک رکن: تقلیلِ کلام

اقتباس

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے متعلق ان کے حالات میں لکھا ہے کہ آپ ہمیشہ منہ میں کنکر رکھتے تھے؛ تاکہ بلاضرورت بولنے کی نوبت نہ آئے، گویا زبان کو لوک (lock) کرتے تھے۔

حضرت حسّان بن ابی سنان رحمۃ اللہ علیہ ایک بزرگ ہیں، تابعی ہیں، ایک مرتبہ جارہے تھے، ایک مکان پر نظر پڑی، جو نیا نیا بنا تھا، ساتھیوں سے پوچھ لیا کہ یہ مکان کب بنا؟ پوچھنے کو تو پوچھ لیا، سوال کے طور پر زبان سے جملہ نکل گیا، فوراً دل میں خیال آیا کہ میں نے فضول اور بے کار سوال کرلیا، پھر خود ہی اپنے نفس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ تو نے بے ضرورت سوال پوچھ لیا، تجھے کیا پڑی ہے کہ یہ مکان کب بنا؟ اب میں تجھے اس کی سزا دوں گا کہ میں سال بھر کے روزے رکھوں گا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بڑے جلیل القدر صحابی ہیں، فرماتے ہیں: اگر لمبی قید اور جیل کی کوئی چیز حق دار ہے تو وہ زبان ہے کہ اس کو قید میں رکھا جائے۔

حضرت طاوس بن کیسان رحمۃ اللہ علیہ ایک تابعی اور بڑے مفسر ہیں، تفسیر میں ان کے اقوال نقل کیے جاتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ: میری یہ زبان درندہ ہے، مجھے ڈر ہے کہ اگر اسے کھلا چھوڑوں گا تو وہ مجھے پھاڑ کھائے گا۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الحمدُ للہ رب العالمین، والصلوۃ والسلام علی سید الأنبیاءِ والمرسلین، سیدنا ونبینا وحبیبنا وشفیعنا محمد وآلہ وأصحابہ أجمعین.

زبان کی حفاظت کی اہمیت

محترم حضرات! یہاں (خانقاہ) کے قیام کے دوران جن چیزوں کا اہتمام کرنا ہے، اس میں سب سے اہم یہ ہے کہ ہم اپنی زبان کی حفاظت کا اہتمام کریں۔

حضرت شیخ، سیدی ومولائی، حضرت مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں رمضان میں بڑے بڑے مشایخ بھی حاضری دیتے تھے، حضرت اپنی مجلس میں ہمیشہ ایک بات بڑے اہتمام سے فرماتے تھے، شاید ہی کوئی دن خالی جاتا ہو کہ حضرت نے وہ بات نہ فرمائی ہو، حضرت فرماتے تھے کہ: خوب کھاؤ، خوب سوؤ لیکن باتیں مت کرو۔ بات چیت پر پابندی تھی، وہاں دیکھا کہ ایک صاحب نے جو مالیگاؤں سے آتے تھے، انھوں نے اپنے گلے میں تختی لگا رکھی تھی کہ مجھ سے کوئی بات نہ کریں۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ بولنا آدمی کو بہت ساری برکتوں سے محروم کر دیتا ہے۔

مجاہدے کی حقیقت

حضراتِ صوفیہ نے مجاہدات کی تفصیلات بیان کی ہیں، مجاہدے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کا اپنے اعمال اور اخلاق کو درست کرنے کے لیے اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے احکام کے مطابق اپنی زندگی کو استوار کرنے کے لیے کوشش کرنا اور اس سلسلے میں اپنے

نفس کی مخالفت کرنا۔

ویسے مجاہدے کا لغوی معنیٰ تو صرف ''کوشش'' ہی کا ہوتا ہے، بابِ مفاعلہ کا مصدر ہے، جہاد بھی اسی سے ہے، اس کا معنیٰ بھی کوشش ہے لیکن صوفیہ کی اصطلاح میں خاص طور پر ''نفس کی مخالفت'' کے لیے یہ لفظ بولا جاتا ہے۔

نفس کی فطرت

فطری طور پر نفس کی بناوٹ ہی ایسی ہے کہ وہ آدمی کو خواہشات کی طرف لے جاتا ہے، اس کو لذت چاہیے کہ یہ کام کرو، مزہ آجائے گا، وہ کام کرو، اس میں مزہ آجائے گا، اس سے فارغ نہیں ہوئے کہ تیسری چیز کی طرف متوجہ ہوتا ہے، اس کی کوئی انتہا نہیں ہے، نفس کی خواہشات کبھی ختم ہونے والی نہیں ہیں۔

مغربی معاشرے کی آزادمزاجی اور اس کی خرابیاں

دیکھئے! ہمارے اس دور میں مغربی معاشرے میں انسانی آزادی کا بڑا اہتمام کیا جاتا ہے کہ اس میں کوئی رکاوٹ نہ ہو، کوئی دخل اندازی نہ ہو، آدمی کی پرائیویٹ زندگی میں اس کو آزاد چھوڑ دیا جائے، وہ جس طرح چاہے کرے، رہے، اس کے اوپر کوئی پابندی نہیں ہے، وہ لوگ کسی مذہب، اخلاق اور معاشرے، کسی کی پابندی کے قائل نہیں ہیں، آدمی اپنی پرائیویٹ زندگی میں مختار ہے، آزاد ہے، جس طرح چاہے رہے، چناں چہ ان کے اسی اصول کے پیش نظر ان کے یہاں کوئی کچھ بھی کرتا ہو، اس پر کوئی ٹوکتا نہیں ہے، اس کے جی میں جو آئے، کرتا رہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ وہاں کا معاشرہ

ہر قسم کی برائی میں پھنسا ہوا ہے، اس لیے کہ آدمی کا نفس آدمی کو ہر لمحہ، ہر گھڑی لذات کی طرف آگے بڑھاتا ہے کہ یہ کام کرو، اس میں مزا آئے گا، اس میں لطف آئے گا۔

خواہشات کی کوئی انتہا نہیں

نفس کی ان خواہشات کی کوئی انتہا نہیں ہے، آپ دنیا کے کسی بھی آدمی سے پوچھو کہ تمھارا جی جن چیزوں کو چاہتا تھا، وہ سب حاصل ہوگئیں؟ تو وہ یہی کہے گا کہ نہیں، کوئی ایک آدمی بھی آپ کو نہیں ملے گا جو یہ کہے کہ میری خواہشاتِ نفس پوری ہوگئیں، کیوں کہ ابھی ایک خواہش پوری نہیں ہوئی کہ آپ کو دوسری خواہش کی طرف آگے بڑھایا جاتا ہے اور یہ سلسلہ چلتا ہی رہتا ہے، اس پر آپ کو پابندی تو لگانی ہی پڑے گی۔

نفس کی مخالفت ہی مجاہدہ کی بنیاد ہے

نفس انسان کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی مخالفت ہی کی طرف لے چلتا ہے تو نفس کی مخالفت ہی کو حضراتِ صوفیہ نے مجاہدہ کی بنیاد قرار دیا ہے۔ حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اللہ تبارک وتعالیٰ کو خواب میں دیکھا تو پوچھا: أَيْ رَبِّ كَيْفَ الطَّرِيقُ إِلَيْكَ کہ: اے میرے رب! آپ تک پہنچنے کا راستہ کیا ہے، آپ تک کیسے پہنچا جا سکتا ہے؟ تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اُتْرُكْ نَفْسَكَ وَتَعَالَ: اپنے نفس کو چھوڑ دو اور آجاؤ[۱]۔

---

(۱) امام احمدؒ کا ایسا کوئی واقعہ تو مجھے نہیں ملا، البتہ متعدد کتابوں میں ایسا واقعہ حضرت بایزید بسطامیؒ کے متعلق پایا جاتا ہے، مجموع الفتاوی لابن تیمیة ۱۰/ ۵۱۸؛ الرسالة القشيرية ۲/ ۵٦۲؛ صفة الصفوة ۲/ ۳۰٦؛ إحياء علوم الدين ٤ /۳۷۵ وغیرہ متعدد کتابوں میں اس طرح کا واقعہ حضرت بایزید بسطامیؒ کی طرف منسوب ہے۔

حدیث کی روشنی میں حقیقی عقل منداور بے وقوف

اس لیے نفس کے تقاضوں کو چھوڑیں گے تو اللہ تک رسائی حاصل ہوگی، صوفیا کے یہاں نفس کی مخالفت ہی سارے مجاہدات کی بنیاد ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے: الكَيِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَهُ وَعَمِلَ لِمَا بَعْدَ المَوْتِ، وَالعَاجِزُ مَنْ أَتْبَعَ نَفْسَهُ هَوَاهَا وَتَمَنَّى عَلَى اللَّهِ[1]: ہوشیار اور سمجھ دار تو وہ ہے جو اپنے نفس کو زیر کرے، اس کو قابو میں رکھے، کنٹرول میں رکھے، اس کا محاسبہ کرے، نگرانی کرے اور آخرت کی تیاری میں مشغول رہے اور بے وقوف اور عاجز اور درماندہ ہے وہ آدمی جو اپنے آپ کو اپنے نفس کی خواہشات کے پیچھے چلاتا رہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات سے امیدیں باندھے، تمنائیں کرے، کام تو کرتا ہے نفس کی خواہشات کے مطابق اور اللہ تعالیٰ سے عفو اور درگزر کی تمنا کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تو بڑے غفور اور رحیم ہیں۔

یہ جملہ بڑا خطرناک ہے

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ گناہ کرنے کے بعد اس طرح کا جملہ کہنا واقعہ یہ ہے کہ بڑا خطرناک ہے، آدمی قصداً گناہ کرے اور پھر یہ بات کہے!!۔

بے شک واقعہ یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ غفور رحیم ہیں لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کی صفتِ مغفرت کے لیے بھی ضابطہ اور قانون ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی اس صفت مغفرت سے کس کو فائدہ پہنچے گا؟، ورنہ ایک کافر کفر میں مبتلا ہے، شرک کا ارتکاب کر رہا

---

[1] شعب الإيمان، عَنْ شَدَّادِ بْنِ أَوْسٍ رضی اللہ عنہ، بَابٌ فِي الزُّهْدِ وَقِصَرِ الْأَمَلِ. ر:۱۰۰۶۲

ہے، اس کو آپ ایمان اور اسلام کی دعوت دے رہے ہیں اور وہ آپ کو کہہ دے کہ اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہیں تو اس وقت آپ کیا کہیں گے؟، اس وقت آپ قرآنِ پاک کی یہ آیت پڑھیں گے: ﴿إِنَّ ٱللَّهَ لَا يَغۡفِرُ أَن يُشۡرَكَ بِهِۦ وَيَغۡفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَن يَشَآءُۚ﴾ [النساء۱۱۶]، معلوم ہوا کہ اس میں بھی کوئی تفصیل ہے، مغفرت کے قانون کو جاری کرنے کے لیے بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں ضابطہ ہے۔

انسان نفس کی خواہشات سے کبھی فارغ نہیں ہوسکتا

بہرحال! نفس کی خواہشات کی کوئی انتہا ہی نہیں ہے، وہ تو بس خواہشات کے پیچھے بھاگتا ہی رہتا ہے، اگر آپ یہ سوچیں کہ چلو! آج ہم اس کی خواہش کو پورا کرلیں اور پھر اللہ تعالیٰ کی اطاعت کریں گے تو ایسا ہوگا نہیں، ابھی اس کی خواہش پوری ہوئی نہیں اور ایک خواہش کی لذت اٹھائی کہ فوراً دوسری خواہش کے پیچھے لگائے گا۔

بے چینی معصیت کا ایک خاصہ ہے

دیکھو! اللہ تبارک وتعالیٰ کی نافرمانی میں کبھی سکون نہیں ہوتا، جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں مشغول رہتا ہے، وہ ہمیشہ بے چین رہتا ہے، معصیت کا خاصہ بے چینی ہے اور اطاعت کا خاصہ سکون اور طمانینت ہے،: ﴿أَلَا بِذِكۡرِ ٱللَّهِ تَطۡمَئِنُّ ٱلۡقُلُوبُ ۝٢٨﴾ [الرعد]۔ حقیقی ذکرُ اللہ یہ ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرماں برداری کرے، ذکر کی ایک قسم یہ ہے کہ آدمی زبان سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرے، اللہ، اللہ کرے، تسبیح پڑھے، قرآن شریف کی تلاوت کرے اور صوفیہ کے یہاں ذکرُ اللہ کی حقیقت یہ ہے کہ

آدمی ہر وقت اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرماں برداری میں لگا رہے، اللہ تعالیٰ کی معصیت سے اپنے آپ کو بچائے، یہ حقیقی ذکر ہے۔

ذکر کا مقصد اللہ تعالیٰ کی ذات کا استحضار ہے

اس لیے کہ ذکرُ اللہ کا مقصد اللہ تعالیٰ کی ذات کا استحضار ہے کہ آدمی ہر وقت اللہ تعالیٰ کی ذات کو پیش نظر رکھے اور جب اس کو پیش نظر رکھے گا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ آدمی اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی معصیت سے بچائے گا، اس کے ذہن میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے دیکھ رہے ہیں تو چاہے دن میں ہو، رات میں ہو، تنہائی میں ہو، لوگوں کے سامنے ہو، وہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی معصیت سے بچانے کا پورا اہتمام کرے گا، ذکرُ اللہ کا اصل مقصد یہی ہے، اللہ تعالیٰ کے احکام کو بجالانا، یہ عملی طور پر ذکر اللہ ہے۔

حقیقی ذکر کی ایک مثال سے تفہیم

ایک مثال سے میں آپ کو سمجھاتا ہوں کہ ایک آدمی کا بیٹا کسی باہر ملک میں گیا ہے، وہ روزانہ اپنے باپ کو خط لکھتا ہے کہ آپ کی بہت یاد آتی ہے، میری نیند اڑ گئی ہے، لیکن دو سال سے گیا ہے اور ایک پائی بھی بھیجی نہیں ہے اور دوسرا ہے جو ایک خط بھی لکھتا نہیں ہے لیکن ہر مہینہ پابندی سے دس، بیس ہزار روپے باپ کے لیے بھیجتا ہے۔

اب اگر کوئی اس سے پوچھے کہ آپ کا بیٹا باہر ہے، آپ کو یاد کرتا ہے یا نہیں؟ تو چاہے وہ بیٹا ایک خط بھی نہ لکھتا ہو لیکن دو پیسے بھیجتا ہو تو باپ کہے گا کہ بہت یاد کرتا ہے، بہت خیال رکھتا ہے اور جو روزانہ خط لکھتا ہے کہ آپ بہت یاد آتے ہیں لیکن ایک پائی

بھی نہیں بھیجتا تو اس کے بارے میں باپ کہے گا کہ وہاں جا کر بھول گیا، ارے بھائی! روزانہ خط لکھتا ہے، پھر بھی کہتے ہو کہ بھول گیا؟ دراصل یاد رکھنے کا جو مقصد ہے، وہ حاصل نہیں ہوا، اس لیے یہ ایسا کہتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ذکر اللہ کا مقصد اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرماں برداری ہے، اس لیے آدمی ہر وقت اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرماں برداری میں رکھے اور اسی کے لیے ذکر اللہ کی یہ شکلیں بنائی گئی ہیں اور اگر زبانی ذکر اللہ کی صورت میں یہ چیز حاصل نہ ہو تو معلوم ہوا کہ کچھ کمی ہے، اس کو دور کرنے کی ضرورت ہے۔

تمھارا سب سے بڑا دشمن، تمھارا نفس

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ مجاہدات کا خلاصہ یہی ہے کہ آدمی کا نفس جو آدمی کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے ہٹانے کی کوشش کرتا ہے، دور رکھنے کی کوشش کرتا ہے، اس کے تقاضوں کی، اس کی خواہشات کی مخالفت کی جائے۔

نبیٔ کریم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: أَعْدَى عَدُوِّكَ نَفْسُكَ الَّتِي بَيْنَ جَنْبَيْكَ: تمھارا سب سے بڑا دشمن تمھارا نفس ہے جو تمھارے پہلو میں بیٹھا ہوا ہے[۱]۔

حقیقی مجاہد

نیز حضور ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: الْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهُ: حقیقی معنی میں

---

① کتاب الزهد الكبير للبيهقي، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا، فَصْلٌ فِي تَرْكِ الدُّنْيَا وَمُخَالَفَةِ النَّفْسِ وَالْهَوَى، ر:۳۷۳.

مجاہد، جہاد کرنے والا وہ ہے جو اپنے نفس سے جہاد کرنے والا ہو، اپنے نفس کا مقابلہ کرتا ہو کہ نفس جو اللہ تعالیٰ کی مخالفت کے لیے آمادہ کرتا ہے، اس کی مخالفت کر کے اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرماں برداری کرے[۱]۔

نفس سے جہاد جہادِ اکبر ہے

نبئ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک غزوے سے لوٹ رہے تھے، اس موقع پر نبئ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: رَجَعْنَا مِنَ الْجِهَادِ الأَصْغَرِ إِلَى الْجِهَادِ الأَكْبَرِ[۱] کہ: ہم ایک چھوٹے سے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف لوٹ رہے ہیں کہ دشمنوں سے مقابلہ چھوٹا جہاد ہے اور نفس کا مقابلہ بڑا جہاد ہے، کیوں کہ اس کے ساتھ زندگی بھر کا، ۲۴ر گھنٹوں کا معاملہ ہے۔

مجاہدے کی قسمیں

یہ مجاہدہ انتہائی ضروری ہے، صوفیہ نے اس کی تفصیل بیان کی ہے کہ ایک مجاہدہ تو وہ ہے جو ضروری اور فرض ہے اور دوسرا مجاہدہ وہ ہے جو استحباب کا درجہ رکھتا ہے۔

وہ مجاہدہ جو ضروری اور فرض ہے، وہ یہ ہے کہ آدمی اپنے نفس کے ان تقاضوں کی مخالفت کرے، جن کو پورا کرنے میں گناہوں اور معصیتوں کا ارتکاب ہوتا ہو۔

---

① سنن الترمذی، عَنْ فَضَالَةَ بْنِ عُبَيْدٍ رضي الله عنه، بَابُ مَا جَاءَ فِي فَضْلِ مَنْ مَاتَ مُرَابِطًا، ر:١٦٢١.

① أخرجه البيهقي في الزهد من حديث جابر، وقال: هذا إسناد في ضعف. (إحياء علوم الدين ٣/ ٧، بيان معنى النفس والروح والقلب والعقل وما هو المراد بهذه الأسامي)

آپ کا نفس کہتا ہے کہ عورت جارہی ہے، ذرا اس کو دیکھ لوں، بدنظری کرلوں، مجلس میں بیٹھے ہوئے ہیں، کسی کا تذکرہ چل رہا ہے، اب آپ کا نفس تقاضا کررہا ہے کہ فلانے کا تذکرہ چل رہا ہے تو اس کے متعلق دو باتیں غیبت کی، بہتان تراشی کی کہہ لوں تو یہ بدنظری حرام ہے، غیبت حرام ہے، بہتان تراشی حرام ہے، اس میں نفس کی مخالفت کرنا واجب ہے، یہ مجاہدہ واجب ہے۔

بعض مخالفتیں وہ ہیں جو واجب نہیں بلکہ استحباب کا درجہ رکھتی ہیں، جیسے تقلیل کرنا، صوفیہ نے مجاہدۂ مستحبہ کی چار قسمیں بیان کی ہیں: ایک تو ہے تقلیلِ طعام، دوسرا ہے تقلیلِ منام، تیسرا ہے تقلیلِ کلام اور چوتھا ہے تقلیلِ اختلاط مع الانام۔

قدیم زمانے کے مجاہدوں کا ایک نمونہ

پہلے زمانے میں خانقاہوں کے اندر بڑے مجاہدے کرائے جاتے تھے، کھانا بڑا روکھا، سوکھا، سادہ سا ہوا کرتا تھا۔

ایک بزرگ کے متعلق حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ ہی سے سنا تھا کہ پنجاب میں ایک بزرگ تھے، ان کے یہاں مغرب ہی سے چائے کی دیگ چڑھادی جاتی تھی لیکن دودھ کی نہیں بلکہ خالی پانی کی ہوتی تھی اور آدھی رات تک اس کو پکایا جاتا تھا اور پھر آدھی رات کو اٹھا کر پلائی جاتی تھی اور اس کے بعد عبادت میں مشغول ہوجاتے تھے، اور کھانا پینا کچھ نہیں ہوتا تھا، اس طرح کے مجاہدات ہوتے تھے جس میں کھانا کم کرایا جاتا تھا۔

دورِ حاضر میں قُویٰ کی کمزوری کے سبب مجاہدات میں کمی

ہمارے اکابر کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے، آمین، حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہم جس زمانے میں ہیں، انسانی قویٰ ویسے مضبوط نہیں رہے جو پہلے زمانے کے لوگوں کے تھے، اب لوگ اس طرح کی مشقتوں کو برداشت نہیں کر سکتے، اس لیے مجاہدوں کو کم کر دیا۔

پیٹ بھر کر کھانا ساری بیماریوں کی جڑ ہے

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: ایک درجے میں اس کا خیال کر لینا ہے، ویسے تو پیٹ بھرنا منع نہیں ہے لیکن ساری خرابیاں چاہے جسمانی ہوں یا روحانی، اس کی بنیاد ہی پیٹ کا بھرا ہونا ہے، ساری جسمانی بیماریاں بھی پیٹ بھر کر کھانے سے پیدا ہوتی ہیں اور سارے روحانی نقصانات بھی پیٹ بھر کر کھانے سے پیدا ہوتے ہیں، بھوکے آدمی کو کچھ سوجھتا ہی نہیں، پیٹ بھرے ہوئے آدمی کو ہی اِدھر اُدھر گناہ کے کام سوجھا کرتے ہیں۔

ہمارے اکابر فرماتے ہیں کہ ہم اگر متقدمین کی طرح مجاہدہ کریں گے تو قویٰ کمزور ہونے کی وجہ سے اس کو برداشت نہیں کر پائیں گے، فرض نماز کے لیے کھڑا ہونا بھی ہمارے لیے مشکل ہو جائے گا، اتنا سارا کھاتے ہیں، پھر بھی یہ ساڑھے تین پارے کی تراویح ہم پر کیسی گذرتی ہے، آپ خود جانتے ہیں، تو اگر کھانے میں کمی کریں گے تو ہمارا کیا حال ہوگا! پھر درخواستیں آئیں گی کہ اس میں کچھ تخفیف کریں کہ ہم سے تو کمزوری

کی وجہ سے کھڑا بھی نہیں ہوا جاتا اور وہ لوگ بھوکے رہ کر بھی رات رات بھر کھڑے رہتے تھے۔ اس لیے ہمارے اکابر نے اس سے منع نہیں کیا اور فرمایا کہ کھاؤ، حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ خوب کھاؤ اور خوب کام کرو۔

جب تردد ہو کہ کھاؤں یا نہ کھاؤں، تو کھانا چھوڑ دیجیے

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ بھی فرماتے ہیں کہ ایک درجے میں اس کا خیال کر لینا ہے، کہ اس کی حد بندی کریں کہ جب کھانا کھاویں تو کھاتے کھاتے جب اس مرحلے پر پہنچے -ایک ٹرننگ پوائنٹ بتلا دیا- کہ دل میں اس لقمے کے متعلق یہ خیال آوے کہ اس کو کھاویں یا نہ کھاویں، دل میں تردد پیدا ہو تو اس وقت چھوڑ دیں۔

یہ جو تردد پیدا ہوا، اس کی وجہ یہ ہے کہ عقل اور نفس میں مقابلہ ہوا ہے، کھانے کا جو اصل داعیہ اور رغبت تھی، وہ تو پوری ہو گئی، اس لیے عقل کہتی ہے کہ اب یہ لقمہ کھانے کی ضرورت نہیں ہے لیکن نفس لذت اور خواہش کا طالب ہے، اس کو مزا آ رہا ہے، وہ کہتا ہے کہ ذرا اور کھاؤ، مزا آئے گا، یہ جو نفس اور عقل کا آپس میں مقابلہ ہو رہا ہے، اسی کشمکش کے نتیجے میں اس لقمے کے بارے میں تردد ہوا، اس لیے سمجھ لیجیے کہ اب ضرورت پوری ہو گئی، اس لیے آپ ہاتھ روک لیجیے۔

دورِ حاضر میں وزن گھٹانے کی عجیب دوڑ

آپ جانتے ہیں کہ اس زمانے میں لوگ اپنا وزن گھٹانے کے لیے کیا کچھ نہیں کرتے، ڈائیٹنگ باقاعدہ ایک فیشن بن چکا ہے اور اس کے لیے باقاعدہ ادارے قائم

ہیں، جہاں بڑے بڑے ماہرین اس سلسلے میں اپنی رائیں پیش کرتے ہیں اور لوگ اپنا وزن گھٹانے کے لیے پتہ نہیں کیسی کیسی ترکیبیں اور دوائیں استعمال کرتے ہیں اور بعض لوگ تو ایسی دوائیں استعمال کر کے اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالتے ہیں، مردوں کے مقابلے میں عورتوں کے اندر یہ مرض کچھ زیادہ ہی پایا جاتا ہے۔

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ: میں نے ایک ڈاکٹر کا مضمون پڑھا، اس میں اس نے لکھا تھا کہ اس کے لیے کوئی دوا استعمال کرنے اور کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے، جب کھانے کے لیے بیٹھو اور کھانے کے دوران جب یہ مرحلہ آئے کہ اگلا لقمہ اٹھاؤں یا نہیں تو اس وقت کھانا چھوڑ دو، کسی ڈائیٹنگ کی ضرورت نہیں اور وزن گھٹانے کے لیے نہ کسی مجاہدے کی ضرورت ہے، یہی بات تو حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمائی ہے۔

میں تقلیلِ طعام کے سلسلے میں عرض کر رہا تھا کہ یہ ایک مجاہدہ تھا جو پہلے صوفیہ حضرات کراتے تھے، ہمیں اس کی مناسبت سے صرف اتنا ہی کرنا ہے کہ لطف اندوزی کے لیے پیٹ کو بھرنے کی ضرورت نہیں ہے، ضرورت پوری ہوگئی تو ہاتھ کھینچ لو۔

تقلیلِ طعام اور تقلیلِ منام کو مجاہدات کے ارکان بنانے کی حکمت

دوسرا اصول تقلیلِ منام ہے کہ سونا کم کر دے، یہ کم سونا اور کم کھانا مجاہدات میں سے اس لیے ہے کہ آدمی کے نفس میں بہیمیت اور سبعیت یعنی درندگی کی صفت ہے اور درندے کو رام کرنے کے لیے اور اس کو قابو میں کرنے کے لیے دو طریقے استعمال کیے

جاتے ہیں، اس کو بھوکا بھی رکھا جاتا ہے اور اس کو بیدار بھی رکھا جاتا ہے۔

سرکس میں دیکھا ہوگا کہ شیر، ہاتھی، بھیڑیے اور چیتے وغیرہ کے ذریعہ سے یہ لوگ کھیل کراتے ہیں تو یہ جو سرکس والوں نے ان درندوں کو تابع بنایا اور ان کو ٹریننگ دے کر ٹرینڈ کیا تو ان کو ٹرینڈ کرنے کے لیے یہ دونوں چیزیں اختیار کرتے ہیں، آدمی کی ٹریننگ قبول کرنے کے لیے ان کو دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے، ایک تو ان کو بھوکا رکھا جاتا ہے، کیوں کہ بھوک کے نتیجے میں ان کی قوت ٹوٹتی ہے اور اس کو بیدار بھی رکھا جاتا ہے، اس لیے اس زمانے میں جیلوں میں بھی یہ تدبیر اختیار کی جاتی ہے کہ قیدی سونے نہ پائے، اس کے نتیجے میں وہ قیدی ٹوٹ جاتا ہے۔

موجودہ دور میں ان مجاہدوں کی حد بندی

بہر حال! یہ بھوک اور بیداری دو ایسے مجاہدے ہیں جو نفس کی قوت کو ختم کر دیتے ہیں، اس لیے قدیم زمانے میں صوفیہ کے یہاں اس کا بڑا اہتمام کیا جاتا تھا لیکن ہمارے اکابر نے موجودہ دور میں قُوی کی کمزوری کو دیکھ کر یہ حکم فرمایا کہ اتنی تقلیل نہ ہو جس کی وجہ سے آپ بیمار ہو جائیں، سونے کے معاملے میں بھی اطباء نے جتنی نیند کو ضروری قرار دیا ہے، اتنی نیند حاصل کی جائے۔ ہاں! بلا ضرورت، زائد وقت تک پڑے رہنا اور اپنے آپ کو ”عہدی“ بنا لینا، یہ درست نہیں ہے، بس ضرورت کے بہ قدر نیند پوری کی جائے۔

قلتِ اختلاط مع الانام کی اہمیت

ان کے علاوہ باقی دو مجاہدے ہیں، جن میں سے ایک قلتِ اختلاط مع الانام ہے

یعنی لوگوں کے ساتھ زیادہ تعلقات نہ رکھے جائیں، یہ بڑی اہم چیز ہے، یہی چیز قلب کو فاسد کرنے والی ہے، ہمارے اکابر کے یہاں لوگوں کے ساتھ زیادہ خلط ملط بہت خطرناک چیز سمجھی جاتی رہی ہے، ہاں! کسی موقع پر کسی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے خاطر تعلق قائم کرنے کی ضرورت پیش آئی تو وہ اور بات ہے۔

اللہ تعالیٰ کے واسطے تعلقات رکھنے کی فضیلت اور اہمیت

اللہ تعالیٰ کے لیے رکھا جانے والا تعلق تو بڑی نیکی کا کام ہے اور اس کی وجہ سے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے یہاں بڑا اعزاز ہوگا اور نور کے منبروں پر بٹھایا جائے گا، نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: سات آدمی ہیں جن کو قیامت کے دن عرش کے نیچے جگہ دی جائے گی، ان میں سے دو آدمیوں کے بارے میں فرمایا: وَرَجُلاَنِ تَحَابَّا فِي اللَّهِ اجْتَمَعَا عَلَيْهِ وَتَفَرَّقَا عَلَيْهِ: یعنی جنھوں نے آپس میں ایک دوسرے سے اللہ تعالیٰ کے واسطے محبت کی اور اسی کی نسبت پر جمع ہوئے اور اسی کی نسبت پر علیحدہ ہوئے[۱]۔ اپنی ذات کے لیے کسی سے محبت کرنا تو بڑا خطرناک ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے لیے کسی سے محبت رکھنا، اس کی بڑی فضیلت اور اہمیت ہے۔

اختلاط مع الانام کی ممانعت کی حکمت

لوگوں کے ساتھ تعلقات آدمی کے قلب کو فاسد کرنے والے ہیں، اس لیے کہ

---

① صحيح البخاری، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ، باب مَنْ جَلَسَ فِي المَسْجِدِ يَنْتَظِرُ الصَّلاَةَ وَفَضْلِ المَسَاجِدِ، ر:٦٦٠.

آدمی کا دل اللہ تعالیٰ نے آئینے کی طرح بنایا ہے اور آئینے کے سامنے جب بھی کوئی چیز رکھی جائے گی تو اس کی شکل اس میں نظر آئے گی، اس لیے آپ جتنے لوگوں کے ساتھ ملیں گے، ان سارے لوگوں کا عکس آپ کے دل پر پڑے گا اور ان کے اچھے یا برے اثرات کو بھی دل قبول کرے گا اور یہ اثرات اپنے وقت پر ظاہر ہوں گے، اس لیے ہر کس و ناکس سے ملنے کو ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے۔

اور اس دور میں تو لوگوں کے ساتھ ملنا اور ان کے ساتھ تعلقات قائم کرنا مستقل ایک فن بن گیا ہے، ایک ہنر ہے جس کو پبلک ریلیشن (public relations) کہا جاتا ہے، اس کو باقاعدہ کالج وغیرہ میں سکھایا جاتا ہے کہ آپ لوگوں کے ساتھ کس طرح تعلقات قائم کر سکتے ہیں، ان کو کس طرح آپ اپنا بنائیں گے۔

اللہ کو اپنا بنانے کی فکر کرو

یہ لوگوں کو اپنا بنانے کی کوشش تو کرتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کو اپنا بنانے کی فکر نہیں کرتے، حالاں کہ اللہ تعالیٰ اپنا بن جائے تو پھر تو چوں کہ ساری دنیا اس کے قبضۂ قدرت میں ہے، اس لیے ساری دنیا اپنی مٹھی میں ہے۔

بہر حال! یہ قلت اختلاط مع الانام ہے جس کے بارے میں ہمارے اکابر بڑا اہتمام کرتے ہیں اور اس کا حکم دیتے ہیں۔

قلتِ اختلاط مع الانام میں کوئی رخصت نہیں ہے

دیکھو! آپ کم سوئیں گے تو اس کا اثر جسم پر پڑے گا، ہوسکتا ہے کہ جسم بیمار ہو

جائے، کم کھائیں گے تو اس کا اثر بھی جسم پر پڑے گا لیکن اگر کسی سے ملیں گے نہیں تو اس کی وجہ سے جسم کے کس عضو میں درد ہوگا؟ کون سا سر میں درد ہو جائے گا؟۔

اس لیے ہمارے اکابر فرماتے ہیں کہ: اس میں کمی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اس لیے کہ اس میں کمی کرنے سے کوئی نقصان نہیں ہے، اس میں تو فائدہ ہی فائدہ ہے، اس لیے تعلقات بالکل نہ رکھے جائیں۔

ترکِ تعلقات کے بغیر کوئی بھی بڑا نہیں بنا

جو بھی کام کرنے والے آدمی ہیں، چاہے دنیوی اعتبار سے سائنٹسٹ ہو یا دنیا کے کسی دوسرے شعبے سے متعلق ہو یا دینی اعتبار سے جو حضرات مختلف فنون کے ماہر ہیں، وہ اپنے اپنے فن میں ماہر اسی وقت ہوئے جب انھوں نے لوگوں کے ساتھ ملنے جلنے کا مزاج چھوڑ کر خلوت اور تنہائی کا مزاج بنالیا، جو اچھے مصنفین ہیں، بہترین کام کرنے والے ہیں، وہ سب لوگوں سے کٹ کے، اپنے اپنے مشغلوں میں لگے، ضرورت سے زیادہ کسی سے تعلق نہیں رکھا تو ان کو کامیابی ملی تو ہمیں بھی اپنے مقصد میں کامیابی اسی وقت مل سکتی ہے، جب ہم لوگوں سے ملنا جلنا بالکل کم کر دیں۔

اور خاص کر کے یہاں شیخ کی خدمت میں حاضری دے کر اور خانقاہ میں حاضر ہو کر لوگوں سے تعلقات قائم کرنا، صوفیہ اس کی تو اجازت ہی نہیں دیتے، اگر پہلے سے آپ کا کسی کے ساتھ تعلق ہے، تب تو ٹھیک ہے لیکن یہاں آ کر آپ نے کسی سے تعلق قائم کیا تو یہ تو بڑی خطرناک چیز ہے۔

خانقاہ لوگوں کے ساتھ تعلقات قائم کرنے کے لیے نہیں

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ”آداب الشیخ والمرید“ میں لکھا ہے کہ:
اگر ایک کمرے میں دو آدمی رہتے ہوں تو ان کو بھی آتے جاتے ہوئے سلام کے علاوہ کسی اور گفتگو میں مصروف نہیں رہنا چاہیے۔

یہاں بعض حضرات تو اسی لیے آتے ہیں کہ چلو! وہاں پر دنیا کی مختلف جگہوں سے لوگ آتے ہیں، ان کے ساتھ ہمارے تعلقات قائم ہوں گے اور ان تعلقات سے ہمیں فائدہ پہنچے گا۔ ارے بھائی! یہاں اس لیے نہیں آتے، یہاں تو اس لیے آتے ہیں کہ لوگ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنا تعلق قائم کریں اور شیخ کی صحبت سے فائدہ اٹھائیں، اسی کی ضرورت ہے۔

تصوف کا چوتھا ستون: قلتِ کلام

چوتھی چیز قلتِ کلام ہے یعنی کم بولنا، بہت ساری خرابیاں زیادہ بولنے کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہیں۔

نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے، حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے فرمایا: وَهَلْ يَكُبُّ النَّاسَ فِي النَّارِ عَلَى وُجُوهِهِمْ أَوْ عَلَى مَنَاخِرِهِمْ إِلاَّ حَصَائِدُ أَلْسِنَتِهِمْ کہ: جہنم میں بہت سارے لوگ اپنی زبان کی کھیتیوں ہی کی وجہ سے تو داخل ہوں گے یعنی زبان کی بے احتیاطی کی وجہ سے بے کار بولے گئے کلمات کی وجہ سے جہنم میں جائیں گے [1]۔

زبان اور شرم گاہ کی حفاظت پر جنت کی ضمانت

بلکہ بخاری شریف کی حدیث ہے، نبیٔ کریم ﷺ نے ارشادفرمایا: مَنْ يَضْمَنْ لِي مَا بَيْنَ لَحْيَيْهِ وَمَا بَيْنَ رِجْلَيْهِ أَضْمَنْ لَهُ الجَنَّةَ کہ: جو آدمی مجھے دو اعضا کی گارنٹی دے، ایک تو وہ جو دو جبڑوں کے درمیان میں ہے یعنی زبان اور ایک وہ جو دو ٹانگوں کے درمیان میں ہے یعنی شرم گاہ تو میں اس کو جنت کی ضمانت اور گارنٹی دیتا ہوں [۲]، زبان اور شرم گاہ کی حفاظت پر نبیٔ کریم ﷺ جنت کی گارنٹی عطا فرمارہے ہیں۔

زبان کو قابو میں رکھو

اور واقعہ یہ ہے کہ یہ بڑی اہم چیز ہے، حضور ﷺ نے نجات اور کامیابی کی بنیاد اسی زبان کی حفاظت پر قرار دی ہے، حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے، فرماتے ہیں کہ میں نے حضور ﷺ سے پوچھا: يَا رَسُولَ اللهِ! مَا النَّجَاةُ؟: اے اللہ کے رسول! نجات حاصل کرنے کا، دنیا اور آخرت میں کامیابی حاصل کرنے کا کیا طریقہ ہے؟ جواب میں نبیٔ کریم ﷺ نے تین چیزیں بتلائیں، ان میں سے پہلی چیز ہے: امْلِكْ عَلَيْكَ لِسَانَكَ: اپنی زبان کو قابو میں رکھو [۳]۔

---

(۱) سنن الترمذی، عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، بَابُ مَا جَاءَ فِي حُرْمَةِ الصَّلاَةِ، ر:٢٦١٦.

(۲) صحیح البخاری، عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، بَابُ حِفْظِ اللِّسَانِ، ر: ٦٤٧٤.

(۳) سنن الترمذی، عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، بَابُ مَا جَاءَ فِي حِفْظِ اللِّسَانِ، ر:٢٤٠٦.

زبان اللہ تعالیٰ کی عجیب وغریب نعمت ہے

اور واقعہ یہ ہے کہ زبان اللہ تبارک وتعالیٰ کی بہت ہی بڑی اور عجیب وغریب نعمت ہے، جہاں ذہن میں کوئی خیال آیا کہ بولنا شروع ہوگیا، دونوں کے درمیان ایسا رابطہ اور کانٹکٹ رکھا ہے کہ آگے کوئی اور کام کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی لیکن اتنی بڑی نعمت ہونے کے باوجود اس کی حفاظت کی ضرورت ہے۔

جرم چھوٹا شرارتیں بڑی

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے ''احیاء العلوم'' میں انسان کے مختلف اعضاء سے جو مختلف گناہ صادر ہوتے ہیں، ان کو بیان فرمایا ہے، آنکھوں سے کون کون سے گناہ صادر ہوتے ہیں، کانوں سے کون کون سے گناہ صادر ہوتے ہیں، شرم گاہ سے کون کون سے گناہ صادر ہوتے ہیں، ہر ہر عضو کے گناہوں کی تفصیل بیان فرمائی ہے اور ہر ایک کو الگ الگ عنوان سے بیان فرمایا ہے اور زبان سے صادر ہونے والے گناہوں کی تعداد باقی تمام اعضاء سے صادر ہونے والے گناہوں سے بہت زیادہ ہے، اسی لیے اس کو ایک مستقل کتاب کی شکل دے کر لکھا ہے، ''احیاء'' میں ان کی عادت ہے کہ خطبہ بھی مستقل لکھتے ہیں، اس میں انھوں نے ایک عجیب جملہ لکھا ہے: جِرْمُهُ صَغِيْرٌ وَجُرْمُهُ كَبِيْرٌ کہ: اس زبان کا حجم اور سائز تو چھوٹا ہے لیکن اس کی شرارتیں بہت بڑی ہیں۔

صبح کے وقت تمام اعضا کا زبان کے سامنے گڑگڑانا

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ جب صبح ہوتی ہے تو بدن کے سارے اعضا زبان کے

سامنے گڑگڑاتے ہیں کہ ہمارا معاملہ تیرے ساتھ جڑا ہوا ہے، اگر تو ٹھیک رہے گی تو ہم بھی ٹھیک رہیں گے اور اگر تو اِدھر اُدھر ہوئی تو ہمیں بھگتنا پڑے گا[1]۔ زبان کسی کو گالی دیتی ہے اور مار کھانی پڑتی ہے جسم کو۔

یہ زبان بڑی اہمیت کی حامل ہے، اس کی حفاظت بہت زیادہ ضروری ہے، ہمارے اکابر اس کی حفاظت کی بڑی تاکید فرماتے تھے۔

زبان کی حفاظت کا اہتمام اور ہمارے اسلاف

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ انبیائے کرام کے بعد پوری انسانیت میں سب سے افضل ہیں، ان کے یہاں زبان کی حفاظت کا بڑا اہتمام تھا، مشکوۃ شریف میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنی زبان کو پکڑ کر مروڑ رہے تھے اور اس کی طرف اشارہ کر کے یہ فرما رہے تھے: إِنَّ هَذَا الَّذِي أَوْرَدَنِي الْمَوَارِدَ[2]: اسی نے مجھے ہلاکتوں کے اندر ڈالا ہے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی کے متعلق ان کے حالات میں لکھا ہے کہ آپ ہمیشہ منہ میں کنکر رکھتے تھے؛ تا کہ بلاضرورت بولنے کی نوبت نہ آئے، گویا زبان کو لوک (lock) کر دیتے تھے[3]۔

---

① سنن الترمذی، بَابُ مَا جَاءَ فِي حِفْظِ اللِّسَانِ، ر:۲۴۰۷

② مشکوۃ شریف، باب حفظ اللسان والغیبة والشتم، الفصل الثالث؛ موطأإمام مالك، باب ما جاء فيما يخاف من اللسان.

③ إحياء علوم الدين ۳/ ۱۱۱، كتاب آفات اللسان.

ذرا اندازہ لگاؤ کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جیسا شخص اپنی زبان کی حفاظت کا اتنا اہتمام کرتا ہے کہ وہ اپنے منہ میں کنکر رکھ رہا ہے؛ تا کہ کوئی بات بلا ضرورت زبان سے نہ نکلے تو پھر ہمیں اور آپ کو اپنی زبان کی حفاظت کی کیوں ضرورت پیش نہیں آئے گی؟۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بڑے جلیل القدر صحابی ہیں، فرماتے ہیں: اگر لمبی قید اور جیل کی کوئی چیز حق دار ہے تو وہ زبان ہے کہ اس کو قید میں رکھا جائے[1]۔

حضرت طاوس بن کیسان رحمۃ اللہ علیہ ایک تابعی اور بڑے مفسر ہیں، تفسیر میں ان کے اقوال نقل کیے جاتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ: میری یہ زبان درندہ ہے، مجھے ڈر ہے کہ میں اگر اسے کھلا چھوڑوں گا تو وہ مجھے پھاڑ کھائے گا[1]۔

زبان سے اچھی بات کہو یا خاموش رہو

واقعہ یہ ہے کہ زبان کی حفاظت کا بڑا اہتمام کرنے کی ضرورت ہے، نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالیَوْمِ الآخِرِ فَلْيَقُلْ خَيْرًا أَوْ لِيَصْمُتْ کہ: جو اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو، اس کو چاہیے کہ بھلی بات کہے یا خاموش رہے[1]۔

کفر وشرک اور ایمان واسلام کی بنیاد بھی زبان ہے، ایک آدمی کافر ہے، وہ اپنے ایمان کا اظہار زبان سے کرے گا، ایک مؤمن ہے، اگر زبان سے کفریہ کلمہ کہے گا تو

(۱) إحياء علوم الدين، ۳/ ۱۱۱، كتاب آفات اللسان.

(۱) إحياء علوم الدين، ۳/ ۱۱۱، كتاب آفات اللسان.

(۱) صحيح البخارى، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضي الله عنه، بَابُ إِكْرَامِ الضَّيْفِ إلخ، ر:٦١٣٨.

ایمان سے نکل جائے گا۔

مجلس بازی سے دور رہنے کی ضرورت

زبان بڑی اہمیت کی حامل ہے، اس کی حفاظت بہت ضروری ہے، ہم لوگ اس کی حفاظت کے لیے کیا کریں؟ بات مجاہدے کی چل رہی تھی اور تقلیلِ کلام پر گفتگو ہو رہی تھی، ہم لوگ مجلس بازی کے بڑے شوقین ہیں، ہم لوگوں کو اس سے بہت زیادہ دور رہنے کی ضرورت ہے۔

کسی کے ساتھ بات چیت کرنا کوئی گناہ نہیں ہے لیکن ہمارا مزاج ایسا بنا ہوا ہے، ہم نے بچپن سے اپنے آپ کو ان بے احتیاطیوں کا شکار بنا کر اس بات کا عادی بنا لیا ہے کہ جہاں دو آدمی بیٹھے اور دو منٹ گفتگو ہوئی نہیں کہ غیبت کی یا کسی پر طعن و تشنیع کی یا کسی پر تہمت لگانے کی نوبت آ جائے گی اور گناہ میں مبتلا ہو جائیں گے، اب اس گناہ سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم ایسی مجلسوں سے بچیں۔

دل شکنی یا دین شکنی

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم وہاں مجلس کے اندر بیٹھے تھے اور فلاں کی غیبت ہو رہی تھی، اگر ہم اس کو روکتے تو اس کی دل شکنی ہو جاتی! حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے عجیب جملہ ارشاد فرمایا ہے، کسی کی ''دل شکنی'' کے مقابلے میں اپنی ''دین شکنی'' سے احتراز ضروری ہے، آپ دوسروں کی دل شکنی سے تو بچ رہے ہیں لیکن اپنے دین کو توڑ رہے ہیں! اپنے دین کو ٹوٹنے سے بچانا دوسروں کے دل کو ٹوٹنے سے بچانے سے زیادہ

اہم اور ضروری ہے۔ اور وہ غیبت کرنے والا تو گناہ کررہا ہے، اللہ تعالیٰ کا نافرمان ہے، وہ کہاں اس بات کا حق دار ہے کہ اس کی دل جوئی کی جائے؟ وہ تو دل شکنی کا ہی حق دار ہے، اس کی دل شکنی ہونی ہی چاہیے لیکن ہمارا حال یہ ہے کہ اس کو روکیں گے تو اس کو برا لگ جائے گا، اس کو برا نہیں لگنا چاہیے، چاہے -نعوذ باللہ- اللہ تعالیٰ ناراض ہو جائیں، ہم نے جو یہ مزاج بنا رکھا ہے، اس کی اصلاح ضروری ہے۔

خاموشی سب سے کارگر علاج

زبان کی حفاظت بہت زیادہ ضروری ہے اور اس کا آسان طریقہ یہی ہے کہ ہم کسی کے ساتھ بلا ضرورت بات ہی نہ کریں، خاموش رہیں، خاموشی ہی سب سے کارگر علاج ہے زبان سے صادر ہونے والے گناہوں سے اپنے آپ کو بچانے کا، اس لیے ضروری ہے کہ یہاں رہ کر آپ حضرات فضول گوئی سے بچیں، بات ہی نہ کریں۔

آج صبح سحری کے بعد پتہ نہیں، کون دو آدمی بات کررہے تھے اور ۲۰، ۲۵/ منٹ ہوئے، بات ہی کرتے جارہے ہیں، ارے بھائی! یہ بھی کوئی وقت ہے بات کرنے کا؟ اِس قدر مبارک وقت کو بھی آپس میں فضول بات چیت میں برباد کررہے ہیں، یعنی آدمی جب کسی کام کا عادی ہو جاتا ہے تو یہ بھی نہیں سوچتا کہ میں یہ کام جس وقت کررہا ہوں، کیا اس وقت میں یہ کام کرنا مناسب ہے؟۔

کھیل کے معاملے میں سوچیں بدل گئی ہیں

جیسے کوئی آدمی کھیل کا عادی ہو گیا، لوگ آج کل راتوں کو کھیلتے ہیں، حالاں کہ ہر آدمی

سمجھتا ہے کہ کھیل کے لیے ایک وقت ہوتا ہے کہ عصر کے بعد سے لے کر مغرب تک کے وقت میں کھیلا جائے، کوئی آدمی دن بھر اور رات بھر کھیلوں ہی میں لگا رہے؟ ہم جس زمانے سے گذر رہے ہیں، کھیل کے سلسلے میں یہ ساری فکریں اور ساری سوچ بدل گئی ہیں، دن کو بھی کھیل رہے ہیں، راتوں کو بھی کھیل رہے ہیں، وقت کی کوئی تحدید نہیں رہی۔

فضول گوئی، بابرکت اوقات کے ضیاع کا سبب

اسی کے قبیل سے یہ فضول گوئی کی عادت ہے کہ فضول باتوں کے ہم ایسے عادی بن گئے ہیں کہ اس کے نتیجے میں ہم یہ فضول گوئی کس وقت کررہے ہیں، اس کا بھی احساس نہیں ہے، رات کا یہ مبارک وقت اللہ کے حضور میں رونے کا، اس کے حضور میں گڑگڑانے کا، اللہ تعالیٰ کے سامنے مانگنے کا، اس کی عبادت کرنے کا ہے، ایک معمولی آدمی بھی اس کو سمجھتا ہے لیکن عادت خراب ہونے کے بعد آدمی کو احساس ہی نہیں ہوتا کہ میں یہ گناہ کس مبارک وقت میں کررہا ہوں

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

جیسا معاملہ ہوگیا ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ ہم اپنی ان بری عادتوں کے نتیجے میں جن مصائب میں گرفتار ہوتے ہیں، اس کا اندازہ نہیں ہے، اس لیے زبان کی حفاظت کی طرف توجہ کرنے کی خاص ضرورت ہے۔

لایعنی سے اپنے آپ کو بچائیے، نبیٔ کریم ﷺ کا ارشاد ہے: مِنْ حُسْنِ إِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهُ مَا لَا يَعْنِيهِ کہ: آدمی کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ وہ لایعنی چیزوں کو چھوڑ دے [1]۔ لایعنی یعنی وہ چیزیں جن کا نہ کوئی دینی فائدہ ہو اور نہ کوئی دنیوی فائدہ ہو، ایسی باتیں، ایسے کام، ایسی چیزیں۔

لایعنی چیزوں سے گھر کو سجانے کا جنون

اِس کے اندر چیزیں بھی آجاتی ہیں، ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ متقدمین کے کلام میں تو لایعنی افعال اور لایعنی اقوال کا ہی تذکرہ ہے لیکن ہمارے دور میں اشیا بھی لایعنی کے زمرے میں داخل ہو گئیں، جب کسی کے گھر میں جاتے ہیں تو وہاں بڑا سا مٹکا سا نظر آتا ہے، اس میں پانی وانی نہیں رکھتے، پوچھنے پر بتایا جاتا ہے کہ یہ تو پوٹ ہے جو صرف شو کے لیے ہے، جب ہم اپنے گھروں کا جائزہ لیں گے تو ایسی بے شمار چیزیں نظر آئیں گی کہ جن کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی، آج کل اس شو کے لیے پتہ نہیں کیا کیا چیزیں آدمی جمع کر لیتا ہے، پورا گھر بھرا ہوا ہوتا ہے، ایسی لایعنی چیزوں سے بچنے کی ضرورت ہے۔

ایک فضول جملہ نکل جانے پر سال بھر کے روزوں کی سزا

حضرت حسّان بن ابی سنان رحمۃ اللہ علیہ ایک بزرگ ہیں، تابعی ہیں، ایک مرتبہ جا رہے تھے، ایک مکان پر نظر پڑی، جو نیا نیا بنا تھا، ساتھیوں سے پوچھ لیا کہ یہ مکان کب بنا؟

---

(۱) شعب الإيمان، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضي الله عنه، فَصلٌ فِي فَضْلِ السُّكُوتِ إلخ، ر:٤٦٣٣.

پوچھنے کو تو پوچھ لیا، سوال کے طور پر زبان سے جملہ نکل گیا، فوراً دل میں خیال آیا کہ میں نے فضول اور بے کار سوال کرلیا، پھر خود ہی اپنے نفس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ تو نے بے ضرورت سوال پوچھ لیا، تجھے کیا پڑی ہے کہ یہ مکان کب بنا؟ اب میں تجھے اس کی سزا دوں گا کہ میں سال بھر کے روزے رکھوں گا[1]۔

ان حضرات کا یہ حال تھا، حالاں کہ یہ کوئی گناہ کا جملہ نہیں تھا لیکن اتنے زیادہ محتاط تھے، اپنے اوقات کو ضائع بالکل نہیں کرتے تھے، ان کی نگاہیں تک بلاضرورت کسی چیز پر پڑتیں تو اس پر توبہ وندامت کا اظہار کرتے تھے۔

ایک فضول سوال پر ایک سال تک کمر زمین سے نہ لگانے کی سزا

اسی طرح ایک بزرگ ایک مرتبہ اپنے ایک دوست سے اور وہ بھی اللہ والے تھے، ملاقات کے لیے عصر کے بعد ان کے گھر تشریف لے گئے اور پوچھا کہ: گھر پے ہیں؟ تو گھر والوں نے بتایا کہ سوئے ہوئے ہیں، یہ سن کر ان کی زبان سے یہ نکل گیا کہ یہ کوئی سونے کا وقت ہے! یہ کہہ کر واپس لوٹے۔

اب چوں کہ بڑے آدمی تھے، اس لیے گھر والوں نے سوچا کہ اتنے بڑے آدمی آئے اور ہم نے ان کو یہ جواب دے دیا!، اس لیے ان کے پیچھے آدمی بھیجا کہ اگر آپ کہیں تو ان کو اٹھا دیں۔

وہ آدمی بڑی دیر کے بعد گھر آیا اور گھر والوں کو بتلایا کہ انھوں نے تو میری بات

---

(۱) إحیاء علوم الدین، ٤/ ٤٠٦، المقام الأول من المرابطة: المشارطة.

سننے کی خود کو مہلت ہی نہیں دی، وہ تو اپنے نفس کو ملامت کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ: تجھے کیا معلوم کہ یہ سونے کا وقت ہے یا نہیں؟ تجھے کیا پتہ؟ کوئی بیمار ہو، تھکا ہوا ہو، پریشان ہو، اس کی وجہ سے سویا ہوا ہو، یہی کہتے جا رہے تھے اور کہتے کہتے قبرستان پہنچے اور وہاں پہونچ کر اپنے نفس سے کہا کہ: اب ایک سال تک میں اپنی کمر زمین سے نہیں لگاؤں گا یعنی سوؤں گا نہیں، الّا یہ کہ بیمار ہو جاؤں۔

ایک جملہ اس طرح کا نکالنے پر اپنے آپ کو یہ سزا دے رہے ہیں اور ہماری زبان سے تو پتہ نہیں، اس طرح کے سینکڑوں جملے روزانہ نکلتے رہتے ہیں اور ہمیں اس کا احساس نہیں ہوتا، حقیقت یہ ہے کہ ایسی باتیں اور ایسے فضول جملے بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔

فضول کلام کی ظلمتیں

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک تو ہے ضرورت سے بولنا، ایک سبزی فروش ہے، سبزی بیچنے والا، سبزی بیچنا اس کا پیشہ ہے تو وہ صبح سے شام تک بولتا جاتا ہے کہ ”لے لو سبزی، لے لو سبزی“، وہ اس جملے کو ہزار مرتبہ بولے گا تو اس میں اس کا کوئی نقصان نہیں ہے، اس لیے کہ یہ اس کی تجارت ہے، اس کا کام ہے لیکن ایک دوسرا آدمی ہے، جس کا یہ کام نہیں ہے، اس کو بولنے کی ضرورت نہیں ہے، وہ اگر یہ جملہ ایک مرتبہ بھی بولے گا تو یہ غیر ضروری جملہ بولنے کی وجہ سے اس کے دل پر جو ظلمت آئے گی، اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے، فضول کلام کی وجہ سے قلب پر بڑی ظلمت آتی ہے، چاہے وہ جائز

کلام ہو لیکن فضول ہے، دینی اور دنیوی اعتبار سے اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے تو اس کی وجہ سے دل پر بڑی ظلمتیں آتی ہیں۔

حضرت ربیع بن خیثمؒ کا مقام اور حفاظتِ زبان کا اہتمام

حضرت ربیع بن خیثم رحمۃ اللہ علیہ ایک جلیل القدر تابعی ہیں، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے شاگردوں میں بڑا اونچا مقام رکھتے تھے، یہی وجہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ان سے بڑی محبت فرماتے تھے، جب وہ مجلس میں آتے تھے تو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ان کو اپنے قریب بٹھلاتے تھے اور ان سے گفتگو کرتے رہتے تھے، کسی اور کو آنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی، بڑے زاہد اور متورع تھے اور جب حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ان کو دیکھتے تھے تو یوں کہا کرتے تھے: لَوْ رَآكَ رَسُولُ اللّٰہِ ﷺ لَأَحَبَّكَ [1]: اللہ کے رسول اگر تمھیں دیکھتے تو تم سے محبت کرتے۔

ان کے حالات میں لکھا ہے کہ: بیس سال تک کبھی اپنی زبان سے دنیا کی کوئی بات نہیں نکالی [2]، ان کا معمول تھا کہ جب صبح کو بیٹھتے تھے تو باقاعدہ قلم، کاغذ اور دوات لے کر بیٹھتے تھے، جب کوئی بات زبان سے نکالی تو اس کو لکھ لیتے تھے، شام کو بیٹھ کر سب دیکھ کر اپنا محاسبہ کرتے تھے کہ آج جو کچھ بولا گیا ہے، اس میں کوئی بے جا، بلاضرورت بات تو میری زبان سے نہیں نکلی؟! الغرض کبھی کسی بے کار اور لایعنی بات کبھی اپنی زبان سے نہیں نکالی یعنی ایسی بات جس میں نہ دنیا کا فائدہ ہو، نہ دین کا فائدہ ہو۔

---

(۱)(۲) سیر أعلام النبلاء، ۷/ ۲۸۹.

حضرت منصور بن معتمرؒ کا معمول

حضرت منصور بن معتمر رحمۃ اللہ علیہ بڑے محدّث ہیں، بخاری کے راویوں میں سے ہیں، ان کا بار بار نام آتا ہے، انھوں نے چالیس سال تک عشاء کے بعد کسی کے ساتھ بات چیت نہیں کی۔ یہ حضرات اپنی زبان کی حفاظت کا اتنا زیادہ اہتمام کیا کرتے تھے کہ ایک بھی غیر ضروری جملہ اپنی زبان سے نہیں نکالتے تھے؛ بلکہ غیر ضروری نظر سے بھی اپنے آپ کو بچاتے تھے۔

بیس سال سے گھر کی چھت نہیں دیکھی

ایک بزرگ ہیں حضرت داودِ طائی رحمۃ اللہ علیہ، ان کی خدمت میں ایک آدمی حاضر ہوا، گھر میں داخل ہوا، اوپر کی طرف دیکھا تو چھت میں جو کڑیاں لگی ہوئی ہوتی ہیں، ان میں سے ایک کڑی ٹوٹی ہوئی تھی، وہ آدمی کہنے لگا کہ: حضرت! آپ کے کمرے کی چھت کی یہ کڑی ٹوٹی ہوئی ہے تو حضرت داودِ طائی رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا کہ بیس سال ہو گئے، میں نے اوپر چھت کی طرف دیکھا ہی نہیں۔ ان کو چھت کی طرف دیکھنے کی فرصت نہیں اور ہمارا تو کام ہی یہ ہے، ہمیں تو اس کے بغیر مزا ہی نہیں آتا، اِدھر اُدھر دیکھے بغیر سکون اور چین ہی نہیں آتا۔

حقیقت یہ ہے کہ جب تک ان فضول چیزوں سے اپنے آپ کو بچانے کی عادت نہیں ڈالو گے، وہاں تک اِس ماحول سے جو فائدہ ملنا چاہیے، وہ نہیں ملے گا، یعنی آپ یہاں تلاوت کریں گے، تسبیحات پڑھیں گے، ذکر کریں گے، دوسری عبادات انجام

دیں گے، ان ساری چیزوں کا فائدہ آپ کو اس وقت حاصل ہوگا، جب آپ اپنے آپ کو ان فضول چیزوں سے بچائیں گے۔

عبادتوں میں نور نظر نہ آنے کی وجہ

حضرت مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

چشم بند و گوش بند و لب ببند		گر نہ بینی نورِ حق بر من بخند

آنکھ بند کرو یعنی ناجائز چیزوں کو مت دیکھو، غیر ضروری چیزوں کو مت دیکھو، کان بند کرو، یعنی ناجائز باتیں مت سنو اور ہونٹوں کو بند کرو، یعنی غیر ضروری باتوں کو اپنی زبان سے مت نکالو، اگر اس کے بعد بھی اللہ کا نور اپنے دل میں نظر نہ آئے تو مجھ پر ہنس لیجیے گا۔

ہماری عبادتوں میں جو نور نظر نہیں آتا، اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ جن چیزوں سے ہمیں احتیاط کرنی چاہیے، ان سے احتیاط نہیں کرتے۔

حضرت مولانا شاہ ابرار الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ مثال کے طور پر فرمایا کرتے تھے کہ: بھائی! آپ نے اپنے کمرے کے اندر ''اے سی'' (A/C) چلا دیا اور ایر کنڈیشن کی خاصیت یہ ہے کہ وہ کمرے کو ٹھنڈا کرے گی لیکن اگر آپ نے دروازے اور کھڑکیاں کھلے چھوڑ دیے، بند نہیں کیے، تو ''اے سی'' سے نکلنے والی ٹھنڈک آپ کے کمرے کو ٹھنڈا نہیں کرے گی، ۲۴ر گھنٹے بھی ایر کنڈیشن چلتا رہے گا تو بھی آپ کا کمرہ ٹھنڈا ہونے والا نہیں ہے، دروازوں اور کھڑکیوں کے ذریعہ باہر سے جو گرمی آرہی ہے، وہ کمرے کو کبھی بھی ٹھنڈا ہونے نہیں دے گی۔ آپ ''اے سی'' کی ٹھنڈک چاہتے ہیں تو

ضروری ہے کہ پہلے کمرے کے دروازے اور کھڑکیاں بند کرو، ایک سوراخ بھی باقی نہیں رہنا چاہیے، جہاں سے باہر کی گرم ہوا آسکے، تب کمرہ ٹھنڈا ہوگا۔

اسی طرح ہم عبادات کے ساتھ ساتھ گناہ کیے چلے جا رہے ہیں، گناہوں کے دروازے اور کھڑکیاں کھلے ہوئے ہیں، چوپٹ ہیں، آنکھیں اپنا کام کر رہی ہیں، کان اپنا کام کر رہے ہیں، زبان اپنا کام کر رہی ہے، سارے گناہ سرزد ہو رہے ہیں، کوئی گناہ ایسا نہیں جو ہم نہیں کرتے، اس کے ساتھ تہجد بھی پڑھ رہے ہیں، تلاوت بھی کر رہے ہیں، تسبیحات کا سلسلہ بھی جاری ہے تو ان عبادتوں سے جو فائدہ ہونا چاہیے، وہ ہمیں کیسے حاصل ہوگا، اس سے کبھی بھی اللہ کا قرب حاصل نہیں ہوگا۔

بغیر پرہیز کے کوئی دوا کارگر نہیں ہوتی

یہاں آکر اس ماحول میں رہ کر بھی فائدہ اسی وقت حاصل ہوسکتا ہے، جب کہ ہم ان اعضا کی حفاظت کے عادی بنیں، پرہیز کے بغیر کوئی بھی دوا اور غذا آدمی کو فائدہ نہیں پہنچا سکتی، اس لیے بھائی! یہاں رہتے ہوئے اپنی زبان کی حفاظت کا خاص اہتمام کریں، آپ کی کوشش یہ ہو کہ کسی کے ساتھ بھی بات کرنے کی نوبت نہ آئے، اگر کوئی ضروری چیز ہے تو بات کرلیں۔

رب راضی تو سب راضی

اس کے علاوہ اپنی زبان سے کوئی بات نہ نکالیں، کوئی کیسا بھی ہو، یہ نہ سوچیں کہ اس سے بات نہیں کریں گے تو اس کو برا لگے گا، اس کو کیوں برا لگے گا؟ آپ اس کو کونسا

نقصان پہنچارہے ہیں کہ اس کو برا لگے،لوگوں کی ناراضگی کی تو پرواہ ہے لیکن اللہ تعالیٰ اپنی نافرمانی کی وجہ سے ہم سے ناراض ہوں گے، اس کی کوئی پروانہیں ہے! یہ تو شرعی معاملہ ہے، اس لیے اس کی ناراضگی کی پرواہ کرر ہے ہیں، اگر دنیا کا کوئی نقصان ہورہا ہے تو وہاں چاہے، اس کو برا لگے، یا اس کے باپ کو برا لگے، وہاں ہم اور آپ اس کی پرواہ نہیں کرتے۔

دین کے معاملے میں کمزور اور دنیا کے معاملے میں شیر

شادی کی تقریبات میں بیان کرنے کی نوبت آتی ہے اور جب وہاں جو رسمیں ہوتی ہیں، ان کے بارے میں کہتے ہیں تو بعض لوگ کہتے ہیں کہ عورتیں نہیں مانتیں، میں ان سے کہتا ہوں کہ اگر تمھاری عورتیں کل کو اگر تمھاری تجارت کے معاملے میں دخل دیں اور کہیں کہ: تم لوگ دکان میں ایسا کرتے ہو، ایسا مت کرو، ایسا کرو تو دوطمانچے مار کر کہو گے کہ: ’’جاؤ! اپنا کام کرو، میری دکان کے معاملے میں دخل اندازی مت کرو‘‘۔ یہاں دنیا کے معاملے میں دخل اندازی کرنے پر طمانچے مارنے کی طاقت ہے اور دین کے معاملے میں یہ طاقت نہیں دکھاتے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ ہمارے نفس کا دھوکا ہے، ہمارا یہ سوچنا کہ اس سے بات نہیں کریں گے تو اس کو برا لگ جائے گا، یہ نفس کا دھوکا ہے، کسی کو برا لگے تو لگے، ہم تو اس کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتے، ہم نے تو اپنی ذات کو شر اور فتنہ سے بچانے کے لیے یہ کام کیا ہے۔

گناہ کو بھی گناہ نہیں سمجھتے

بہرحال! یہ ضروری ہے کہ ہم اپنی زبان کی حفاظت کریں، یہ بہت اہم ہے، زبان کی حفاظت بنیاد ہے۔ لوگ آنکھ کی بے احتیاطی کو گناہ سمجھتے بھی ہیں لیکن ہم جس دور سے گذر رہے ہیں، زبان کی بے احتیاطی کو تو اہلِ علم بھی گناہ نہیں سمجھتے، غیبت چل رہی ہے لیکن کوئی پروا نہیں ہے، اس سے بہت زیادہ بچنے کی ضرورت ہے۔ اسی لیے ہمارے شیخ رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ: آؤ، یہاں کھاؤ، پیو، اپنا کام کرو، کسی کے ساتھ بات مت کرو۔

تو آپ یہ بات ذہن نشین کرلیں کہ ہمیں کسی کے ساتھ بھی بات نہیں کرنی ہے، اللہ تعالیٰ مجھے بھی اور آپ کو بھی عمل کی توفیق نصیب فرماوے، آمین۔ بہت سے لوگ یہ کوشش کرتے ہیں کہ مجھے آپ سے ملاقات کرنا ہے، ملنا ہے۔ بھائی! یہاں ملاقات کے لیے نہیں آئے ہیں، یہاں تو اس ماحول میں رہ کر کام کرنے کے لیے آئے ہیں۔

آج کل کے مریدین کا حال

یہاں آنے کے بعد بھی نفس آدمی کو شرارت پر آمادہ کرتا ہے، نہ خود عمل کرتا ہے اور نہ دوسروں کو کرنے دیتا ہے، حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے اجل خلفاء میں سے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ: آج کل تو مریدین ایسے ہو گئے ہیں جو شیخ کو اپنے معمولات پورا کرنے نہیں دیتے، خود تو کیا اونچے بنتے ان کو بھی ان کے مقام سے نیچا گرانے کی کوشش کرتے ہیں، یہ حال ہو گیا ہے کہ نہ تو خود کچھ کرتے ہیں، نہ ہم کو کچھ کرنے دیتے ہیں۔

ارے بھائی! اپنے کام کے اندر مشغول رہو، ہم یہاں اسی لیے آئے ہیں، اگر کوئی اہم بات پوچھنی ہو تو خط لکھ کر پوچھ لینا، یوں تو سال بھر میں اپنے شیخ کو خط لکھنے کی نوبت آتی نہیں کہ مجھے یہ ہو رہا ہے، میرے لیے اس کا علاج تجویز کیجیے اور یہاں آ کر ایسی حرکتیں کر رہے ہیں۔

اور پھر مشورے کے نام سے بھی مطالبے ہوتے ہیں، ہم نے یہ سلسلہ جاری کر کے دیکھا تو اس میں بھی ۸۰ ؍فی صد یہ شکایتیں ہوتی تھیں کہ مجھے یہ ہو رہا ہے، میرے لیے دعا کرو۔ دعا سے انکار نہیں ہے لیکن اس طرح اپنے اوقات کے ساتھ ساتھ دوسروں کے اوقات کو بھی ضائع کرنا مناسب نہیں ہے، یہ کوئی دانش مندی کی بات نہیں ہے، اپنا کام کرتے رہو۔

حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ: یہ تو چمگاڈروں کی مہمانی ہے کہ آؤ اور لٹک جاؤ، اس میں ملاقات اور بات چیت کی ضرورت نہیں ہے، آپ اپنا کام کرو، میں اپنا کام کر رہا ہوں۔

شیخ کی توجہ کا مطلب

جہاں تک توجہ کا سوال ہے تو آپ پر توجہ ہے، آپ کے لیے دعائیں کر رہے ہیں اور توجہ ہے اسی لیے تو یہ باتیں کر رہا ہوں، اب اور کون سی توجہ چاہیے؟ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ ہمیں دو پانچ منٹ اپنے سامنے بٹھا کر باتیں کر لیں، یہ توجہ ہے، ارے بھائی! اس کا نام توجہ نہیں ہے۔

یہاں آپ اپنے اوقات عبادتوں میں گذاریں، مجھے یاد ہے کہ جب ہم سہارنپور جاتے تو بس اس وقت ایک مرتبہ ملاقات کرتے بلکہ کبھی تو اس کی بھی نوبت نہیں آتی اور اس سے کچھ برا بھی محسوس نہیں ہوتا تھا، اور واپسی کا جب وقت ہوتا اور مصافحہ کا موقع ہوتا تو کر لیتے تھے، ورنہ وہ بھی نہیں کرتے تھے؛ کیوں کہ سو مرتبہ مصافحہ کرو اور ان کی بات پر عمل نہ کرو تو کوئی فائدہ نہیں اور اگر آپ ایک بھی مصافحہ نہ کریں اور ان کی باتوں پر عمل کریں تو فائدہ ہوگا۔

جسمانی قرب اصل مقصود نہیں ہے

حقیقت یہ ہے کہ یہ مصافحے اور باتیں یہ سب دھوکا ہے، ہمارے دوست حضرت مولانا ابرار الحق صاحب دھولیوی رحمۃ اللہ علیہ ہمیشہ حضرت مولانا وصی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ نقل کیا کرتے تھے کہ حضرت فرمایا کرتے تھے کہ: بدن پر گرو یعنی آج کل لوگوں کا مزاج یہ بنا ہوا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ مجھے آپ کے پاس آکر بیٹھنے دیجیے کہ میں آپ کے پاؤں دباؤں۔ ارے بھائی! مجھے پاؤں نہیں دبوانے، تم اپنا کام کرو، اپنے اعمال درست کرو، تمھیں جو کام سونپا گیا ہے، اس کو پورا کرو۔

اصل مقصد شیخ کی باتوں پر عمل کرنا ہے

صحیح یہ ہے کہ اگر اس طرح سال بھر تک میرے پاؤں دباتے رہیں گے اور جو کام آپ کو سونپا گیا ہے، وہ نہیں کریں گے تو کوئی فائدہ نہیں ہونے والا ہے اور ایک مرتبہ بھی آپ میرے پاس آکر نہیں بیٹھیں گے، لیکن آپ سے جو دو باتیں کہی جارہی

ہیں، جو ہدایتیں آپ کو دی جارہی ہیں، اس پر عمل کریں گے تو ان شاء اللہ آپ کی دنیا بھی سنورے گی اور آخرت بھی سنورے گی۔

یاد رکھیے! یہ جسمانی قرب اہمیت نہیں رکھتا، آپ دیکھیں گے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ دس سال تک حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت کرتے رہے اور ہر وقت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس ان کا آنا جانا تھا لیکن اس کی وجہ سے ان کا مقام اونچا نہیں ہوا، مقام تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا بلند ہوا، حضرت انس رضی اللہ عنہ کا وہ مقام نہیں جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ہے، یہ جسمانی قرب کوئی معنی نہیں رکھتا، کبھی موقع ہو تو انکار نہیں ہے لیکن اسی کے لیے مرتے رہنا اور اسی کی کوشش میں لگے رہنا اور یہ چیز حاصل نہ ہو تو پریشان ہونا، غمگین ہونا کہ ہم کو تو موقع نہیں ملتا اور مصافحہ بھی نہیں کر سکا، یہ سب غلط ہے۔

اپنے کام میں لگنے کے مزاج سے ہی کایا پلٹ ہوگی

اپنے کام میں ایسے لگو کہ کون کیا کرتا ہے، اس کی کوئی پرواہی نہ ہو۔ فلانے کو فلانے نے دسترخوان پر بٹھایا، فلانے کو بلایا، فلانے کو یہ چیز دی، بعض لوگوں کا یہ مزاج ہوتا ہے، بس دیکھتے ہی رہتے ہیں۔ گویا اسی کے لیے آئے ہیں، یہ تجسس کرنے کے لیے آئے ہیں؟ اپنی فکر کرو۔

ہمیں ابھی تک یاد ہے کہ جب ہم ہمارے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ہوتے تھے تو آپ کے پاس کب کون آیا اور کس کو کیا دیا، کبھی اس کی طرف نہ توجہ کی اور نہ کبھی اس کی پروا کی، اپنے کام میں لگے رہتے۔ جب تک یہ مزاج نہیں بنے گا، وہاں

تک فائدہ ہونے والا نہیں ہے۔ یہاں آ کر بھی بعض لوگوں کا مزاج یہی ہوتا ہے کہ مجھے فلاں جگہ نہیں بٹھلایا، مجھے یہ چیز نہیں کھلائی؟ ارے بھائی! آپ یہاں کھانے کے لیے آئے ہیں؟ کھانا تو آپ کے گھر پر اس سے بھی بہتر اور زیادہ عمدہ ملتا ہے، اگر یہی مقصود تھا تو اپنا گھر کیوں چھوڑا؟ مجھے اس جگہ بستر نہیں دیا، پہلی صف میں جگہ نہیں ملی، ارے بھائی! کہیں پر بھی جگہ ملی ہو، آپ ہیں یہیں تو نا۔

بھائی! ان باتوں میں مت پڑو، اپنا کام کرو، جتنا جی لگا کر کام کروگے، اتنا اپنی حیثیت کے مطابق لے کر کے جاؤگے۔

محبت لے کر آؤ گے تو فائدہ اٹھا کر جاؤ گے

بزرگوں کا مقولہ ہے کہ: جو لے کر آئے گا، لے کر جائے گا اور جو خالی ہاتھ آئے گا، خالی ہاتھ جائے گا۔ جو دنیا دار مشائخ ہیں، انھوں نے تو اس کا مطلب یہ نکالا کہ جو کوئی ہدیہ لے کر آئے گا، وہ فیض لے کر جائے گا۔ لیکن اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ جو عقیدت اور محبت لے کر آئے گا، وہ فائدہ اٹھا کر جائے گا، عقیدت اور محبت پر بنیاد ہے، آپ دلوں میں اعتراض لے کر سال بھر بھی رہیں گے تو ذرہ برابر بھی فائدہ نہیں ہوگا اور محبت اور عقیدت کے ساتھ ایک مہینہ یا دس دن بھی آئیں گے تو ضرور فائدہ ہوگا، اس کو دھیان میں رکھیے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس پر عمل کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

اتباعِ سنت کا مقام و مرتبہ

اور

اکابر کا عاشقانہ طرزِ عمل

اقتباس

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قبیلے والے جو اُن کو لینے کے لیے آئے تھے اور ان کا ساتھ دے رہے تھے، انھوں نے دیکھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی لنگی آدھی پنڈلی تک ہے تو انھوں نے ان کو ٹوکا اور کہا کہ دیکھو عثمان! تم مکۂ مکرمہ کے بڑے بڑے چودھریوں اور سرداروں سے ملنے کے لیے اور بات کرنے کے لیے جا رہے ہو اور وہاں کا فیشن یہ ہے، ان کے یہاں لنگی کو اوپر رکھنا ذلت کی چیز ہے، اور تمھاری لنگی آدھی پنڈلی تک ہے اور وہ ایسے آدمی کو جس کی لنگی اس طرح آدھی پنڈلی پر ہو بہت حقیر اور معمولی سمجھتے ہیں؛ اس لیے تم بھی اپنی لنگی ذرا نیچی کر دو کہ زمین کے ساتھ گھسٹنے لگے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جواب میں کیا کہا؟ فرمایا: هَكَذَا إِزْرَةُ صَاحِبِنَا: میرے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی لنگی باندھنے کا انداز اور اسٹائل یہی ہے، یعنی آدھی پنڈلی تک، نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی لنگی بھی اسی طرح ہوتی ہے، میں اپنی لنگی کو اس سے ذرا بھی ہٹا سکتا نہیں۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

الحمدللّٰه نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ باللّٰه من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا، ونعوذ باللّٰه من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا، ونعوذ باللّٰه من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا، من يهده اللّٰه فلامضل له، ومن يضلله فلا هادي له، ونشهد أن لا إلٰه إلا اللّٰه وحده لاشريك له، ونشهد أن سيدنا ومولانا محمداً عبده ورسوله، أرسله إلىٰ كافّة الناس بشيراً ونذيراً، وداعياً إلى اللّٰه بإذنه وسراجاً منيراً، صلّى اللّٰه تعالىٰ عليه وعلىٰ آله وأصحابه وبارك وسلّم تسليماً كثيراً كثيراً.

أمابعد: فَأَعُوْذُ بِاللّٰه مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ: ﴿قُلۡ إِن كُنتُمۡ تُحِبُّونَ ٱللَّهَ فَٱتَّبِعُونِي يُحۡبِبۡكُمُ ٱللَّهُ وَيَغۡفِرۡ لَكُمۡ ذُنُوبَكُمۡۚ﴾ [آل عمران ٣١]

وقال تعالىٰ: ﴿لَّقَدۡ كَانَ لَكُمۡ فِي رَسُولِ ٱللَّهِ أُسۡوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ [الأحزاب ٢١]

وقال النبى ﷺ: من حفظ سنتى أكرمه اللّٰه بأربع خصال المحبة فى قلوب البررة، والهيبة فى قلوب الفجرة، والسعة فى الرزق، والثقة بالدين①.

وقال النبى ﷺ: مَنْ تَمَسَّكَ بِسُنَّتِي عِنْدَ فَسَادِ أُمَّتِي فَلَهُ أَجْرُ مِائَةِ شَهِيدٍ②.

وقال النبى ﷺ: مَنْ أَكَلَ طَيِّبًا، وَعَمِلَ فِي سُنَّةٍ، وَأَمِنَ النَّاسُ بَوَائِقَهُ دَخَلَ الجَنَّةَ③.

① تفسير روح البيان ٢/ ٢٣١، تحت الآية: وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ الآية.
② الترغيب والترهيب للمنذرى، التَّرْغِيب فِي الْإِخْلَاص والصدق، ر:٦٥.
③ سنن الترمذى، عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الخُدْرِيِّ رضي الله عنه، أَبْوَابُ صِفَةِ الْقِيَامَةِ، ر:٢٥٢٠.

وقال النبی ﷺ لِخَادِمِهِ أَنَسٍ رضی اللہ عنہ: يَا بُنَيَّ! إِنْ قَدَرْتَ أَنْ تُصْبِحَ وَتُمْسِيَ لَيْسَ فِي قَلْبِكَ غِشٌّ لأَحَدٍ فَافْعَلْ، ثُمَّ قَالَ لِي: يَا بُنَيَّ! وَذَلِكَ مِنْ سُنَّتِي، وَمَنْ أَحَبَّ سُنَّتِي فَقَدْ أَحَبَّنِي وَمَنْ أَحَبَّنِي كَانَ مَعِي فِي الجَنَّةِ ④.

أو كما قال عليه الصلوة والسلام.

حضور ﷺ کی ذات ہمارے لیے نمونہ

میرے قابلِ احترام بھائیو! اللہ تبارک وتعالیٰ نے نبیٔ کریم ﷺ کو اسی لیے مبعوث فرمایا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ پوری انسانیت کو یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ زندگی گذارنے کا کون سا طریقہ اللہ تبارک وتعالیٰ کو پسند ہے، جسے اختیار کرنا چاہیے اور اس کے مطابق زندگی گذارنی چاہیے۔

چناں چہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿لَّقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ ٱللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ تمھارے لیے نبیٔ کریم ﷺ کی ذاتِ بابرکات میں بہترین نمونہ موجود ہے، گویا اللہ تبارک وتعالیٰ نے زندگی کے ہر شعبے سے متعلق ہمیں نبیٔ کریم ﷺ کی ذاتِ برکات کے ذریعہ سے نمونہ عطا فرمایا کہ ہم اپنی زندگی کے ہر شعبے کو حضورِ اکرم ﷺ کے طریقے کے مطابق استوار کرنے کا اہتمام کریں۔

نمونہ ہونے کی ایک مثال سے تفہیم

آپ کوئی نیا کپڑا خرید کر لاویں اور پھر درزی کے پاس لے جا کر اس کو حوالے

---

④ سنن الترمذی، أَبْوَابُ الْعِلْمِ، بَابُ مَا جَاءَ فِي الأَخْذِ بِالسُّنَّةِ وَاجْتِنَابِ البِدَعِ، ر:۲۶۷۸.

کرتے ہوئے اپنا ایک اور پرانا کرتہ اس کو دیں اور کہیں کہ اس پرانے کرتے کے مطابق یہ نیا کرتہ سینا، اس کے بعد اس سے اس کرتے کو سینے کی اجرت پوچھی، اس نے جو اجرت بتائی، آپ نے اس کی بتائی ہوئی اجرت دینے پر آمادگی ظاہر کی، اب اگر وہ درزی اس میں ذرہ برابر بھی کمی کرے گا تو آپ اس کو اس کی اجرت اور محنتانہ تو کیا دیں گے، آپ جو نیا کپڑا لائے تھے، اس کی قیمت اس سے وصول کریں گے، ہم ذرہ برابر بھی فرق کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں گے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے نبیٔ کریم ﷺ کے ذریعہ سے ہمیں زندگی گذارنے کا ایک طریقہ عطا فرمایا ہے، ہم کو چاہیے کہ ہم اپنی زندگیوں کو نبیٔ کریم ﷺ کے طریقہ کے مطابق بنانے کا اہتمام کریں۔

”فَٱتَّبِعُونِي“ کا انوکھا ترجمہ

بلکہ قرآنِ پاک میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کو اپنی محبت کی شرط قرار دیا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿قُلۡ إِن كُنتُمۡ تُحِبُّونَ ٱللَّهَ فَٱتَّبِعُونِي يُحۡبِبۡكُمُ ٱللَّهُ وَيَغۡفِرۡ لَكُمۡ ذُنُوبَكُمۡۚ﴾: اے نبی! آپ ان لوگوں سے کہہ دیجیے کہ اگر تم اللہ تبارک وتعالیٰ سے محبت کرتے ہو تو میرا اتباع کرو، میری پیروی کرو۔

حضرت مولانا فضلِ رحمٰن گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ جو ہندوستان میں سلسلۂ نقشبندیہ کے بہت بڑے بزرگ گذرے ہیں، وہ ”فَٱتَّبِعُونِي“ کا ترجمہ کرتے تھے کہ میری چال چلو، میرا انداز اختیار کرو۔

اتباعِ سنت پر ملنے والا پہلا انعام: اللہ تعالیٰ کی محبت

تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اے نبی! آپ ان لوگوں سے کہہ دیجیے کہ اگر تم اللہ تبارک وتعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو۔ اس پر کیا انعام ملے گا؟ تو ارشاد فرماتے ہیں: ﴿يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ﴾: اللہ تبارک وتعالیٰ تم سے محبت فرمائیں گے اور تمھارے گناہوں کو معاف فرمائیں گے، اس کے اوپر دو انعام تجویز کیے گئے ہیں: ایک تو اللہ تعالیٰ کا محبت کرنا۔ جب اللہ تبارک وتعالیٰ کی محبت کسی کو مل جائے، پھر کیا ہے؟، سب کچھ مل گیا۔

سلطان محمود غزنویؒ اور اس کی باندی کا واقعہ

محمود غزنویؒ کا قصہ بتلایا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ محمود غزنوی دربار میں بیٹھے ہوئے تھے اور اچانک اعلان کیا کہ یہاں دربار میں جو بھی قیمتی چیزیں رکھی ہوئی ہیں، جو شخص ان میں سے جس چیز پر ہاتھ رکھ دے گا، وہ چیز اس کی ہو جائے گی؛ بس! یہ اعلان سنتے ہی کھلبلی مچ گئی، کوئی اِدھر بھاگ رہا ہے، کوئی کسی اَور چیز پر قبضہ جمانے کے لیے اُدھر جا رہا ہے، ہر ایک اچھی سے اچھی چیز پر قبضہ کرنے کے لیے آگے بڑھ رہا تھا کہ اس پر ہاتھ رکھ کر اپنی مِلک بنالے۔

ایک باندی محمود غزنوی کے پیچھے کھڑی تھی، وہ وہیں کی وہیں رہی اور اس نے محمود غزنوی کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا، محمود نے اس سے پوچھا کہ: یہ سب لوگ چیزیں لینے کے لیے بھاگ دوڑ کر رہے ہیں، تو کیوں نہیں جا رہی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ: میں

نے بھی تو ہاتھ رکھ دیا ہے؛ کیوں کہ آپ نے کہا: ''دربار میں جو ہے'' تو دربار میں آپ بھی تو موجود ہیں؛ اس لیے میں نے آپ کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا ہے، آپ اگر میرے ہو گئے تو سب کچھ میرا ہو گیا، ظاہر ہے کہ اس کے بعد مجھے کسی اور چیز کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کسی کے ہو جائیں، اللہ تعالیٰ کسی سے محبت فرمانے لگیں تو اس کے تو کیا کہنے!۔

جب اللہ تعالیٰ کسی سے محبت فرماتے ہیں تو.........

بخاری شریف کی روایت ہے، نبیٔ کریم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ: اللہ تعالیٰ جب کسی سے محبت کرتے ہیں تو حضرت جبرئیل علیہ السلام سے فرماتے ہیں کہ: اے جبرئیل! میں اپنے فلانے بندے سے محبت کرتا ہوں، تم بھی اس سے محبت کرو، چناں چہ حضرت جبرئیل علیہ السلام اس بندے سے محبت کا معاملہ کرتے ہیں اور اس کے بعد آسمان والوں یعنی فرشتوں میں اعلان کرتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے فلانے بندے کے ساتھ محبت کا معاملہ کرتے ہیں، تم بھی اس سے محبت کرو، چناں چہ آسمان والے سب فرشتے اس کے ساتھ محبت کرنے لگ جاتے ہیں، پھر آگے نبیٔ کریم ﷺ فرماتے ہیں: ثُمَّ يُوضَعُ لَهُ الْقَبُولُ فِي الأَرْضِ (۱). اس کے بعد روئے زمین پر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اس کے لیے قبولیت ڈال دی جاتی ہے۔ یعنی مخلوق کے دلوں میں اس کی محبت ڈال دی جاتی ہے اور اللہ کے بندے اس کے ساتھ محبت کرنے لگ جاتے ہیں۔

(۱) صحیح البخاری، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ، باب ذِكْرِ الْمَلاَئِكَةِ، ر: ۳۲۰۹.

اسی لیے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جو محبت اوپر سے نیچے آوے، یعنی جس آدمی کے ساتھ پہلے خواص اور اہل اللہ محبت کریں اور پھر عوام اس کے ساتھ محبت کریں تو یہ اللہ تعالیٰ کے یہاں قبولیت کی علامت ہے، جو محبت نیچے سے جاوے، وہ قبولیت کی علامت نہیں ہے۔

اتباعِ سنت پر ملنے والا دوسرا انعام: مغفرت

اتباعِ سنت پر دوسرا انعام بیان فرمایا: ﴿وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ﴾ اور اللہ تبارک وتعالیٰ تمھارے گناہوں کو معاف بھی فرمادیں گے۔ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اتباع اور پیروی کے نتیجے میں دو انعام کا وعدہ کیا گیا، ایک تو اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ محبت فرمائیں گے۔

ہمارے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ آپ جس درجے کی نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی کریں گے، اسی درجے کی اللہ تبارک وتعالیٰ کی محبت آپ کو حاصل ہوگی، آپ کے جو فی صد (percentages) نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع اور پیروی کے ہیں، اسی فی صد کے مطابق اللہ تبارک وتعالیٰ کی محبت آپ کو حاصل ہوگی۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عند اللہ محبوبیت پر عجیب استدلال

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ میں قرآنِ پاک کی تلاوت کے دوران بار بار یہ سوچتا تھا کہ قرآنِ پاک میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت موسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلوۃ والسلام کا تذکرہ ایسے عجیب وغریب انداز میں اور بار بار کیا ہے، کسی بھی نبی کا تذکرہ قرآنِ پاک میں اس کثرت کے ساتھ نہیں آیا ہے، جتنا

حضرت موسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلوۃ والسلام کا تذکرہ آیا ہے اور کس محبت کے ساتھ کیا گیا ہے، اس کی وجہ سے مجھے تعجب ہوتا تھا کہ نبیٔ کریم ﷺ کا مقام تو ان سے بہت اونچا ہے، پھر آپ ﷺ کا ایسا تذکرہ قرآنِ پاک میں کیوں نظر نہیں آتا؟!۔

جب میں نے اس آیت پر غور کیا:﴿قُلْ إِن كُنتُمْ تُحِبُّونَ ٱللَّهَ فَٱتَّبِعُونِى يُحْبِبْكُمُ ٱللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ﴾ کہ: اے نبی! آپ ان لوگوں سے کہہ دیجیے کہ اگر تم اللہ تبارک وتعالیٰ سے محبت کرتے ہو، رکھتے ہو تو میرا اتباع کرو، میری پیروی کرو، اللہ تعالیٰ تمھارے ساتھ محبت فرمائیں گے۔ تو اس آیت کو پڑھ کر میرے دل کو سکون حاصل ہو گیا کہ جس کا اتباع اور پیروی کرنے پر بندہ اللہ تعالیٰ کا محبوب بن جاتا ہے، خود ان کی محبوبیت کا عالم کیا ہوگا! یعنی اندازہ لگاؤ کہ وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں کیسے محبوب ہوں گے۔ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں غور کرنے پر مجھے عجیب سکون اور اطمینان حاصل ہو گیا۔

بہر حال! نبیٔ کریم ﷺ کی پیروی اور اتباع پر جو انعامات اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے عطا کیے جاتے ہیں، ان میں سے دو تو یہ ہیں جن کا تذکرہ اس آیتِ کریمہ میں ہے۔ اس کے علاوہ نبیٔ کریم ﷺ نے بھی اپنے ارشادات میں ان انعامات کا تذکرہ فرمایا ہے جو بندے کو نبیٔ کریم ﷺ کی پیروی پر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے دیے جاتے ہیں۔

ایک سنت پر مضبوطی کے ساتھ جمنے کا اجر و ثواب

چناں چہ نبیٔ کریم ﷺ کا ارشاد ہے: مَنْ تَمَسَّكَ بِسُنَّتِي عِنْدَ فَسَادِ أُمَّتِي فَلَهُ

أَجْرُ مِائَةِ شَهِيدٍ: جو آدمی میری کسی سنت پر جم جاوے اور اس پر عمل کا اہتمام کرے، ایسے موقع پر جب میری امت میں بگاڑ آ چکا ہو، یعنی میری امت اس سنت کی طرف سے غفلت برت رہی ہو تو اس کو سو شہیدوں کا ثواب ملتا ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں شہادت کا مقام بہت اونچا ہے اور اس پر قرآن اور حدیث کے اندر بڑے بڑے اجر کے وعدے کیے گئے ہیں، ایک سنت پر مضبوطی کے ساتھ جمنے پر نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ اس کو سو شہیدوں کا ثواب ملے گا۔

قطب بننے کا آسان طریقہ

ایک مرتبہ حضرت شاہ مسیح اللہ صاحب جلال آبادی رحمۃ اللہ علیہ حضرت جی مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ملاقات کے لیے تشریف لے گئے، دونوں حضرات آپس میں گفتگو فرما رہے ہیں، اس گفتگو کے دوران حضرت جی مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جب میں میزان ومنشعب پڑھا کرتا تھا- یہاں جو علماء ہیں، وہ جانتے ہیں کہ ہمارے یہاں مدرسوں کے اندر یہ دو کتابیں میزان ومنشعب عربی کے پہلے درجہ عربی اول کے اندر پڑھائی جاتی ہیں- اس وقت حضرت مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا کہ یوسف! قُطُب بننے کا طریقہ بتلاؤں؟۔

حضرت مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ قطب اور ابدال کیا ہے، اس کو سوچے بغیر اور سوچتا بھی کیا، میں تو اس کو سمجھتا بھی نہیں تھا تو میں نے عرض کیا کہ: جی حضرت! بتلا دیجیے۔ تو حضرت مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کی کسی سنت پر عمل چھوڑ دیا گیا ہو، وہاں جگہ اور وقت کا خیال کیے بغیر حضور ﷺ کی امت میں اس سنت کو جاری کرنے کی محنت کرنے سے اللہ تبارک وتعالیٰ قطب اور ابدال کا درجہ عطا فرماتے ہیں؛ اس لیے نبیٔ کریم ﷺ کی سنتوں کا بڑا اہتمام ہونا چاہیے۔

حضورِ اکرم ﷺ نے اتباعِ سنت کے اوپر اپنی معیت یعنی جنت کے اندر اپنا ساتھ ملنے کا وعدہ فرمایا ہے، حضرت انس رضی اللہ عنہ جو حضور اکرم ﷺ کے خادم خاص تھے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کو حضور ﷺ کی ایک وصیت

حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ سے حضور ﷺ نے فرمایا کہ کوئی ایسا بچہ جو سمجھ دار ہو، ہمیں بتلاؤ کہ جو گھر کا کام کاج کر سکے، ہمیں باہر سے کوئی چیز لانی ہو تو لا دیا کرے اور خدمت کرے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ نے۔ جو ان کے سوتیلے ابا تھے۔ مجھے اونٹ پر پیچھے بٹھلایا اور نبیٔ کریم ﷺ کی خدمت میں لے گئے، اس وقت حضرت انس رضی اللہ عنہ کی عمر دس سال کی تھی۔

حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ نے نبیٔ کریم ﷺ سے عرض کیا کہ یہ انس ہیں، یہ آپ کی خدمت کریں گے، نبیٔ کریم ﷺ نے ان کو قبول فرما لیا اور آپ ﷺ کی وفات تک انھوں نے نبیٔ کریم ﷺ کی خدمت کی یعنی دس سال تک خدمت کی، حضور ﷺ کی وفات کے وقت حضرت انس رضی اللہ عنہ کی عمر ۲۰ / سال تھی۔

ان کو حضور اکرم ﷺ نے وصیت فرمائی تھی: يَا بُنَيَّ إِنْ قَدَرْتَ أَنْ تُصْبِحَ وَتُمْسِيَ لَيْسَ فِي قَلْبِكَ غِشٌّ لأَحَدٍ فَافْعَلْ: اے میرے پیارے بیٹے! اگر تم ایسا کر سکتے ہو

کہ تم صبح وشام ایسی حالت میں کرو کہ تمھارے دل میں کسی کے متعلق میل نہیں ہے، کھوٹ نہیں ہے، بدخواہی نہیں ہے، کسی کا کینہ نہیں ہے، حسد نہیں ہے، کوئی غلط جذبہ نہیں ہے، تم کسی کا برا نہیں چاہتے۔

غش عربی زبان کا لفظ ہے جو نصح کے مقابلے میں استعمال کیا جاتا ہے اور نصح کا معنی ہے خیر خواہی، بھلائی چاہنا۔

حضرت جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ کو نصیحت

حضرت جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: جب میں نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ کے ہاتھ پر اسلام پر بیعت کی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مجھ سے اس بات پر بھی بیعت لی: النُّصْحُ لِكُلِّ مُسْلِمٍ کہ: ہر مسلمان کی بھلائی چاہوں گا[۱]۔

دین خیر خواہی کا نام ہے

بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فرماتے ہیں: الدِّينُ النَّصِيحَةُ کہ: دین اور ایمان تو نام ہی ہے بھلائی چاہنے کا۔ کس کی؟، ارشاد فرمایا: لِلَّهِ وَلِكِتَابِهِ وَلِرَسُولِهِ وَلِأَئِمَّةِ الْمُسْلِمِينَ وَعَامَّتِهِمْ: اللہ کی، اس کی کتاب کی، اس کے رسول کی، مسلمان اماموں اور حکمرانوں کی اور عام مسلمانوں کی[۱]۔

---

① صحيح مسلم، عَنْ جَرِيرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، كِتَابُ الْإِيمَانِ، بَابُ بَيَانِ أَنَّ الدِّينَ النَّصِيحَةُ، ر:۹۸.

① صحيح مسلم، عَنْ تَمِيمٍ الدَّارِيِّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، كِتَابُ الْإِيمَانِ، بَابُ بَيَانِ أَنَّ الدِّينَ النَّصِيحَةُ، ر:۹۵.

اب بندہ اللہ تعالیٰ کی بھلائی کیسے چاہے گا؟ تو اللہ کی بھلائی چاہنے کا مطلب ہے اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات پر ایمان لانا، اس کی صفات کو ماننا، ان صفات میں کسی کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک نہ کرنا، اللہ تعالیٰ ہی کی عبادت کرنا۔ تو اللہ تعالیٰ کے یہ حقوق بندہ اگر ان کو ادا کرے گا تو یہ اللہ تعالیٰ کی خیر خواہی ہے۔

نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خیر خواہی کا مطلب ہے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ محبت رکھنا، آپ کی نبوت ورسالت پر ایمان لانا، آپ کی اطاعت اور فرماں برداری کرنا، کسی چیز میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نافرمانی نہ کرنا، یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خیر خواہی ہے۔

مسلم حکمرانوں کی خیر خواہی کا مطلب یہ ہے کہ اگر خدانخواستہ ان کی طرف سے کوئی کوتاہی ہو تو محبت کے ساتھ تنہائی میں ان کو تنبیہ کرے، اسی طرح ایسی باتیں جو ان کے لیے خیر اور بھلائی کی ہوں، ان کے سامنے کرتا رہے۔ اور اس کے بعد عام مسلمانوں کی بھلائی چاہنے کا حکم ہے تو ہر ایک کی بھلائی چاہنے کو نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایمان کا جزء اور حصہ قرار دیا ہے۔

ہر ایک کی بھلائی چاہنا ایمان کا ایک جزء ہے

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب صحیح بخاری میں باقاعدہ عنوان قائم کیا ہے، جہاں وہ ایمان کے شعبوں کو شمار کرنے کے لیے مختلف عنوانات قائم کرتے ہیں، ایک عنوان یہ بھی ہے: بَابُ الدِّینُ النَّصِیحَۃُ، گویا یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ ہر ایک کی بھلائی چاہنا ایمان کا ایک جزء ہے۔

بہرحال! نبیٔ کریم ﷺ حضرت انس رضی اللہ عنہ کونصیحت فرمارہے ہیں کہ اگرتم صبح اور شام ایسی حالت میں کرسکتے ہو کہ تمھارے دل میں کسی کے متعلق کھوٹ نہ ہو یعنی تم کسی کا برانہ چاہو تو ایسا ضرور کرو۔

اتباعِ سنت جنت میں حضور ﷺ کی معیت کا ضامن

اس کے بعد حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: يَا بُنَيَّ وَذَلِكَ مِنْ سُنَّتِي: اے میرے پیارے بیٹے! یہ میری سنت ہے، یہ میرا طریقہ ہے: وَمَنْ أَحَبَّ سُنَّتِي فَقَدْ أَحَبَّنِي: اور جس نے میری سنت سے محبت کی یعنی میری سنت کو زندہ کیا، اس نے مجھ سے محبت کی، وَمَنْ أَحَبَّنِي كَانَ مَعِي فِي الجَنَّةِ: اور جس نے میرے ساتھ محبت کی، وہ میرے ساتھ جنت میں ہوگا۔

میں تو یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ نبیٔ کریم ﷺ کے طریقوں کو اپنانا جنت میں نبیٔ کریم ﷺ کی معیت اور حضورِ اکرم ﷺ کا ساتھ حاصل ہونے کا ذریعہ ہے۔

اتباعِ سنت پر دخولِ جنت کا وعدہ

اسی طرح جن چیزوں پر نبیٔ کریم ﷺ نے جنت کا وعدہ فرمایا ہے، اس میں حضور ﷺ کی سنت کی پیروی بھی ہے، حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے، نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: مَنْ أَكَلَ طَيِّبًا، وَعَمِلَ فِي سُنَّةٍ، وَأَمِنَ النَّاسُ بَوَائِقَهُ دَخَلَ الجَنَّةَ: جس آدمی نے حلال غذا کھائی اور سنت کے مطابق عمل کیا اور لوگ اس کی طرف سے پہنچنے والی ایذاؤں اور تکلیفوں سے محفوظ رہے تو وہ جنت میں داخل ہوگا۔ اس حدیث

میں جن تین کاموں پر جنت کا وعدہ فرمایا گیا، اس میں ایک چیز اتباعِ سنت بھی ہے۔

اتباعِ سنت پر چار انعامات کا وعدہ

نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک اور ارشاد ہے، فرماتے ہیں: من حفظ سنتی أکرمه الله بأربع خصال: المحبة فی قلوب البررة، والهیبة فی قلوب الفجرة، والسعة فی الرزق، والثقة بالدین: جو آدمی میری سنتوں کا اہتمام کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کو چار انعامات سے نوازیں گے۔

پہلا انعام

پہلا انعام یہ ہے: المحبة فی قلوب البررة: اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کے دلوں میں اس کی محبت ڈال دیں گے، یہ جو اہل اللہ ہوتے ہیں، چوں کہ وہ اتباعِ سنت کا اہتمام کرتے ہیں، اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ لوگوں کے دلوں میں ان کی محبت ڈال دیتے ہیں، بہت سے اللہ والے تو وہ ہیں جن کو بعضوں نے دیکھا بھی نہیں ہوتا، خالی حال سنا ہے، کسی اور جگہ بہت دور رہتے ہیں لیکن بس ان کی محبت ان کے دلوں میں گھر کیے ہوئے ہوتی ہے، بہت سے وہ ہیں جو کئی صدیوں پہلے گذر چکے لیکن جب ان کے حالات ہم پڑھتے ہیں تو ان کی محبت ہمارے دلوں میں موج مارنے لگتی ہے، یہ کیا ہے؟ یہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنتوں کی جو پیروی کرتے تھے، اس کی وجہ سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کو یہ انعام عطا فرمایا کہ لوگوں کے دلوں میں ان کی محبت ڈال دی۔

دوسرا انعام

دوسرا انعام نبیٔ کریم ﷺ نے یہ بیان فرمایا: والھیبة فی قلوب الفجرة: جو بدکار اور بدمعاش قسم کے لوگ ہوتے ہیں، ان کے دلوں میں ان کی ہیبت اور ان کا رعب ڈال دیتے ہیں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے نبیٔ کریم ﷺ کو جو خصوصیات اور امتیازات عطا فرمائے تھے، یعنی ایسی باتیں جو اللہ تعالیٰ نے نبیٔ کریم ﷺ ہی کو عطا فرمائی تھیں، کسی اَور نبی کو نہیں دی گئی تھیں، ان میں سے ایک چیز رعب تھا، نُصِرْتُ بِالرُّعْبِ مَسِيرَةَ شَهْرٍ: اللہ تبارک وتعالیٰ نے میرے رعب اور ہیبت کو ایک مہینے کی مسافت تک پہنچا کر میری مدد فرمائی[①]۔ یعنی نبیٔ کریم ﷺ کا جہاں قیام تھا مدینۂ منورہ میں، وہاں سے جو مقامات، جو ملک ایک ایک مہینے کی دوری پر تھے، وہاں کے لوگوں پر بھی نبیٔ کریم ﷺ کا رعب تھا۔

حدیث میں ایک مہینے کی قید کی حکمت

حدیث کی شرح کرنے والے علماء نے لکھا ہے کہ ایک مہینے کا لفظ جو فرمایا، وہ اس لیے نہیں کہ اس سے آگے آپ ﷺ کا رعب نہیں تھا، چناں چہ حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آپ کے جو دشمن تھے، ان کی مسافت کے اعتبار سے دوری زیادہ سے زیادہ ایک مہینے تک تھی؛ اس لیے نبیٔ کریم ﷺ نے اس کو خاص طور پر

---

① صحيح البخاری، عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ رضی اللہ عنہما، بَابُ قَوْلِ النَّبِيِّ ﷺ: جُعِلَتْ لِي الأَرْضُ مَسْجِدًا وَطَهُورًا، ر:٤٣٨.

ذکر فرمایا، آپ کے اسی رعب کا یہ نتیجہ تھا کہ بڑے سے بڑا دشمن بھی جب آپ کے سامنے آتا تھا تو لرز جاتا تھا۔

حضرت گنگوہیؒ کی انگریز کلکٹر سے ملاقات کا واقعہ

تو جو حضورِ اکرم ﷺ کی اتباع اور پیروی کرے گا تو اس اتباع اور پیروی کے نتیجے میں اللہ تبارک وتعالیٰ اس رعب اور ہیبت کا کچھ حصہ اس کو بھی عطا فرمائیں گے۔ چناں چہ جو اہل اللہ ہوتے ہیں، ان کا ایک رعب ہوتا ہے اور وہ رعب باقاعدہ ہر ایک پر اپنا اثر رکھتا ہے، چناں چہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق کتابوں میں یہ واقعہ لکھا ہے:

ایک مرتبہ مظفر نگر ضلع کا جو کلکٹر تھا- یہ انگریز کے زمانے کا قصہ ہے، جس زمانے میں ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت تھی- اس نے لوگوں سے کہا کہ یہ لوگ جنھوں نے ہماری حکومت کے خلاف جنگ لڑی تھی، وہ کون ہیں؟ میں نے سنا ہے کہ مولانا رشید احمد گنگوہی نے بھی ہماری حکومت کے خلاف شاملی کے میدان کے اندر جنگ اور مسلح جد وجہد میں شرکت کی تھی اور کامیابی بھی حاصل کی تھی، میں ذرا ان کو دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ کیسے ہیں۔ چناں چہ وہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی ملاقات اور زیارت کے لیے گنگوہ کی طرف نکلا، حضرت کو کسی نے بتلایا کہ کلکٹر آپ کی ملاقات کے لیے آ رہا ہے، حضرت کی مجلس باہر ہوتی تھی، باہر تشریف فرما ہوتے تھے، جب وہ آبادی کے قریب آیا اور حضرت کو اطلاع ہوئی تو حضرت اپنے کمرے میں تشریف لے گئے اور کواڑ بند کر لیے

اور اندر سے کنڈی لگادی، وہ کلکٹر آیا اور دیکھا کہ حضرت موجود نہیں ہیں، تھوڑی دیر بیٹھا لیکن اس کو یہ ہمت اور جرأت نہیں ہوئی کہ وہ کواڑ کھلوائے یا کھٹکھٹائے، بس! تھوڑی دیر انتظار کر کے اٹھ کر واپس چلا گیا لیکن حضرت اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلے۔

اس کے بعد دوسری مرتبہ اس کلکٹر کا دورہ تھا، اپنے سرکاری کام سے آیا تھا اور سرکٹ ہاؤس، سرکاری مہمان خانے میں قیام پذیر تھا، لوگوں نے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا کہ حضرت کلکٹر کا دورہ ہے، وہ یہاں آیا ہے تو آپ اس سے ملاقات کر لیں۔ حضرت نے فرمایا کہ میں اس سے کاہے کو ملاقات کروں؟ مجھے اس سے کیا کام؟ مجھے کیا لینا دینا؟ تو لوگوں نے کہا کہ: دارالعلوم دیوبند کے متعلق کچھ غلط شکایتیں لوگوں کی طرف سے حکومت میں پہنچائی گئی ہیں، اگر آپ کلکٹر سے ملاقات کر لیں تو اس کا تصفیہ ہو جائے، ان کی بدگمانی دور ہو جائے اور مدرسے کا نقصان نہیں ہوگا تو مدرسے کا معاملہ تھا؛ اس لیے فرمایا کہ: ٹھیک ہے۔

حضرت سرکاری مہمان خانے میں جہاں اس کا قیام تھا جانے کے لیے نکلے۔ اُس زمانے میں سواری کے لیے بڑے لوگوں کے پاس پالکی ہوا کرتی تھی، حضرت کی پالکی بڑے بڑے علماء: حضرت شیخ الہندؒ، حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ، حضرت رائپوریؒ وغیرہ اٹھایا کرتے تھے۔

حضرت کی انگریز کلکٹر کے پاس آمد اور انگریز کی غلامانہ حاضری

حضرت کی پالکی کو اس مکان کے سامنے لے جا کر رکھا جس میں وہ کلکٹر ٹھہرا ہوا تھا،

وہ اندر سے دیکھ رہا تھا، جہاں آپ کی پالکی نیچے رکھی گئی، فوراً وہ کھلے پیر، ننگے پیر دوڑا ہوا آیا، حضرت پالکی سے باہر آئے، اس نے سلام کیا اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا، حضرت نے مصافحہ کیا لیکن اس کے چہرے کی طرف نہیں دیکھا۔ اس نے کہا کہ: مجھے کوئی نصیحت کرو تو حضرت نے فرمایا کہ: انصاف کرو، اللہ کی مخلوق کے ساتھ بھلائی سے پیش آؤ اور ان پر رحم کرو۔ یہ کہا اور پالکی میں بیٹھ کر واپس اپنے گھر تشریف لے گئے۔

حضرت کے جانے کے بعد کلکٹر نے لوگوں سے پوچھا کہ: یہ کون تھا؟ یہ آئے تو میرا دل ''دھک دھک'' کر رہا تھا، میرے دل کے اندر ایک گھبراہٹ سی اور ہیبت سی پیدا ہوگئی اور میں غیر اختیاری طور پر ننگے پیر دوڑ کر ان کی خدمت میں حاضر ہوا، اور وہ چلے گئے تو مجھے اطمینان ہوا تو لوگوں نے کہا کہ: یہ وہی تھے جن کی ملاقات کے لیے تم ایک مرتبہ گئے تھے لیکن وہ تمھاری ملاقات کے لیے باہر نہیں نکلے تھے۔ اتباعِ سنت کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے یہ رعب و ہیبت عطا فرمائی تھی۔

تیسرا انعام

اتباعِ سنت پر تیسرا انعام بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: والسعة فی الرزق: اللہ تعالیٰ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنتوں کی پیروی کے نتیجے میں رزق اور روزی میں وسعت عطا فرماتے ہیں، کشادہ روزی عطا فرماتے ہیں۔

آج کل تو لوگ کشادہ روزی کے لیے معلوم نہیں، کیا کیا تدبیریں اختیار کرتے ہیں، لوگ آکر کہتے ہیں کہ مولوی صاحب! روزی کے اندر برکت کا کوئی وظیفہ بتلاؤ اور

بہت سے تو ایسے ''وظیفچی'' بن جاتے ہیں کہ دن رات کے سارے اوقات ان کے ان وظیفوں کے اندر گذرتے ہیں۔

ارے بھائی! نبیٔ کریم ﷺ کی سنت کی پیروی پر مفت میں یہ چیز حاصل ہو جائے گی؛ لیکن اس کے لیے ہمیں اتباع نہیں کرنا ہے؛ بلکہ اس لیے اتباع کرنا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمیں اس کا حکم دیا ہے، ہماری کامیابی اس کے اوپر موقوف ہے لیکن اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ جو چیزیں دیں گے، اس میں یہ بھی آ جائے گا، جیسے بھینس گوبر کے لیے کوئی بھی نہیں پالتا، بھینس تو دودھ کے لیے پالی جاتی ہے لیکن گوبر بھی ساتھ میں آ ہی جاتا ہے، کہنے کا مطلب یہ ہے کہ روزی کی وسعت بھی اتباعِ سنت کے نتیجے میں حاصل ہو جاتی ہے۔

چوتھا انعام

اور چوتھی چیز بیان فرمائی: والثقة بالدين: یعنی اتباع سنت کی برکت سے اللہ تبارک وتعالیٰ دین کے اندر پختگی عطا فرماتے ہیں، جو آدمی سنتوں کی پیروی کرتا ہے، وہ دین کے اندر بڑا پختہ ہوتا ہے۔

اتباع سنت کا اصل سبب ومقصد

بہرحال! قرآن اور حدیث میں سنتوں کی پیروی کرنے پر بہت ساری بشارتیں اور فوائد بتلائے گئے ہیں، چناں چہ حضراتِ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور اکابر امت کے یہاں اتباع سنت کا بڑا اہتمام رہا ہے اور یہ حضرات تو ان فوائد کو حاصل کرنے کے لیے

نہیں بلکہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت اور آپ کے ساتھ عشق کی وجہ سے آپ کی سنتوں کا اتباع اور پیروی کا اہتمام کرتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور اتباع سنت کا جنون

حضراتِ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عاشق زار اور ایک ایک سنت کو مضبوطی سے پکڑنے والے تھے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بڑے جلیل القدر صحابی ہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے صاحب زادے ہیں، سنت کی پیروی میں اتنے مشہور ہیں کہ ان کے آزاد کردہ غلام حضرت نافع رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ان کو سنت کی پیروی کرتے ہوئے کوئی دیکھے گا تو یہ کہے گا کہ یہ آدمی پاگل ہے، بس ان کے اوپر اتباعِ سنت کی ایک دُھن سوار تھی، ہر چیز میں نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی کا بہت زیادہ اہتمام فرماتے تھے، حدیثوں میں ان کے قصے آتے ہیں۔

ایک مرتبہ ایک آدمی نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے سوال کیا کہ میں آپ کو چار کام ایسے کرتے ہوئے دیکھتا ہوں کہ دوسروں کو وہ کام کرتے ہوئے نہیں دیکھتا، آپ نے پوچھا کہ وہ کام کیا ہیں؟ تو اس نے وہ کام بتلائے تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ: میں نے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ کام کرتے ہوئے دیکھا، اس لیے میں اس کا اہتمام کرتا ہوں۔

اسی طرح جب آپ مدینۂ منورہ سے مکۂ مکرمہ اور مکۂ مکرمہ سے مدینۂ منورہ کا سفر کرتے تھے تو راستے میں جن جن جگہوں پر نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ٹھہرے ہوئے ہوتے

تھے اور آپ نے نماز پڑھی ہوئی ہوتی تھی، وہاں اسی جگہ پر نماز پڑھنے کا اہتمام کرتے تھے۔ بخاری شریف کے اندر ایک بہت لمبی روایت ہے جس میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نماز کی جگہوں کی بڑی تفصیل کے ساتھ اور علامتوں کے ساتھ نشان دہی فرمائی ہے، اگر چہ اب وہ علامتیں باقی نہیں رہیں، وہ تو بہت مدت پہلے ختم ہو چکی ہیں لیکن حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اپنے سفر میں جب بھی مدینۂ منورہ سے مکۂ مکرمہ اور مکۂ مکرمہ سے مدینۂ منورہ جاتے تھے تو اس کا خاص اہتمام کرتے تھے کہ جہاں نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز پڑھی ہے، وہاں خود بھی نماز ادا کرنے کا اہتمام کریں۔

بلکہ یہاں تک آتا ہے کہ جن درختوں کے نیچے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز پڑھی ہوتی تھی، تو اپنے سفر کے دوران باقاعدہ دور دور سے پانی لا کر ان درختوں کی جڑوں میں اس لیے ڈالتے تھے؛ تاکہ یہ درخت سوکھنے نہ پائیں اور ان کو ان سنتوں پر عمل کرنے کا موقع ملتا رہے، یہ ان کی عادت بن چکی تھی۔

باب النساء کا پس منظر

مسجد نبوی میں ایک دروازہ ہے: باب النساء، پرانی جگہ ہے، آپ نے دیکھا ہوگا، باب النساء یعنی عورتوں کا دروازہ، نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مرتبہ یہ ارشاد فرمایا کہ: اگر ہم یہ دروازہ عورتوں کے لیے چھوڑ دیں تو؟ یعنی اچھا ہو، عورتوں کے لیے چھوڑنے کا مطلب یہ ہے کہ مرد اس دروازے کو اپنے آنے جانے کے لیے استعمال نہ کریں۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تو بس اپنی اس خواہش اور تمنا کا اظہار فرمایا کہ اگر ہم یہ دروازہ

عورتوں کے لیے چھوڑ دیں تو؟ حضرت نافع رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بس! اُس دن کے بعد سے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما مسجدِ نبوی کے اس دروازے سے نہ کبھی داخل ہوئے اور نہ کبھی نکلے[۱]، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خواہش کا اتنا زیادہ اہتمام تھا۔

حضراتِ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا یہ عام مزاج تھا، نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک ایک سنت کے لیے اپنے آپ کو نچھاور کر دیتے تھے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کی عمرہ کے لیے روانگی کا واقعہ

ایک مرتبہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضراتِ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو لے کر عمرہ کرنے کے ارادے سے مکۂ مکرمہ کی طرف نکلے، اس وقت تک مکۂ مکرمہ فتح نہیں ہوا تھا، قریش کو جب معلوم ہوا کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے رُفقا کے ساتھ عمرہ کرنے کے لیے آ رہے ہیں، حالاں کہ وہ جانتے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے صحابہ صرف عمرہ کے ارادے سے آ رہے ہیں، اس کے باوجود انھوں نے طے کیا کہ ان کو کسی بھی حال میں مکۂ مکرمہ میں داخل ہونے نہیں دیا جائے گا۔

حالاں کہ اس زمانے میں دستور یہ تھا کہ جب کوئی بیت اللہ کی زیارت کے ارادے سے آتا، حج اور عمرہ کے ارادے سے آتا تو کوئی بھی ہو، چاہے اپنا دشمن ہی ہو، تو بھی اس کو روکا نہیں جا سکتا تھا، لیکن قریش نے یہاں بھی اس عام اصول کی خلاف ورزی کرتے ہوئے طے کیا کہ ہم ان کو داخل نہیں ہونے دیں گے۔

---

[۱] تحفة الأشراف بمعرفة الأطراف لجمال الدين المزی رحمه الله، ر:۷۵۸۸

مکۂ مکرمہ کے آس پاس جو دوسرے قبائل آباد تھے، ان کو غلط خبر دی کہ یہ لوگ مکۂ مکرمہ پر حملہ کرنے کے لیے آ رہے ہیں، حالاں کہ حملے کے ارادے سے تشریف نہیں لے گئے تھے بلکہ عمرے کے ارادے سے گئے تھے لیکن ان قبائل کا ساتھ لینے کے لیے انھوں نے ان قبیلوں والوں سے یہ جھوٹی بات کہی، چناں چہ ان قبیلے والوں نے کہا کہ اگر وہ اللہ تعالیٰ کے گھر کی حرمت کو پامال کرنے کے لیے آ رہے ہیں تو ہم تمھارا ساتھ دیں گے۔

جنگ سے بچنے کے لیے دوسرا راستہ اختیار کرنا

چناں چہ جب نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پتہ چلا کہ قریش مقابلے کے لیے تیاری کر رہے ہیں تو مکۂ مکرمہ کے قریب پہنچ کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے راستہ بدل لیا؛ تاکہ دوسرے راستے سے مکۂ مکرمہ پہنچ سکیں۔ حدیبیہ جو جدہ سے مکۂ مکرمہ جاتے ہوئے شمسیہ نامی علاقہ آتا ہے، اس زمانے میں وہ حدیبیہ کے نام سے جانا جاتا تھا، اس جانب سے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکۂ مکرمہ میں داخل ہونا چاہتے تھے۔

قصواء اونٹنی کا بیٹھنا اور اٹھنا

جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حدیبیہ میں پہنچے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اونٹنی بیٹھ گئی اور اٹھنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی، اَڑ گئی، حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کہنے لگے: خَلَأَتِ الْقَصْوَاءُ، خَلَأَتِ الْقَصْوَاءُ کہ: قصواء نامی یہ اونٹنی اڑ گئی تو نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: مَا خَلَأَتِ الْقَصْوَاءُ وَمَا ذَاكَ لَهَا بِخُلُقٍ، وَلَكِنَّهَا حَبَسَهَا حَابِسُ الْفِيلِ: یہ اڑ نہیں گئی ہے اور نہ یہ اس کی

عادت ہے، اس کو اس ذات نے روکا ہے جس نے ہاتھی والوں کو روکا تھا یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم سے بیٹھ گئی ہے۔

پھر نبیٔ کریم ﷺ نے فرمایا: وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ، لاَ يَسْأَلُونِي خُطَّةً يُعَظِّمُونَ فِيهَا حُرُمَاتِ اللَّهِ إِلَّا أَعْطَيْتُهُمْ إِيَّاهَا کہ: خدا کی قسم! آج مکہ والے حرم کے ادب اور احترام کے سلسلے میں جن شرطوں پر میرے ساتھ صلح کرنا چاہیں گے، میں ان کے ساتھ ان شرطوں پر صلح کرنے کے لیے تیار ہوں اور یہ کہہ کر اونٹنی کو اٹھایا تو اونٹنی اٹھ گئی، پھر قریب ہی پڑاؤ ڈال دیا

حضور ﷺ کا اہلِ مکہ کے نام پیغام اور ان کا سلوک

اس کے بعد مکہ والوں کے پاس پیغام بھیجا کہ ہم تو لڑنے کے لیے نہیں آئے ہیں، ہم تو بس عمرہ کرنے کے لیے آئے ہیں، بیت اللہ کی زیارت کے لیے آئے ہیں، ہمیں طواف اور سعی کا موقع دے دیا جائے، ہم اپنا کام کر کے واپس چلے جائیں گے۔ یہ پیغام دے کر آپ ﷺ نے ایک آدمی کو بھیجا، وہ تو بے چارہ مکۂ مکرمہ تک پہنچا ہی تھا کہ مکہ والوں نے اس کی سواری کے اونٹ کو ختم کر دیا، اس کو بھی مار ڈالنے کے درپے تھے، بڑی مشکل سے اپنی جان بچا کر آیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بھیجنے کا نبوی ارادہ اور ان کا مشورہ

پھر نبیٔ کریم ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ عمر! تم یہ پیغام لے کر جاؤ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ: اے اللہ کے رسول! آپ جانتے ہیں کہ مجھے مکہ والوں

کے ساتھ اور مکہ والوں کو میرے ساتھ کیسی دشمنی ہے اور وہاں میرے قبیلے کے اتنے آدمی بھی نہیں ہیں جو میری حمایت کریں، آپ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بھیج دیجیے، ان کے قبیلے کے بہت سے آدمی وہاں ہیں، ان کے لیے یہ کام آسان ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہاتھ دو پیغام

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ مشورہ پسند آیا اور آپ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کہا کہ: تم میرا پیغام مکہ والوں کے پاس لے کر جاؤ اور ان کو بتلاؤ کہ ہم یہاں لڑائی کے لیے نہیں آئے ہیں، ہم تو اللہ تعالیٰ کے گھر کی زیارت کے لیے آئے ہیں، ہم کو موقع دیا جائے، ہم بیت اللہ کا طواف کریں گے، صفا مروہ کی سعی کریں گے اور حلق کرا کے واپس ہو جائیں گے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ والوں کے پاس اپنا ایلچی بنا کر اور یہ پیغام دے کر بھیجا تھا اور ساتھ ہی ساتھ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دوسرا پیغام ان مسلمانوں کے نام بھیجا جو مکۂ مکرمہ میں تھے اور کمزور تھے اور اپنی کمزوری کی وجہ سے ہجرت کر کے مکۂ مکرمہ سے مدینۂ منورہ آ نہیں سکے تھے کہ ان کو یہ بتلا دینا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ عنقریب مکۂ مکرمہ پر ہمیں فتح عطا کرنے والے ہیں۔ یہ دو پیغام دے کر نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بھیجا۔

مکۂ مکرمہ میں حضرت عثمان کا شاندار استقبال

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جہاں پڑاؤ ڈالا تھا، وہاں سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جب یہ پیغام لے کر مکۂ مکرمہ جانے لگے تو مکہ میں ان کے قبیلے والوں کو پتہ چلا کہ عثمان رضی اللہ عنہ نبیٔ کریم

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایلچی اور سفیر بن کر آ رہے ہیں، ان کے قبیلے کے لوگ مکے میں زیادہ تھے، ان کا بڑا جتھہ تھا اور زیادہ قوت والے تھے، انھوں نے کہا کہ ہمارے قبیلے کا آدمی آ رہا ہے، یہ ان کے لیے عزت کی چیز تھی کہ ہمارے قبیلے کے ایک آدمی کو ایسی عظیم خدمت کے لیے چنا گیا ہے، چناں چہ وہ سب باقاعدہ ہتھیار لگا کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے استقبال کے لیے مکہ سے باہر آئے اور جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ آئے تو ان کو اپنی حمایت میں لے لیا اور ان کو ساتھ لے کر گئے کہ تم جس کام کے لیے آئے ہو، وہ اطمینان سے کرو، کوئی بھی آپ کا بال بیکا نہیں کر سکتا، تم جو چاہو کرو، تم پر کوئی انگلی بھی نہیں رکھ سکتا، ہم تمھارے ساتھ ہیں۔

ازار اور لنگی کے سلسلے میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت

خیر! انھوں نے مکہ کے سرداروں کو پیغام پہنچایا، وہاں جو ضعفائے مسلمین تھے، ان کے نام جو پیغام دیا گیا تھا، وہ بھی پہنچایا، جس وقت ان کو ان کے قبیلے والے لے کر جا رہے تھے تو ان کے قبیلے والوں نے دیکھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی لنگی آدھی پنڈلی پر ہے اور نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طریقہ یہی تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آدھی پنڈلی تک ازار رکھتے تھے، یہ سنت ہے، یہ احرام میں تھے اور اس حالت میں ان کی لنگی آدھی پنڈلی تک تھی۔ اور مکہ والوں کا فیشن (fashion) اور اسٹائل اُس زمانے میں یہ تھا کہ مکہ کے جو بڑے اور سردار قسم کے لوگ تھے، وہ لنگی ٹخنوں سے نیچے رکھا کرتے تھے، زمین سے گھسے، اس طرح پہننے کی عادت تھی اور اسی کو عزت اور فخر کی چیز سمجھتے تھے، اگر کوئی آدمی اس سے

ذرا اوپر لنگی پہنے تو اس کو حقیر اور ذلیل سمجھتے تھے، اس کو رذیل سمجھتے تھے۔ جیسے آج کل کے جو اسٹائل ہوتے ہیں، اس کے خلاف کوئی کرے، جیسے ہم لوگ آدھی پنڈلی تک لنگی پہنتے ہیں تو یہ فیشن پرست لوگ اس کو حقیر سمجھتے ہیں نا کہ یہ کون آ گیا؟ کہاں سے آ گیا؟۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قبیلے والے جو اُن کو لینے کے لیے آئے تھے اور ان کا ساتھ دے رہے تھے، انھوں نے دیکھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی لنگی آدھی پنڈلی تک ہے تو انھوں نے ان کو ٹوکا اور کہا کہ: دیکھو عثمان! تم مکۂ مکرمہ کے بڑے بڑے چودھریوں اور سرداروں سے ملنے کے لیے اور بات کرنے کے لیے جا رہے ہو اور وہاں کا فیشن یہ ہے، ان کے یہاں لنگی کو اوپر رکھنا ذلت کی چیز ہے، اور تمھاری لنگی آدھی پنڈلی تک ہے اور وہ ایسے آدمی کو جس کی لنگی اس طرح آدھی پنڈلی پر ہو بہت حقیر اور معمولی سمجھتے ہیں؛ اس لیے تم بھی اپنی لنگی ذرا نیچی کر دو کہ زمین کے ساتھ گھسٹنے لگے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جواب میں کیا کہا؟ فرمایا: هَكَذَا إِزْرَةُ صَاحِبِنَا: میرے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی لنگی باندھنے کا انداز اور اسٹائل یہی ہے، یعنی آدھی پنڈلی تک، نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی لنگی بھی اسی طرح ہوتی ہے، میں اپنی لنگی کو اس سے ذرا بھی ہٹا سکتا نہیں۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے درخواستِ عمرہ اور ان کا عاشقانہ جواب

نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پیغام پہنچانے کے بعد ان کے قبیلے والوں نے ان کو یہ بھی کہا کہ آپ تو یہاں آ ہی گئے ہیں، ان لوگوں کو تو وہاں روک دیا گیا ہے لیکن آپ تو مکۂ مکرمہ میں ہیں، بیت اللہ آپ کے سامنے موجود ہے، آپ طواف کر لیجیے، سعی کر لیجیے، اپنا عمرہ

پورا کر لیجیے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تو وہاں روک دیا جائے اور عثمان اکیلا عمرہ کر لے؟، یہ نہیں ہوسکتا۔

عثمان میرے بغیر عمرہ نہیں کرسکتے

اِدھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا یہ جواب ہے اور اُدھر حضراتِ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ عرض کرنے لگے کہ: اے اللہ کے رسول! عثمان تو بڑے خوش قسمت ہیں، وہ تو وہاں پہنچ گئے ہیں اور وہاں عمرہ کر رہے ہوں گے۔ تو نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب میں ارشاد فرمایا: لَوْ مَكَثَ كَذَا وَكَذَا سَنَةً مَا طَافَ حَتَّى أُطُوفَ: اگر عثمان وہاں اتنے اتنے سال بھی ٹھہر جائیں تو وہ ہمارے بغیر طواف اور عمرہ نہیں کریں گے۔

ایک دوسرے پر کیسا اعتماد اور یقین تھا، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی یقین تھا کہ یہ آپ کے بغیر یہ عمرہ نہیں کریں گے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی قبیلے والوں کے اصرار کے باوجود عمرہ نہیں کیا۔ یہ ان کی سنت کی پیروی کا عالم اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عشق کا حال تھا[۱]۔

ایک صحابی کی سنتِ نبوی پر وارفتگی کا واقعہ

ایک صحابی نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اُس وقت نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا گریبان کھلا ہوا تھا، بٹن لگے ہوئے نہیں تھے، پہلی ملاقات تھی، نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پہلی زیارت تھی، بس! یہ ان کو ایسی بھا گئی کہ زندگی بھر کبھی انھوں نے اور ان کے بعد ان کے بیٹوں نے بھی گریبان کے بٹن نہیں لگائے، ہمیشہ گریبان کھلا رکھا[۲]۔

---

① المصنف لابن أبي شيبة، غَزْوَةُ الْحُدَيْبِيَةِ، عَنْ إِيَاسِ بْنِ سَلَمَةَ عَنْ أَبِيهِ، ر: ٣٦٨٥٢. =

کوئی وجہ رہی ہوگی جس کی وجہ سے آپ ﷺ کا گریبان کھلا رہا ہوگا، ورنہ حضور ﷺ کی عادتِ شریفہ یہ نہیں تھی لیکن پہلی ملاقات میں اس طرح دیکھا تو زندگی بھر کے لیے اس کو اپنا لیا، یہ محبت کی بات ہے۔

نبیٔ کریم ﷺ کی سنتوں کا اتباع حضراتِ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی رگ رگ میں پیوست تھا، اس کا بڑا اہتمام کرتے تھے، یہی تو وہ چیز تھی جس نے ان کو دنیا کی دوسری قوموں کے مقابلے میں کامیابیاں دلوائیں۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ کے یہاں اتباع سنت کا اہتمام

ہمارے اکابر کے یہاں اس کا بڑا اہتمام رہا کہ وہ سنتوں کا اتباع اور پیروی بڑے اہتمام سے کیا کرتے تھے، حضرت مجدّدِ الفِ ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں لکھا ہے کہ ان کے یہاں اتباعِ سنت کا بہت زیادہ اہتمام تھا، اتباعِ سنت ان کی طبیعت کے اندر رچ اور بس گیا تھا، بے خبری میں غیر اختیاری طور پر بھی خلافِ سنت کوئی کام نہیں ہوتا تھا، ہر کام سنت کے مطابق انجام دیتے تھے، ایک مرتبہ بیمار تھے، بیماری کی حالت میں بے ہوش ہو گئے، اس حالت میں پیشاب نکل گیا تو پائجامہ خراب ہو گیا، خدّام نے اسی بے ہوشی کی حالت میں خراب پائجامہ نکال کر صاف ستھرا پائجامہ بدلوانے کی کوشش کی تو انھوں نے بے خبری میں پہلے دائیں پیر کا پائنچہ نکالنے کی کوشش کی۔ نکالنے والوں

= ② یہ حضرت قرہ بن ایاس رضی اللہ عنہ اور ان کے بیٹے حضرت معاویہ بن قرہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: الترغیب والترہیب ۱ /۴۲، التَّرْغِيب فِي الْعلم وَطَلَبه وتعلمه وتعليمه إلخ.

کو خیال نہیں رہا کہ نکالتے ہوئے پہلے بائیں پیر کا پائنچہ نکالنا چاہیے اور یہ سنت ہے تو بہر حال! انھوں نے پہلے دائیں پیر کا پائنچہ نکالنے کی کوشش کی تو حضرت نے بے ہوشی ہی کی حالت میں پیر جھٹک دیا اور دائیں پیر سے پائنچہ نکالنے نہیں دیا، ان کے یہاں سنت کی پیروی طبیعت میں اس طرح رچ بس گئی تھی۔

حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں اتباعِ سنت کا اہتمام

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں لکھا ہے کہ: خدام غسل دینے کے بعد جب پائجامہ پہناتے تھے تو اگر کسی نے الٹے پیر سے پائجامہ پہنانا چاہا تو فوراً پاؤں جھٹک دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ: اتنا بھی نہیں جانتے کہ پہلے دائیں پیر میں پہنتے ہیں۔

سردیوں کے زمانے میں خدام پیروں میں موزے پہناتے تھے، اُس وقت خطوط لکھا رہے ہیں، کسی کے ساتھ بات چیت کر رہے ہیں یا کسی اور کام میں مشغول ہیں، موزہ پہنانے والا موزہ پہنانے کا کام کر رہا ہے لیکن اس نے بے خبری میں پہلے الٹے پیر کا پہنانا چاہا تو فوراً تنبیہ فرماتے کہ تمھیں اتنا بھی معلوم نہیں ہے کہ پہلے دائیں پیر میں موزہ پہنا جاتا ہے، اس طرح سنتوں کی پیروی ان کے مزاج کے اندر رچی اور بسی ہوئی تھی۔

ایک مرتبہ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ کے پاس نیا عبا آیا تھا، کسی نے ہدیہ دیا تھا، جمعہ کے دن پہن کر تشریف لے جا رہے تھے، اچانک نظر پڑی اور یہ اندازہ ہوا کہ آدھی پنڈلی سے نیچا ہے تو فوراً کہا کہ ذرا ناپ کر دیکھ لو، آدھی پنڈلی سے نیچا

ہے یا برابر ہے؟ ناپ کر کے دیکھا تو آدھی پنڈلی سے کچھ نیچا تھا تو اسی وقت قینچی منگوا کر اتنا حصہ کٹوا دیا۔ اتنا زیادہ اہتمام ان کے یہاں اتباعِ سنت کا تھا۔

حضرت مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ اور اتباعِ سنت

حضرت مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں لکھا ہے کہ: جس زمانے میں آپ بیمار تھے اور جس بیماری میں ان کا انتقال ہوا، سردی کا زمانہ تھا اور چمڑے کے موزے پہنے ہوئے تھے، بیماری کی وجہ سے کمزوری اتنی زیادہ تھی کہ اپنے ہاتھوں سے ان کو نکال نہیں سکتے تھے تو اشارہ کیا کہ اس کو نکالو، جب لوگ نکالنے لگے تو اسی طرح بے خیالی میں الٹے پاؤں کے بہ جائے سیدھے پاؤں سے پہلے نکالنے لگے حضرت نے فوراً پاؤں کھینچ لیا، اب وہ سوچنے لگے کہ ایک طرف تو موزے نکالنے کو کہہ رہے ہیں اور دوسری طرف نکالنے کی کوشش کرتے ہیں تو پاؤں کھینچ لیتے ہیں، پھر موزہ نکالنے کا اشارہ فرمایا اور دوسری مرتبہ بھی ایسا ہی ہوا، پاؤں کھینچ لیا، اب لوگ پریشان ہیں، ان کی سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ حضرت بار بار پاؤں کیوں کھینچ رہے ہیں، چوں کہ خود بیماری کی وجہ سے بول نہیں سکتے تھے، اسی دوران حضرت مولانا یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ (حضرت جی ثانی) تشریف لائے تو لوگوں نے آپ کو یہ قصہ بتایا کہ حضرت کہہ رہے ہیں کہ موزہ نکالو اور ہم نکالتے ہیں تو پاؤں کھینچ لیتے ہیں تو حضرت جی نے فرمایا کہ: تم پہلے سیدھے پاؤں سے موزے نکالتے ہو تو حضرت کھینچ ہی لیں گے نا! پہلے الٹے پاؤں سے نکالو۔

بیماری کی حالت میں بھی اتباعِ سنت کا عجیب مظاہرہ

اسی بیماری کی حالت میں حضرت مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں جماعت کی نماز کا اتنا زیادہ اہتمام تھا کہ بیماری کی حالت میں جب آپ کے لیے چلنا ممکن نہیں رہا تھا تو دو آدمیوں کے سہارے کمرے سے نکل کر مسجد کے اندر آتے تھے، اس حال میں کہ طاقت نہ ہونے کی وجہ سے دونوں پاؤں گھسٹ رہے ہیں، اس کے اندر بھی نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی کا خیال ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ مرض الوفات میں نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دو آدمیوں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے سہارے سے مسجد میں تشریف لائے، حدیث کے الفاظ ہیں: فَقَامَ يُهَادَى بَيْنَ رَجُلَيْنِ، وَرِجْلَاهُ تَخُطَّانِ فِي الْأَرْضِ کہ: دو آدمیوں کا سہارا لے کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جا رہے تھے اور طاقت نہ ہونے کی وجہ سے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دونوں پاؤں زمین پر گھسٹ رہے تھے، خط کھینچ رہے تھے۔

یہ ہے سنت کی پیروی اور یہی اصل ہے، کرامتیں ہزار بھی ہوں تو ان کرامتوں سے کچھ جنت ملنے والی نہیں ہے، جنت تو نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی اور اتباعِ سنت کے اہتمام کی وجہ سے ملے گی۔

میرے پاس تو اتباعِ سنت کے سوا کچھ نہیں

حضرت مجدّدِ الفِ ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ چشتیہ سلسلے کے ایک بزرگ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ حضرت! ایک لمبی مدت تک مجھ پر قبض طاری رہا۔ یہ ایک خاص قسم کی کیفیت ہوتی ہے کہ جس کی وجہ سے آدمی کا جی

عبادتوں سے اچاٹ ہو جاتا ہے، عبادت تو کر لیتے ہیں لیکن جیسی کیفیت اور لذت ہونی چاہیے، وہ حاصل نہیں ہوتی، اس کو انقباضی کیفیت اور قبض کی حالت کہتے ہیں، اس سے وہ قبض نہ سمجھنا جو پیٹ کی بیماری کی وجہ سے ہوتا ہے۔

بہر حال! انھوں نے عرض کیا کہ میرے اوپر ایک مدت تک قبض طاری رہا، میں اس کی وجہ سے کافی پریشان تھا، آپ کے شیخ حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے اس کی شکایت کی تو انھوں نے دعا اور توجہ کی تو میرا وہ قبض دور ہوا، انھوں نے اپنی وفات کے وقت اپنے تمام خلفاء اور مریدین کو آپ کے حوالے کیا، اس وقت مجھ پر دوبارہ قبض کی ویسی ہی حالت طاری ہے، اس لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں، آپ دعا اور توجہ فرمائیے۔ جب اس بزرگ نے یہ بات کہی تو حضرت مجدّدِ الفِ ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی سادگی کے ساتھ یہ جملہ کہا کہ: بھائی! میرے پاس تو اتباعِ سنت کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہے، ایسی سادگی کے ساتھ کہا کہ ان بزرگ پر حال طاری ہو گیا اور وجد کے اندر جھومنے لگے، وہ قبض تو دور ہو گیا۔

ہماری کرامتیں ایک سنت کا بھی مقابلہ نہیں کرسکتیں

اب وہ جھوم رہے ہیں تو ''سرہند'' کی زمین -حضرت مجدّدِ الفِ ثانی رحمۃ اللہ علیہ سرہند کے رہنے والے تھے- بھی ان بزرگ کے ہلنے پر ہلنے لگی تو حضرت مجدّدِ الفِ ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے خادم سے کہا کہ: میری مسواک لاؤ، خادم مسواک لایا تو آپ نے اس کو زمین کے اوپر مارا، جیسے ہی آپ نے مسواک کو زمین کے اوپر مارا زمین نے حرکت کرنا

بند کر دیا۔اس کے بعد حضرت مجدّد الفِ ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ تمھاری کرامت کے طور پر زمین حرکت کر رہی تھی، میں اگر اللہ تعالیٰ سے دعا کروں تو مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ میری دعا پر ''سرہند'' کے مردوں کو زندہ کر دیں گے لیکن تمھاری وہ کرامت اور میری یہ کرامت اس عمل کا مقابلہ نہیں کر سکتی کہ آدمی وضو میں مسواک کر کے نماز پڑھے، اس سنت کا مقابلہ ہماری یہ کرامتیں نہیں کر سکتیں۔

سنت پر ایک مرتبہ عمل کرنا سو مرتبہ ہوا میں اڑنے سے بہتر

حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سنت پر عمل اتنا اونچا کام ہے اور اس کا مقام اتنا بلند ہے کہ یہ کرامتیں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔شیخ محی الدین ابن العربی رحمۃ اللہ علیہ بہت بڑے بزرگ گذرے ہیں، انھوں نے ایک موقع پر فرمایا کہ: ایک آدمی ہے جو مسجد میں داخل ہوتے وقت پہلے دایاں پاؤں داخل کرتا ہے، یہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سنت ہے اور ایک آدمی ہے جو سو مرتبہ ہوا میں اڑتا ہے تو وہ آدمی جس نے ایک مرتبہ مسجد میں داخل ہوتے وقت پہلے دایاں پاؤں رکھا، اِس کا مقابلہ وہ آدمی نہیں کر سکتا جو ہوا میں سو مرتبہ اڑا؛ اس لیے کہ جس نے سنت پر عمل کی نیت سے مسجد میں داخل ہوتے وقت پہلے دایاں پاؤں آگے کیا ہے، اس کی وجہ سے اس کو اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوا، اللہ تعالیٰ کی رضا اور محبت حاصل ہوئی اور دوسرے آدمی کو ہوا میں اڑنے کی وجہ سے کیا حاصل ہوا؟ کوئی قرب حاصل ہوا؟ ہوا میں تو چڑیاں بھی اڑا کرتی ہیں، کہنے کا حاصل یہ ہے کہ اصل چیز نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سنت کی پیروی ہے۔

سنتوں کی برکتوں کے حصول کا ایک نسخۂ کیمیا

حضرت مولانا شاہ فضلِ رحمٰن گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ جو سلسلۂ نقشبندیہ کے بہت بڑے بزرگ تھے، ۱۰۵/سال کی عمر پائی، بڑے صاحبِ نسبت تھے، وہ فرماتے ہیں کہ: آؤ! میں تم کو ایک نسخۂ کیمیا بتاؤں، وہ یہ ہے کہ آدمی سنت پر عمل کرتے ہوئے یہ سوچے کہ یہ سنت طریقہ ہے، جیسے جب کھانے کے لیے بیٹھو تو جب تم ہاتھ دھوؤ تو یہ سوچ کر کے دھوؤ، اِس استحضار کے ساتھ، اِس خیال کے ساتھ دھوؤ کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کھانے سے پہلے ہاتھ دھوئے ہیں، اس لیے میں ہاتھ دھو رہا ہوں۔

دیکھو! ایک تو ہے سنت پر عمل کرنا اور ایک ہے اس سنت کا استحضار یعنی یہ سوچتے ہوئے اور خیال کرتے ہوئے عمل کرنا کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طریقہ ہے، اگر سنت پر عمل کروگے تو اس کا ثواب ملے گا لیکن اگر سنت کا استحضار بھی ہوگا تو اس کی وجہ سے وہ برکات آپ کو حاصل ہوں گی جن کا آپ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ یہ سنت پر عمل ایک عجیب نسخہ ہے، یہ ہماری زندگی کو قیمتی بنا دیتا ہے، یوں سمجھو کہ یہ لوہے کو سونا بنا دیتا ہے، پارس ہے پارس، جو لوہے کو سونا بنانے کا کام کرتا ہے۔

سنت کے مطابق عمل کا ایک واقعہ

ابھی گذشتہ سال کا قصہ ہے، میرا دارالعلوم دیوبند وہاں کی شوریٰ میں شرکت کی نسبت سے جانا ہوا تھا،، وہاں حضرت حکیم کلیم اللہ صاحب دامت برکاتہم جو حضرت مولانا شاہ ابرار الحق صاحب ہردوئی رحمۃ اللہ علیہ کے داماد بھی ہوتے ہیں، ان کے جانشین بھی ہیں،

حضرت شاہ احمد صاحب پرتاپ گڑھی رحمۃ اللہ علیہ کے خلفا میں سے بھی ہیں اور حضرت ہردوئی رحمۃ اللہ علیہ کے بھی مجاز ہیں۔انھوں نے بتلایا کہ جو آدمی کھانے سے پہلے یہ سوچ کر اور یہ استحضار رکھتے ہوئے ہاتھ دھوئے کہ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت ہے اور اسی طرح کھانے کے بعد بھی،تو کتنا بھی قرضہ ہو،ادا ہوجائے گا۔

اس کے بعد انھوں نے یہ واقعہ بتلایا کہ ایک آدمی نے قرضے کے متعلق شکایت کی،اس کو بھی یہی بتلایا کہ کھانے سے پہلے دونوں ہاتھ پہنچوں تک دھوئے،یہ سمجھ کر کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طریقہ ہے،نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اسی طرح کھانے سے پہلے ہاتھ دھوتے تھے اور اسی طرح کھانے کے بعد بھی ہاتھ دھونا ہے اور یہی تصور قائم کرنا ہے کہ میں نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کی پیروی کرتا ہوں،حضرت حکیم کلیم اللہ صاحب دامت برکاتہم نے فرمایا کہ اس کا فائدہ یہ ظاہر ہوا کہ چند ہی دنوں میں اس آدمی کا قرضہ ادا ہوگیا،قرض کی ادائیگی کا یہ بہت ہی آسان نسخہ بتلایا اور فرمایا کہ:جس کو بھی یہ نسخہ بتلایا اور اس نے اس پر عمل کیا تو اللہ تعالیٰ کے فضل سے ان کے قرضے ادا ہوگئے۔

چند دنوں میں صاحبِ نسبت نہ بنو تو کہنا

بہرحال!حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آپ کھانے سے پہلے ہاتھ دھوئیں اس تصور کے ساتھ کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اسی طرح کھانے سے پہلے ہاتھ دھوتے تھے اور کھانا شروع کرنے سے پہلے اکڑوں بیٹھئے یا ایک پاؤں موڑ کر اور دوسرا پاؤں کھڑا کر کے بیٹھئے جیسا کہ سنت طریقہ ہے،یہ سوچ کر کے کہ

یہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طریقہ ہے اور کھانے سے پہلے بسم اللہ پڑھئے، دائیں ہاتھ سے کھایئے، یعنی ہر سنت کو ادا کرتے وقت اس کے سنت ہونے کا استحضار رکھئے۔

اسی طرح آپ جب سونے لگیں تو سوتے وقت کی جو سنتیں ہیں، ان سنتوں کی ادائیگی اس تصور کے ساتھ کریں کہ یہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طریقہ ہے، اس لیے میں کرتا ہوں، اس طرح سنتوں پر عمل کرتے ہوئے اگر تم چند دنوں میں صاحبِ نسبت نہ بن جاؤ تو مجھے کہنا، یعنی ایسا کرنے سے اس کا تعلق اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ قائم ہو جاتا ہے۔

خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت اور اُس کا بدل

حضرت مولانا شاہ وصی اللہ رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کے اجل خلفاء میں سے ہیں، فرماتے ہیں کہ لوگ تمنا کرتے ہیں کہ خواب میں نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت ہو اور کون مؤمن ہے جس کی یہ تمنا نہ ہو؛ لیکن یہ غیر اختیاری چیز ہے یعنی خواب میں نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت کا ہو جانا ہمارے اختیار میں نہیں ہے، یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے، وہ جس کو نصیب کرے، یہ بڑی سعادت کی بات ہے، کوئی ضروری نہیں ہے کہ حاصل ہو جائے۔ حضرت فرماتے ہیں کہ: میں تم کو ایک ایسی ترکیب بتلاتا ہوں جس کی وجہ سے تم کو ہر وقت معنوی اور روحانی طور پر نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت حاصل ہوگی یعنی ہر وقت آپ کا تصور دل ودماغ میں حاصل ہوگا اور وہ یہ کہ تم ہر وقت کی سنت اسی تصور کے ساتھ ادا کرنے کا اہتمام کرو، مثلاً یہ کہ جب تم کھانے کے لیے بیٹھو تو ہاتھ دھو کر بیٹھو؛ کیوں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کھانے کے لیے ہاتھ دھو کر بیٹھتے تھے اور بیٹھو تو نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کے بیٹھنے کا جو طریقہ ہے، اس کے مطابق بیٹھو اور یہ سوچو کہ نبیٔ کریم ﷺ کھانے کے لیے اسی طرح بیٹھتے تھے، دائیں ہاتھ سے کھاؤ اور یہ سوچو کہ نبیٔ کریم ﷺ بھی دائیں ہاتھ سے کھاتے تھے، بسم اللہ پڑھ کر کھاؤ اور یہ سوچ کر کھاؤ کہ نبیٔ کریم ﷺ بھی بسم اللہ پڑھ کر کے کھاتے تھے، اپنے سامنے سے کھاؤ، یہ سوچ کر کھاؤ کہ نبیٔ کریم ﷺ بھی اپنے سامنے سے کھاتے تھے، یعنی ہر وقت، ہر سنت پر عمل کرتے ہوئے یہ تصور رہے کہ یہ کام نبیٔ کریم ﷺ اسی طرح کرتے تھے۔

مسجد میں داخل ہو رہے ہیں تو پہلے دایاں پاؤں مسجد میں داخل کریں اور مسجد میں داخل ہونے کی دعا پڑھیں یعنی بِسْمِ اللهِ والصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلَى رَسُولِ اللهِ، اللّٰهُمَّ افْتَحْ لِي أَبْوَابَ رَحْمَتِكَ، اس تصور کے ساتھ کہ حضور ﷺ جب مسجد میں داخل ہوتے تھے تو دایاں پاؤں داخل کر کے اس دعا کے ساتھ دعا داخل ہوتے تھے اور مسجد سے نکل رہے ہیں تو یہ دعا بِسْمِ اللهِ والصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلَى رَسُولِ اللهِ، اللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ وَرَحْمَتِكَ، پڑھتے ہوئے اور بایاں پاؤں نکالتے ہوئے یہی سوچیں کہ حضور ﷺ بھی اسی طرح مسجد سے نکلتے تھے کہ پہلے بایاں پاؤں مبارک نکالتے تھے۔

یعنی ہر کام اور ہر عمل میں جو سنت طریقہ ہے، اس کے سنت ہونے کے استحضار کے ساتھ اس عمل کو انجام دیں، اس طرح کرنے سے ہر وقت نبیٔ کریم ﷺ کا تصور دل و دماغ پر چھایا رہے گا، چوبیسوں گھنٹے یہ تصور موجود رہے گا؛ کیوں کہ آدمی ہر وقت کوئی نہ کام کرتا رہتا ہے، ان کاموں کو حضور ﷺ کے طریقے کے مطابق اس تصور کے ساتھ کرے گا تو چوبیس گھنٹے نبیٔ کریم ﷺ کا تصور اس کے دل و دماغ پر چھایا رہے گا۔ یہ

خواب والی زیارت سے بہت بہتر ہے۔ بہر حال ضرورت ہے کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سنتوں کی پیروی کی جائے۔

ایک سبق آموز واقعہ

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق ان کے صاحب زادے حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب دامت برکاتہم بیان فرماتے ہیں کہ: حضرت والد صاحب جب حج کے لیے تشریف لے گئے اور مدینۂ منورہ زیارت کے لیے گئے تو وہاں روضۂ اقدس پر مواجہہ شریف یعنی وہ جالی مبارک جس کے سامنے کھڑے رہ کر سلام پیش کیا جاتا ہے، جو لوگ گئے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ وہاں جالی کے سامنے کچھ فاصلے پر، دو صف کے بعد دو ستون ہیں، عام طور پر ہمارے اکابر کی عادت یہ تھی اور میں نے خود اکثر بڑوں کو دیکھا: حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے اکابر کو بھی کہ وہ بیچ کی جالی ہے، اس کے سامنے کا جو ستون ہے، اس ستون کے پاس اور اگر کوئی وہاں کھڑا ہے تو ذرا پیچھے کھڑے رہتے اور آگے نہیں بڑھتے تھے۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں ہمیشہ اسی ستون کے پاس کھڑے رہ کر سلام پیش کرتا ہوں۔ جب کہ دوسرے لوگ بالکل قریب جانے کی کوشش کرتے ہیں، جالی سے چپکنے کے چکر میں رہتے ہیں۔ اب تو چپکنے کی شکل نہیں رہی کہ ان لوگوں نے دیوار سی بنادی ہے، پہلے دیوار نہیں تھی تو اس وقت جالی کے پاس جاتے تھے اور اس کو چھوتے تھے۔

حضرت مفتی شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں زیارت کرتے ہوئے دیکھ رہا ہوں کہ لوگ بالکل جالی کے قریب پہنچ رہے ہیں اور اس کو چھو رہے ہیں، ایک مرتبہ میں اسی طرح اپنی عادت کے مطابق اس ستون کے پاس کھڑا رہ کر زیارت کر رہا تھا، سلام عرض کر رہا تھا کہ میرے دل میں ایک دم، غیر اختیاری طور پر خیال آیا کہ تو کیسا محروم اور بدنصیب ہے کہ یہاں آنے کے بعد بھی قریب نہیں جاتا، اتنا دور رہتا ہے، دیکھ! لوگ کیسے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے روضے کے قریب جا رہے ہیں اور جالی سے چمٹنے کی کوشش کر رہے ہیں اور تو اتنا دور کھڑا ہے اور سلام عرض کر رہا ہے، غیر اختیاری طور پر یہ خیال میرے دل میں آیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پیغام امت کے نام

فرماتے ہیں کہ: دل میں یہ خیال آیا ہی تھا کہ اسی دوران میں نے آواز سنی، اندر سے آواز آئی کہ نبئ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ: جو لوگ میری سنت پر عمل کرتے ہیں، وہ مجھ سے قریب ہیں، چاہے ہزاروں میل دور رہتے ہوں اور جو میری سنت پر عمل نہیں کرتے ہیں، وہ مجھ سے دور ہیں، چاہے میری جالی سے چمٹے ہوئے ہوں اور یہ بھی فرمایا: ''لوگوں کو میری یہ بات بتادو''۔

چناں چہ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے بیانات کے اندر بھی یہ بات بیان فرماتے تھے؛ لیکن یہ کہہ کر نہیں کہ یہ واقعہ میرے ساتھ پیش آیا بلکہ یہ کہہ کر کہ: اللہ کا ایک بندہ حج میں گیا تھا، سلام کے وقت اس کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا اور انھیں نبئ کریم

ﷺ نے یہ ہدایت کی ہے، اپنا نام کبھی نہیں بتلایا، یہ تو ان کے صاحب زادے تھے؛ اس لیے ان کو بتلایا۔

میں یہ عرض کرنا چاہ رہا ہوں کہ نبیٔ کریم ﷺ کا قرب اور نزدیکی حاصل کرنے کا ذریعہ اگر کوئی ہے تو وہ اتباعِ سنت ہے، یہی چیز ہمیں نبیٔ کریم ﷺ کے قریب کرے گی، ورنہ سب کچھ کر رہے ہیں اور سنت کی اتباع کا اہتمام نہیں ہے تو کوئی فائدہ نہیں ہے؛ اس لیے ہر چیز میں سنتوں کی اتباع کا اہتمام ضروری ہے۔

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور اتباعِ سنت کا اہتمام

حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو آخری بیماری میں ایسی کمزوری لاحق ہو گئی تھی کہ بغیر سہارے اور ٹیک کے بیٹھ نہیں سکتے تھے، دیوار یا تکیے کا سہارا لینا پڑتا تھا یا کسی آدمی سے ٹیک لگا کر بیٹھتے تھے، اسی حالت میں ایک مرتبہ کھانا لایا گیا، کسی نے کہا کہ: حضرت! اسی طرح ٹیک لگا کر کھانا کھا لیجیے تو فرمایا کہ: نہیں! میرا یہ سہارا ہٹا دو، اس لیے کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ٹیک لگا کر کھانا کھانے سے منع فرمایا ہے، یہ ہمارے اکابر تھے، جن کے یہاں سنتوں کا اتنا زیادہ اہتمام تھا۔

ہمارے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو ان کے کسی دوست نے یہ واقعہ سنایا تھا کہ ان کا ایک دوست ''لیگی'' تھا، آزادی سے پہلے انگریزوں کے زمانے میں ہندوستان میں دو پارٹیاں تھیں: کانگریس اور مسلم لیگ، یہ آدمی مسلم لیگ کا بڑا حمایتی تھا، اس لیے اس کو ''لیگی'' کہا۔ اس لیگی نے اپنے ہاتھ کو اس طرح (سامنے کی طرف سیدھا) سیدھا

رکھنے کی خوب مشق کی اور مشق میں اس طرح وہ آدھے گھنٹے تک ہاتھ سیدھا رکھتا تھا، ایک مرتبہ اسی طرح مشق کرنے کے بعد حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات ہوئی اور اس نے آپ سے مصافحہ کیا اور حدیث میں یہ آتا ہے کہ جب کوئی آدمی نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مصافحہ کرتا تو جب تک وہ اپنا ہاتھ کھینچتا نہیں تھا، اس وقت تک نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اپنا دستِ مبارک کھینچتے نہیں تھے۔

یہ لیگی حضرت کا صرف امتحان لینا چاہتا تھا، اس لیے اس نے مصافحہ کرتے ہوئے حضرت کے ہاتھ کو پکڑ لیا اور ہاتھ نہیں چھڑایا، حضرت نے بھی نہیں چھڑایا، یہاں تک کہ وہ آدھ گھنٹے تک اسی طرح رہا، جب اس نے اپنا ہاتھ ہٹایا، تب حضرت نے بھی اپنا ہاتھ ہٹایا، تب اس نے کہا کہ: ہاں! ان میں سنت کا اتباع ہے۔ ان حضرات کے یہاں سنت کا اتنا زیادہ اہتمام تھا کہ گویا اس کو اپنی زندگی کا ایک جزء بنالیا تھا۔

اکثر مسلمانوں کو بہت سی سنتیں معلوم ہوتی ہیں

اگر ہم کوشش کریں تو بہت سی سنتیں ایسی ہیں جن کو ہم آسانی کے ساتھ ادا کر سکتے ہیں، بہت سی سنتوں کو ہم جانتے ہیں: بیت الخلا میں جانے کا سنت طریقہ ہمیں معلوم ہے کہ آدمی پہلے دعا پڑھ لے: بِسْمِ اللهِ اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِث، پھر بایاں پاؤں پہلے رکھے پھر دایاں پاؤں رکھے، پھر جب نکلے تو پہلے سیدھا پاؤں نکالے، پھر الٹا پاؤں نکالے، پھر دعا پڑھ لے: غُفْرَانَكَ، الْحَمْدُ للهِ الَّذِي أَذْهَبَ عَنِّي الأَذَى وَعَافَانِي۔

مسجد میں جانے کا سنت طریقہ اور اس وقت کی دعا معلوم ہے، نکلنے کا طریقہ اور اس وقت کی دعا معلوم ہے۔ بہت سی سنتیں ہیں، رات کو سوتے وقت کا سنت طریقہ معلوم ہے، اکثر لوگوں کو یہ سب سنتیں معلوم ہیں، جب جماعت میں تین روز، دس روز، چلّے کے لیے جاتے ہیں تو وہاں کھانے کے آداب، سونے کے آداب سکھائے جاتے ہیں، آداب یعنی کیا؟ کھانے کا جو طریقہ شریعتِ مطہرہ نے بتلایا جس میں کچھ کام کرنے کے ہیں اور کچھ چیزیں پڑھنے کی ہیں، اقوال اور اعمال کے مجموعے کو آداب سے تعبیر کیا گیا ہے، نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہر چیز کے آداب بتلائے ہیں اور اکثر وہ ہیں جن کو یہ آداب معلوم ہیں۔

سنتیں معلوم ہونے کے باوجود ہمارا حال

لیکن اس کے باوجود ہمارا حال کیا ہے؟ علم کی حد تک تو یہ چیزیں ہیں لیکن عملی طور پر نہیں ہیں، دیکھو رات کو ابھی جا کے سو جائیں گے، سوتے وقت کی دعا، سونے کا طریقہ کہ دائیں کروٹ پر، دائیں رخسار کے نیچے دایاں ہاتھ رکھ کر کے لیٹنا، یہ سنت کا طریقہ ہے، باوضو ہو اور پھر دعا پڑھے: اللّٰهُمَّ بِاسْمِكَ أَمُوتُ وَأَحْيٰ [۱]، سب کو معلوم ہے، شاید ہی اس مجلس میں کوئی ایسا ہو جس کو یہ معلوم نہ ہو لیکن میں اگر پوچھوں کہ کل رات جب آپ سوئے تھے تو اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر خود اپنی ذات سے پوچھ لو کہ کتنوں نے یہ دعا پڑھی تھی؟ دعا ہم سب کو معلوم ہے لیکن عمل کتنوں کا ہے؟۔

---

۱ صحيح البخاری، عَنْ أَبِي ذَرٍّ رضي الله عنه، باب مَا يَقُولُ إِذَا أَصْبَحَ.

بیت الخلا میں جانے کا سنت طریقہ کہ آدمی پہلے دعا پڑھ لے: اللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ[۱]، پھر بایاں پاؤں پہلے رکھے، پھر دایاں پاؤں رکھے، فارغ ہوکر جب نکلے تو پہلے دایاں پاؤں نکالے، پھر الٹا پاؤں نکالے، پھر دعا پڑھ لے: غُفْرَانَكَ، الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي أَذْهَبَ عَنِّي الأَذَى وَعَافَانِي[۲]، بہت سے ہیں جن کو یہ طریقہ معلوم ہے، دعا معلوم ہے لیکن اگر میں پوچھوں گا کہ ابھی کچھ دیر پہلے جب آپ بیت الخلاء میں داخل ہوئے تھے تو کیسے داخل ہوئے تھے؟ جواب ملے گا کہ معلوم نہیں! قضائے حاجت کا جب موقع آتا ہے نا تو بھاگتے دوڑتے جائیں گے اور دروازہ کھول کے گھس گئے، نہ دعا یاد، نہ یہ معلوم کہ پہلے سیدھا پاؤں اندر پڑا پھر الٹا یا پہلے الٹا اندر گیا پھر دایاں، کچھ پتہ نہیں۔

حاضرینِ مجلس سے درخواست

آج اس مجلس میں جتنے بھی میرے بھائی ہیں، چھوٹے بڑے، سب کی خدمت میں یہ عرض کروں گا کہ ایسی بہت سی سنتیں ہیں جو ہمیں اور آپ کو معلوم ہیں، آج یہ طے کرلیں کہ آج ہی سے ان سنتوں پر عمل کا اہتمام کریں گے، ویسے بھی یہ ربیع الاول کا مہینہ ہے، نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یادگار کے طور پر ان سنتوں کو زندہ کرنے کا عہد کریں، ہم

---

۱ صحیح البخاری، عَنْ أَنَسٍ رضی اللہ عنہ، باب مَا يَقُولُ عِنْدَ الْخَلَاءِ.

۲ یہ دو حدیثوں میں مذکور دو مختلف دعاؤں کا مجموعہ ہے، غُفْرَانَكَ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں ہے جس کو ابوداود وغیرہ نے روایت کیا ہے اور الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي أَذْهَبَ عَنِّي الأَذَى وَعَافَانِي حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے جس کو ابنِ ماجہ وغیرہ میں روایت کیا گیا ہے۔

ظاہری طور پر بہت کچھ کر ڈالتے ہیں لیکن جو اصل چیز ہے اور جس کے لیے نبیٔ کریم ﷺ کی بعثت ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ ہم ہر کام میں نبیٔ کریم ﷺ کی سنت کی پیروی کریں، ہم جو بھی کام کریں، سنت کے مطابق کریں، کوئی کام خلافِ سنت نہ ہو۔

جو کام کرو، سنت کے مطابق کرو

حضرت مولانا انعام الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ: میں یہ نہیں کہتا کہ سب سنتوں پر عمل کرو؛ لیکن یہ کہتا ہوں کہ جو کرو، سنت کے مطابق کرو۔

اس طرح جب ہماری زندگی میں سنتیں آجائیں گی تو پھر دیکھنا کہ اس کی کیسی برکات حاصل ہوتی ہیں، اس کا اہتمام آج ہی سے اور ابھی سے شروع کر دیں۔

اگر سنت کے مطابق عمل بھول جائیں تو کیا کریں؟

ابھی جب مسجد سے نکلیں گے تو پہلا مرحلہ آئے گا اور دیکھو! عادت پڑ گئی ہے، اس لیے ہوسکتا ہے کہ آپ پہلے بایاں پاؤں نکالنے کے بہ جائے دایاں پاؤں نکال دے اور ایسا کر کے جب باہر نکل جائیں گے تو یاد آئے گا کہ بھول ہوگئی لیکن اُس وقت ہمیں ہمارا نفس یہ کہے گا کہ اِس مرتبہ بھول ہوگئی، آئندہ یاد رکھیں گے۔ نہیں نہیں! اب نفس کے اس بہانے پر عمل نہیں کرنا ہے بلکہ آپ دوبارہ مسجد میں داخل ہوئیے اور داخل ہونے کی سنت کے مطابق داخل ہوئیے یعنی دایاں پاؤں داخل کرتے ہوئے بِسْمِ اللّٰهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلَى رَسُولِ اللّٰهِ، اللّٰهُمَّ افْتَحْ لِي أَبْوَابَ رَحْمَتِكَ پڑھیے اور جب نکلیے تو بِسْمِ اللّٰهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلَى رَسُولِ اللّٰهِ، اللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ وَرَحْمَتِكَ

پڑھتے ہوئے اور بایاں پاؤں نکالتے ہوئے نکلیے۔

اسی طرح کھانا کھانے کے موقع پر، قضائے حاجت کے لیے بیت الخلاء جاتے ہوئے اس طرح چار، پانچ مرتبہ کرلوگے یعنی فوراً بھول سدھارلوگے تو عادت بن جائے گی لیکن اگر نفس کا بہانہ چلالیا کہ چلو! اس مرتبہ بھول ہوگئی تو پھر بھول ہوتی ہی رہے گی، چوں کہ عادت پڑ گئی ہے، اس لیے اس عادت کو سدھارنے کا طریقہ یہی ہے کہ اسی وقت اس بھول کی ہم اصلاح کرلیں، شیطان دیکھے گا کہ میں نے ایک سنت چھڑوائی، اس نے دو سنتیں ادا کرلیں، داخل ہونے کی بھی اور نکلنے کی بھی تو اب وہ آئندہ کبھی بھول نہیں کرائے گا، شیطان بھی بڑا ہوشیار ہے، وہ بھی سوچے گا کہ میں نے اس کو بھلاوے میں ڈال دیا اور اس نے تو نیکی کے کئی کام کرڈالے۔

ابلیس نے تہجد کے لیے جگایا

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ شیطان نے پاؤں وغیرہ سہلا کر آنکھ لگائے رکھی اور صبح بیدار ہوئے تو احساس ہوا کہ تہجد فوت ہوگئی، اس پر بہت روئے اور اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ان کو تہجد پڑھنے پر جتنا ثواب دیتے تھے، اس سے بھی زیادہ عطا فرمایا۔ دوسری رات دیکھا کہ کوئی بزرگ ہیں جو ان کے پاؤں پکڑ کر ہلارہے ہیں کہ: اٹھو بھائی! تہجد کا وقت ہوگیا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ آپ کون صاحب ہیں؟ اس نے کہا کہ: میں ابلیس ہوں، شیطان ہوں، انھوں نے پوچھا کہ: تو تہجد کے لیے بیدار کرنے کا کام کب سے کرنے لگا؟ اس نے جواب دیا کہ: کل میں نے آپ کو

سلائے رکھا تھا تو آپ کے رونے پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو اتنا ثواب دیا کہ جتنا ثواب تہجد پڑھنے پر بھی نہیں ملتا تھا۔

گھر میں بھی سنتوں والا ماحول پیدا کیجیے

بہرحال! سنتوں کے مطابق عمل کا اہتمام کرو اور پھر دیکھو کہ اس کی برکات کیسے ظاہر ہوتی ہیں! اور پھر اکیلے نہیں، گھر کے تمام افراد کو اور گھر کے چھوٹے چھوٹے بچوں کو بھی یہ چیز ایک ایک کر کے محبت کے ساتھ سکھلائی جائے، گھر میں اتباعِ سنت کا ایک ایسا ماحول تیار کیا جائے کہ کوئی آدمی بھول سے بھی سنت چھوڑ نہ پائے، ہم ایسے عادی بن جائیں تو پھر اس کی برکتیں ان شاء اللہ تعالیٰ ظاہر ہوں گی۔

سنت پر عمل کے وقت کیا استحضار کریں؟

اور دوسری بات یہ بھی دھیان میں رکھیں کہ جس وقت سنت کے مطابق عمل کریں، یہ سوچ کر کریں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اسی طرح عمل کرتے تھے، میں بھی اسی لیے کر رہا ہوں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کیا ہے، یہ سوچیں، اس سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت دل میں آئے گی اور سنت کے بے شمار برکات آئیں گے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

(۱) عشقِ نبوی کی حقیقت
(۲) صدق کی اہمیت اور جھوٹ کی قباحت

بمقام: پورٹ الیزابیتھ

بوقت: ۲۲/ ۱۲/ ۲۰۱۶

بمقام: کوسمبا

بوقت: ۳۱/ ۳/ ۲۰۱۷

اقتباس

جو سبق دینا تھا، وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دے دیا کہ محبت کا اصل تقاضا وہ نہیں ہے جو تم کر رہے ہو، محبت کا تقاضا تو یہ ہے کہ میں جو باتیں کہوں، تم اس پر عمل کرو۔ نبئ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضراتِ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو اور ان کے واسطے سے قیامت تک آنے والی پوری امتِ محمدیہ کو یہ سبق دے دیا، ہم اور آپ بھی تو محبت کے دعوے کرتے ہیں، ہم تو یہی کہتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت کرتے ہیں اور ہم بھی تو یہ چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے ساتھ محبت کریں تو اس کا طریقہ ہمیں یہ بتلایا گیا کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات پر، آپ کے ارشادات پر عمل کا اہتمام کیا جائے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الحمدللّٰه نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا، ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا، ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا، من يهده الله فلا مضل له، ومن يضلله فلا هادي له، ونشهد أن لا إلٰه إلا الله وحده لا شريك له، ونشهد أن سيدنا ومولانا محمداً عبده ورسوله، أرسله إلىٰ كافّة الناس بشيراً ونذيراً، وداعياً إلى الله بإذنه وسراجاً منيراً، صلّى الله تعالىٰ عليه وعلىٰ آله وأصحابه وبارك وسلّم تسليماً كثيراً كثيراً. أما بعد!

فَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ أَبِي قُرَادٍ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ تَوَضَّأَ يَوْمًا فَجَعَلَ أَصْحَابُهُ يَتَمَسَّحُونَ بِوَضُوئِهِ، فَقَالَ لَهُمُ النَّبِيُّ ﷺ: مَا يَحْمِلُكُمْ عَلَى هَذَا؟ قَالُوا: حُبُّ اللهِ وَرَسُولِهِ، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: مَنْ سَرَّهُ أَنْ يُحِبَّ اللهَ وَرَسُولَهُ، أَوْ يُحِبَّهُ اللهُ وَرَسُولُهُ فَلْيَصْدُقْ حَدِيثَهُ إِذَا حَدَّثَ، وَلْيُؤَدِّ أَمَانَتَهُ إِذَا ائْتُمِنَ، وَلْيُحْسِنْ جِوَارَ مَنْ جَاوَرَهُ[1].

حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کا ایک عاشقانہ معمول

یہ ایک حدیث ہے جو ابھی آپ کے سامنے پڑھی گئی، جس کو روایت کرنے والے صحابی حضرت عبدالرحمٰن بن ابی قراد رضی اللہ عنہ ہیں، فرماتے ہیں کہ ایک دن نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

[1] شعب الإيمان، بَابٌ فِي تَعْظِيمِ النَّبِيِّ ﷺ وَإِجْلَالِهِ وَتَوْقِيرِهِ ﷺ، ر:۱۴۴۰.

نے وضو فرمایا تو حضراتِ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین آپ کے وضو کے پانی کو لے کر اپنے جسموں اور چہروں پر مَلنے لگے۔

یہ حضراتِ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا ایک عام معمول تھا کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب بھی وضو فرماتے تھے تو حضراتِ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وضو کے پانی کو لے کر اپنے جسموں اور چہروں پر مَل لیا کرتے تھے۔

وضو کے پانی سے کیا مراد ہے؟

حدیث کی شرح کرنے والے علما کے درمیان اس سلسلے میں اختلاف ہے کہ یہاں وضو کے پانی سے کیا مراد ہے؟ ایک مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب وضو فرماتے تھے تو آپ کے اعضائے وضو سے جو پانی ٹپکتا تھا، جیسے چہرہ دھو رہے ہیں تو چہرہ دھوتے ہوئے جو پانی چہرے سے ٹپکنے والا ہوتا تھا یا ہاتھ دھو رہے ہیں تو ہاتھ دھوتے وقت ہاتھوں سے جو پانی ٹپکنے والا ہوتا تھا، حضراتِ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اس کو لے کر اپنے جسموں اور چہروں پر مل لیا کرتے تھے[1]۔ شارحِ بخاری علامہ کرمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی کو راجح قرار دیا ہے۔

دوسرا مطلب یہ بھی ہے کہ اس زمانے میں بڑے برتن میں پانی لے کر وضو کیا جاتا تھا، جیسے تشلا ہے، ٹب ہے، اس کے اندر پانی ہوتا تھا، پہلے اس برتن میں سے انگلیوں کے ذریعے تھوڑا سا پانی لے کر ہاتھوں کو پہنچوں تک دھو لیتے، اس کے بعد ہاتھ اندر ڈال

---

① الكواكب الدراري في شرح البخاري ۳/ ۳٤، باب اسْتِعْمَالِ فَضْلِ وَضُوءِ النَّاسِ، ر:۱۸٦.

کر پانی لے کر وضو کیا جاتا تھا، جب وضو سے فارغ ہو گئے تو برتن میں پانی بچ گیا، اس بچے ہوئے پانی کو بھی ''وضو کا پانی'' کہا جاتا ہے، حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے ''فتح الباری'' میں اسی کو راجح قرار دیا ہے [۱]۔ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: دونوں مطلب ہو سکتے ہیں اور حضراتِ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین دونوں قسم کے پانیوں کے ساتھ یہی معاملہ کیا کرتے تھے۔ بہر حال! چاہے وہ اعضاء سے الگ ہو کر گرنے والا پانی ہو یا برتن کے جس پانی سے وضو کیا جا رہا تھا، اس سے بچا ہوا پانی ہو، حضراتِ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اس پانی کو لے کر کے اپنے جسموں اور چہروں پر مَل لیا کرتے تھے۔

مے خانے کا محروم بھی محروم نہیں

بخاری شریف میں حضرت ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر جب نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم منیٰ سے واپسی میں مقام محصّب پر قیام پذیر ہوئے اور وہاں آپ نے ظہر، عصر، مغرب اور عشاء کی نماز ادا فرمائی، اس موقع پر بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب وضو کیا اور آپ کے اس وضو کے پانی کو لے کر حضرت بلال رضی اللہ عنہ جانے لگے تو حضراتِ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ٹوٹ پڑے اور اس پانی کو لے کر اپنے جسموں اور چہروں پر مَلنے لگے، جس کے حصے میں آیا، آیا، جس کے حصے میں نہیں آیا، وہ دوسرے کے ہاتھ کی تری لے کر کے اپنے جسم پر ملتا تھا [۲]۔

---

۱ فتح الباری، ۱/ ۲۹۵، باب اسْتِعْمَالِ فَضْلِ وَضُوءِ النَّاسِ، ر:۱۸۶.

۲ صحیح البخاری، عَنْ أَبِي جُحَيْفَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، بَابُ الصَّلاَةِ فِي الثَّوْبِ الأَحْمَرِ، ر:۳۸۶.

صحابہ رضی اللہ عنہم کے عشق پر دشمن کی گواہی

صلح حدیبیہ کا واقعہ بخاری شریف میں ہے کہ قریش کی طرف سے حضرت عروہ بن مسعود ثقفی رضی اللہ عنہ - جو قبیلۂ ثقیف کے سرداروں میں سے تھے اور اُس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے اور اس موقع پر قریش کی مدد کے لیے آئے ہوئے تھے، بعد میں ایمان لائے - نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے گفتگو کرنے کے لیے گئے، یہ قصہ بڑا طویل ہے، مختصر یہ ہے کہ جب وہاں سے لوٹے ہیں تو انھوں نے آکر قریش کے سامنے جو حال بیان کیا، وہ یہ تھا کہ:

اے قریش! میں نے دیکھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب **بلغم** نکالتے ہیں تو وہ ان کے ساتھی نیچے نہیں گرنے دیتے بلکہ وہ اپنے ہاتھوں پر لے کر اپنے چہروں اور اپنے جسموں پر مل لیتے ہیں، جب وہ کوئی حکم دیتے ہیں تو ان میں سے ہر ایک اس حکم کو بجالانے کے لیے سبقت کرنے کی کوشش کرتا ہے، جب وہ کوئی بات کرتے ہیں تو سب خاموشی کے ساتھ سنتے ہیں، جب وضو کرتے ہیں تو ان کے وضو کے پانی کے لیے آپس میں لڑتے ہیں اور نگاہ بھر کر ان کی طرف دیکھ نہیں پاتے۔ اس کے بعد کہا: قریش! میں دنیا کے بڑے بڑے بادشاہوں کے درباروں میں گیا ہوں: قیصر، کسریٰ، نجاشی لیکن کسی بھی بادشاہ کے ساتھیوں کو اس بادشاہ کے ساتھ محبت کا وہ معاملہ کرتے نہیں دیکھا، جو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھیوں کو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ کرتے ہوئے میں نے دیکھا ہے[۱]۔

---

(۱) صحيح البخارى، بَابُ الشُّرُوطِ فِي الجِهَادِ إلخ، ر:۲۷۳۱.

بہرحال! میں تو یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ یہ حضراتِ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کا ایک عام معمول تھا۔

حدیث کا خلاصہ

راویٔ حدیث حضرت عبدالرحمٰن بن ابی قراد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دن اسی طرح جب نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے وضو فرمایا تو عادت کے مطابق حضراتِ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے وضو کے پانی کو لے کر اپنے چہروں اور جسموں پر مَلنے لگے، یہ منظر دیکھ کر نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضراتِ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے سوال کیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بعثت کا مقصد اور اہلِ علم کی ذمہ داری

بات اصل میں یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو بھیجا ہی تھا تربیت کے واسطے، جب ان کو یہ کام کرتے ہوئے دیکھا تو اِس موقع پر ان کو کیا تعلیم دینی چاہیے، وہ ان کو دے رہے ہیں، یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا عام معمول تھا۔

اہلِ علم کو بھی یہی چاہیے کہ موقع کی مناسبت سے لوگوں کی تربیت کے متعلق باتیں پیش کرنے کا اہتمام کریں۔

صلحِ حدیبیہ کے موقع پر ایک مرتبہ رات کو بارش ہوئی، نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فجر کی نماز کے بعد حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرف متوجہ ہو کر ارشاد فرمایا کہ تمھارے رب نے آج کیا کہا، تمھیں معلوم ہے؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول زیادہ بہتر جانتے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ: تمھارے رب نے یہ فرمایا کہ آج میرے

کچھ بندے وہ ہیں جو میرے اوپر ایمان لائے اور کچھ بندے وہ ہیں جنھوں نے میرے ساتھ کفر کیا، اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ فرمایا کہ: جن لوگوں نے یہ سمجھا کہ یہ بارش اللہ تعالیٰ کے فضل اور کرم سے ہوئی ہے، وہ اللہ پر ایمان لائے، اللہ تعالیٰ کو ماننے والے بنے اور جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ بارش فلانے ستارے کی وجہ سے، فلانے نکھشتر کی وجہ سے ہوئی ہے تو گویا انھوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کیا۔

زمانۂ جاہلیت میں جب بارش ہوتی تھی تو اس زمانے کے لوگ اس بارش کو کسی نہ کسی ستارے کی طرف منسوب کرتے تھے، یہ زمانۂ جاہلیت کے لوگوں کا عقیدہ تھا، نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس عقیدے کی تردید فرما کر ایک صحیح عقیدہ لوگوں کے ذہنوں میں بٹھا رہے ہیں، بارش کی وجہ سے اس کا موقع تھا تو آپ نے اس موقع کو غنیمت سمجھ کر ان کی تربیت فرمائی، یہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عام معمول تھا۔

حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سوال اور اس کی غرض

یہاں پر بھی حضراتِ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم جب نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وضو کے پانی کو لے کر اپنے جسموں اور چہروں پر ملنے لگے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے موقع کی مناسبت سے ان کی تربیت کرنی چاہی، چناں چہ اس کے لیے پہلے ان سے سوال کیا: مَا يَحْمِلُكُمْ عَلَى هَذَا؟: بھائی! بتلاؤ، تم ایسا کیوں کرتے ہو؟۔

ظاہر ہے، ساری دنیا جانتی ہے اور جب یہ واقعہ ہمارے سامنے پیش کیا جاتا ہے تو ایک معمولی سوجھ بوجھ والا آدمی بھی یہ سمجھ سکتا ہے کہ حضراتِ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین یہ

جو کچھ کرتے تھے، وہ محبت کی وجہ سے کرتے تھے، کوئی پوچھنے کی چیز نہیں، لیکن چوں کہ نبیٔ کریم ﷺ ان کو ایک تعلیم دینا چاہتے تھے؛ اس لیے ان کی زبان سے بلوایا کہ یہ ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ بہر حال! نبیٔ کریم ﷺ نے ان سے یہ سوال کیا: مَا يَحْمِلُكُمْ عَلَى هَذَا؟: تم کو ایسا کرنے پر کون سی چیز آمادہ کر رہی ہے؟ جواب وہی تھا جس کی توقع تھی، چناں چہ جواب میں عرض کیا: حُبُّ اللّٰهِ وَرَسُولِهِ: اے اللہ کے رسول! ہم تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولِ پاک ﷺ کی محبت میں ایسا کر رہے ہیں۔

ایک علمی نکتہ

چوں کہ اہلِ علم ہیں، اس لیے جانتے ہیں کہ ''حُبُّ اللّٰهِ وَرَسُولِهِ'' میں لفظ ''حُبُّ'' مصدر ہے اور مصدر کی اضافت کبھی فاعل کی طرف ہوتی ہے اور کبھی مفعول کی طرف ہوتی ہے، اگر یہاں مصدر کی اضافت مفعول کی طرف مانی جائے تو معنی یہ ہوگا کہ ہم چوں کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ محبت کرتے ہیں، محبت کرنے والے صحابہ اور جس ذات کے ساتھ محبت کی جا رہی ہے، وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول۔ چوں کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ محبت کرتے ہیں، اس لیے ایسا کر رہے ہیں۔

اور اگر اضافت فاعل کی طرف مانی جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ چوں کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولِ پاک ﷺ ہم سے محبت کریں یعنی محبت کرنے والے اللہ اور اس کے رسول اور جن سے محبت کی جا رہی ہے، وہ حضراتِ

صحابہ۔ یہ لفظ ان دونوں مطلبوں کا احتمال رکھتا ہے۔

اس نکتے کو ذکر کرنے کی غرض

چوں کہ آگے حضور ﷺ کا جو جواب آ رہا ہے، اس میں دونوں پہلوؤں کا لحاظ کیا گیا ہے، جب حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم نے جو مبہم جواب دیا تو حضورِ اکرم ﷺ نے ان دونوں پہلوؤں کو پیشِ نظر رکھا؛ کیوں کہ آپ ﷺ تو فصیح وبلیغ تھے اور فصاحت و بلاغت کے اعلیٰ مقام پر فائز تھے، اس لیے میں نے اردو میں ترجمہ بھی اسی اعتبار سے کیا کہ اللہ اور اس کے رسول کی محبت میں ایسا کرتے ہیں، اس صورت میں دونوں مطلب آ جائیں گے۔

حضور ﷺ کا جامع جواب

جب انھوں نے یہ کہا تو اس پر نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: مَنْ سَرَّهُ أَنْ يُحِبَّ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ: جو آدمی یہ پسند کرتا ہو اور یہ چاہتا ہو کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے ساتھ محبت کرے۔ یہ پہلے والا معنی ہے، أَوْ يُحِبَّهُ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ: یا جو یہ چاہتا ہو کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اس کے ساتھ محبت کریں۔

دیکھیے! حضور ﷺ نے جو یہ دو جملے ارشاد فرمائے ہیں، وہ یوں ہی نہیں ہیں بلکہ حضراتِ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے جو مختصر سا جملہ عرض کیا تھا، اس میں دو پہلو تھے، ان دونوں پہلوؤں کو مدنظر رکھتے ہوئے نبیٔ کریم ﷺ نے یہ دو جملے ارشاد فرمائے کہ جو آدمی یہ پسند کرتا ہو کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولِ پاک ﷺ اس کے ساتھ محبت کریں اور کون مسلمان ایسا ہو گا جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولِ پاک ﷺ کے ساتھ محبت نہ کرتا

ہو، یا جو یہ پسند کرتا ہو کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولِ پاک اس کے ساتھ محبت کریں اور کون مسلمان ایسا ہوگا جو یہ نہ چاہتا ہو؟۔

اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت حاصل کرنے کا مختصر نسخہ

فَلْيَصْدُقْ حَدِيثَهُ إِذَا حَدَّثَ، وَلْيُؤَدِّ أَمَانَتَهُ إِذَا ائْتُمِنَ وَلْيُحْسِنْ جِوَارَ مَنْ جَاوَرَهُ: اس کو چاہیے کہ جب بات کرے تو سچی بات کرے اور جب اس کے پاس کوئی امانت رکھی جائے تو اس امانت کو ادا کرنے کا اہتمام کرے اور اپنے پڑوسی کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔

گویا آپ ﷺ نے تین باتیں ارشاد فرمائیں، ان تینوں جملوں کی وضاحت کروں، اس سے پہلے آپ نے جو سبق دیا، اس کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں، متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔

محبت کے اس ظاہری عمل سے صحابہ کو نہ روکنے کا سبب

دیکھو! حضور ﷺ نے حضراتِ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی تربیت فرمائی، صحابہ کا یہ ذہن بنایا کہ محبت کا اصل تقاضا کیا ہے؟ تم جو میرے وضو کا پانی لے کر محبت کی وجہ سے اپنے چہروں اور جسموں پر مل رہے ہو، کیا یہ محبت کا اصل تقاضا ہے؟۔

حضور ﷺ نے ان کو ایسا کرنے سے روکا نہیں کہ ایسا مت کرو، ایسا نہیں کر سکتے، کیوں کہ جو عاشق زار ہوتا ہے، وہ پوچھنے نہیں آتا کہ میں ایسا کروں یا نہیں؟ بلکہ وہ تو محبت کے اندر کر ہی ڈالتا ہے، یہ تو محبت کا فطری تقاضا ہے، غیر اختیاری طور پر ایسا کرتا

ہے، جتنی زیادہ محبت اور عقیدت ہوگی، اتنا زیادہ ویسا کرے گا، حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم محبت اور عقیدت کی زیادتی میں معذور تھے؛ اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو ایسا کرنے سے روکا نہیں کہ ایسا مت کرو؛ بلکہ یہ کرنے دیا۔

محبت کے اس ظاہری عمل پر ایک اہم سبق

لیکن جو سبق دینا تھا، وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دے دیا کہ محبت کا تقاضا وہ نہیں ہے جو تم کر رہے ہو، محبت کا اصل تقاضا تو یہ ہے کہ میں جو باتیں کہوں، تم اس پر عمل کرو۔ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضراتِ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو اور ان کے واسطے سے قیامت تک آنے والی پوری امتِ محمدیہ کو یہ سبق دیا، ہم اور آپ بھی تو محبت کے دعوے کرتے ہیں، ہم تو یہی کہتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت کرتے ہیں اور ہم بھی تو یہ چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے ساتھ محبت کریں تو اس کا طریقہ ہمیں یہ بتلایا گیا کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات پر، آپ کے ارشادات پر عمل کا اہتمام کیا جائے۔

یہاں جو تین باتیں کہی گئیں، کوئی اسی میں محدود نہیں ہے، یہ تو موقع اور محل کی مناسبت سے تین باتیں پیش کی گئی تھیں، ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات اور آپ کے تمام ارشادات اس قابل ہیں اور محبت کا دعوی کرنے والے کے لیے ضروری ہے کہ اس پر عمل کا اہتمام کرے، یہاں بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جن تین اعمال کا ذکر کیا، وہ بھی بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ چناں چہ پہلی بات ارشاد فرمائی: فَلْيَصْدُقْ

حَدِيثَهُ إِذَا حَدَّثَ: جب بات کہے تو سچی بات کہے۔

حدیث کا پہلا جزء: صدق اور سچائی کی اہمیت

سچائی بڑی اہمیت کی حامل چیز ہے، نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جن اوصافِ حمیدہ اور اخلاقِ حسنہ کی تعلیم دینے کے لیے آئے تھے، جیسا کہ ارشاد ہے: إِنَّمَا بُعِثْتُ لِأُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْأَخْلَاقِ: مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے دنیا میں اس لیے بھیجا گیا ہے؛ تاکہ میں پاکیزہ اور اچھے اخلاق کو پایۂ تکمیل تک پہنچاؤں [1]۔

مکارمِ اخلاق میں ایک اہم خُلقِ حسن: صدق اور سچائی ہے، یہ بڑا اہمیت رکھتا ہے، جب سے آپ کی تبلیغ شروع ہوئی، اسی وقت سے لوگوں کو اس کی تعلیم کا اور اس طرف متوجہ کرنے کا اہتمام کرتے تھے بلکہ خود آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اس سے متصف تھے، مکہ والوں نے آپ کو جو لقب دیا تھا، وہ الصادق الأمین کا لقب تھا، یہ دونوں اوصاف آپ کے اندر بڑے ممتاز تھے، اسی وجہ سے قوم کی طرف سے آپ کو یہ لقب دیا گیا تھا۔

شاہِ روم کی طرف حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دعوتی خط کا واقعہ

صدق اور سچائی بڑی اہمیت رکھتی ہے، چناں چہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات کو جہاں مختصر انداز میں بیان کیا گیا ہے، حدیث پڑھنے والے جانتے ہیں کہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دنیا کے بادشاہوں کے نام دعوتِ اسلام کے خطوط بھیجے تو ایک خط آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے

---

(۱) السنن الكبرى للبيهقي، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضي الله عنه، بَابُ بَيَانِ مَكَارِمِ الْأَخْلَاقِ وَمَعَالِيهَا إلخ، ر:۲۰۷۸۲.

قیصر ہرقل شاہِ روم کے نام بھی بھیجا تھا۔

اور یہ اتفاق کی بات تھی کہ جس زمانے میں وہ خط بھیجا گیا تھا، اُس زمانے میں وہ اپنی ایک منت اور نذر پوری کرنے کے لیے شام، بیت المقدس پہنچا ہوا تھا، اس نے ایک منت مانی تھی کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھے میرے دشمن فارس کے مقابلے میں کامیابی دے گا تو میں بیت المقدس کی پیدل زیارت کروں گا، چناں چہ جب اس کو فارس کے مقابلے میں کامیابی ملی تو اس نذر کو پورا کرنے کے لیے وہ پہلے قسطنطنیہ سے حلب آیا، یہ حلب بھی روم کا پایۂ تخت تھا، وہاں سے وہ باقاعدہ پیدل یروشلم گیا اور بیت المقدس کی زیارت کی۔

اسی وقت نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وہ خط اس کو دیا گیا اور اس کو بتلایا گیا کہ عرب کے اندر ایک شخص ظاہر ہوئے ہیں جو اپنے آپ کو اللہ کا رسول اور نبی بتاتے ہیں، اس کی طرف سے یہ خط آپ کے نام بھیجا گیا ہے۔

زمانۂ نبوی میں دینِ عیسائیت کے دو سب سے بڑے عالم

یہ ہرقل اگلی آسمانی کتابوں کا بہت بڑا عالم بھی تھا، اس زمانے میں عیسائیوں کے اندر اگلی آسمانی کتابوں کے دو ہی بڑے عالم تھے، ایک تو یہ خود قیصرِ روم جس کا نام ہرقل تھا، وہ بادشاہ ہونے کے باوجود تمام آسمانی کتابوں اور صحیفوں کا بہت بڑا عالم تھا اور دوسرا اس زمانے میں عیسائیوں کا جولاٹ پادری تھا، سب پادریوں کا سردار، اسقف الأساقفہ جس کا نام ضغاطر تھا، وہ بھی بہت بڑا عالم تھا، یہ دو بڑے عالم تھے۔

بادشاہ خود دین عیسائیت کا بہت بڑا عالم تھا اور چوں کہ اگلی آسمانی کتابوں میں نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی جو بشارتیں بتلائی گئی ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی جو نشانیاں اور علامتیں بتلائی گئی ہیں اوران سے وہ اچھی طرح واقف تھا۔ خیر! اس کے پاس یہ خط پہنچایا گیا اور اس کو یہ بتلایا گیا کہ عرب کے اندر ایک شخص ہیں جو اپنے آپ کو اللہ کا نبی بتلاتے ہیں، ان کی طرف سے یہ خط آپ کو بھیجا گیا ہے، یہ پہلا موقع تھا جب اس کے علم میں یہ بات آئی کہ ایک نبی ظہور پذیر ہوئے ہیں۔

اس نے فوراً اس خط کو کھول کر پڑھا نہیں؛ بلکہ یہ طے کیا کہ اس سے پہلے - یہ اس کی عقل اور دانش مندی تھی کہ سب سے پہلے - اس شخص کے حالات اور اوصاف معلوم کیے جائیں، چناں چہ اس نے درباریوں سے پوچھا کہ: جس کی طرف سے یہ خط بھیجا گیا ہے کہ اس شخص نے جس علاقے سے خط بھیجا ہے، اس علاقے کا کوئی آدمی یہاں موجود ہے؟ لوگوں نے بتلایا کہ: اس علاقے سے تجارتی قافلے آتے رہتے ہیں، ہم تلاش کرتے ہیں، ممکن ہے کوئی قافلہ مل جائے۔

حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ سے قیصر کے سوالات

تحقیق کی تو پتہ چلا کہ ایک قافلہ مکۂ مکرمہ سے آیا ہوا ہے اور اتفاق کی بات کہ اس قافلے کے سردار ابوسفیان تھے جو اُس وقت اسلام کے سب سے بڑے دشمن تھے، چناں چہ ہرقل نے باقاعدہ دربار سجایا، منعقد کیا اور اس قافلے کے لوگوں کو بلایا اور ان ہی سے ہرقل نے کچھ سوالات کیے جس کے جوابات انھوں نے دیے اور ان کے ان جوابات

ہی سے ہرقل نے یہ نتیجہ نکالا کہ جس کی طرف سے یہ خط آیا ہے، وہ نبیٔ برحق ہیں۔

ہرقل نے سب سے پہلا سوال یہ کیا تھا کہ: یہ شخص جو نبوت کا دعوی کرتے ہیں، اپنے آپ کو اللہ کا نبی کہتے ہیں، ان کے ساتھ خاندانی اور نسبی اعتبار سے تم میں سب سے زیادہ کون قریبی تعلق رکھنے والا ہے؟ یہ سوال اس لیے تھا کہ جو خاندانی اعتبار سے سب سے زیادہ قریب ہوگا، وہ اتنا ہی زیادہ اندرونی حالات واقف ہوگا۔ ابوسفیان نے کہا کہ: میں سب سے زیادہ قریب ہوں اور اتفاق کی بات کہ وہی خاندانی اعتبار سے سب سے زیادہ قریب تھے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ابوسفیان کی نسبی رشتہ داری

اس لیے کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جو دادا ہیں عبد المطلب، ان کے دادا عبد مناف ہیں، عبد مناف کے چار بیٹے تھے: (۱) ہاشم (۲) مطلب (۳) نوفل (۴) عبد شمس۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہاشم کی اولاد میں سے ہیں اور ابوسفیان عبدِ شمس کی اولاد میں سے ہیں، گویا اس قافلے میں خاندانی اور نسبی اعتبار سے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سب سے زیادہ قریبی رشتہ دار یہی ابوسفیان تھے۔

چناں چہ ہرقل نے ان کو آگے بٹھایا اور دوسروں کو پیچھے بٹھا کر اپنے ترجمان کے ذریعہ سے ابوسفیان کے ساتھیوں سے کہا کہ دیکھو! میں ان سے کچھ سوالات کروں گا، اگر اس کے جواب میں یہ جھوٹ اور دروغ گوئی سے کام لیں تو تم بتا دینا۔

یہ واقعہ خود ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے اسلام لانے کے بعد حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما

کے سامنے بیان کیا، بخاری شریف کی روایت میں ہے: حَدَّثَنِي أَبُو سُفْيَانَ مِنْ فِيهِ إِلَى فِيَّ: یعنی ان کے منہ سے میرے منہ تک یعنی سیدھا، بہ راہِ راست، رُوبرو انھوں نے یہ حدیث میرے سامنے بیان کی ہے۔

مجھے گوارا نہیں کہ میری طرف جھوٹ کی نسبت ہو

اس میں ابوسفیان کہتے ہیں کہ مجھے یہ یقین تھا کہ اگر میں بادشاہ کے سامنے جھوٹ کہوں گا تو برسرِ دربار میرے ساتھیوں میں سے کوئی بھی میری تغلیط اور تکذیب نہیں کرے گا، یعنی بادشاہ سے تو کوئی نہیں کہے گا کہ انھوں نے یہ غلط جواب دیا ہے لیکن وہاں سے واپس آنے کے بعد مکہ میں اس کا ضرور چرچا ہوگا کہ وہاں بادشاہ کی طرف سے ایسے سوالات کیے گئے تھے اور انھوں نے اس کا غلط جواب دیا تھا، میری طرف جھوٹ کی نسبت ہوگی، ابوسفیان کہتے ہیں کہ میں اس کو اپنے لیے گوارا نہیں کرسکتا تھا۔

دیکھئے! ایک کافر اور مشرک جو کفر اور شرک کی غلاظتوں کے اندر ملوث ہے، وہ بھی جھوٹ کو اپنے لیے گوارا نہیں کرتا۔

بہرحال! بادشاہ نے ان سے بہت سارے سوالات کیے، بخاری شریف میں بڑی لمبی چوڑی روایت ہے، دس سولات کیے اور انھوں نے اس کے جوابات دیے اور ان کے ان جوابات سے ہرقل نے یہ نتیجہ نکالا کہ یہ نبیٔ برحق ہیں اور وہی آخری نبی ہیں جن کی بشارتیں اگلی آسمانی کتابوں میں ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات کا خلاصہ

اسی روایت میں اخیر میں یہ ہے کہ یہ سب ہو چکنے کے بعد ہرقل نے ابوسفیان سے پوچھا: مَاذَا يَأْمُرُكُمْ بِهِ؟ یہ نبی تم کو کس چیز کا حکم دیتے ہیں؟ تو ابوسفیان نے جواب میں کہا تھا: يَأْمُرُنَا بِالصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ وَالصِّدْقِ وَالعَفَافِ وَالصِّلَةِ: یہ نبی ہم کو نماز کا، سچائی کا اور عفّت و پاک دامنی اور صلہ رحمی کا حکم دیتے ہیں ①۔

گویا نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات کا خلاصہ آپ کے بہت بڑے دشمن نے اُس زمانے کے ایک بہت بڑے بادشاہ کے سامنے جو پیش کیا، ان میں جن خوبیوں اور اوصاف کو بیان کیا جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بنیادی تعلیمات کی حیثیت رکھتی ہیں، ان میں صدق اور سچائی کو بھی بیان کیا۔

سچائی ہر قسم کی خوبیاں حاصل کرنے کی کلیدِ اعظم

مسلم شریف میں ہے، نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: عَلَيْكُمْ بِالصِّدْقِ، فَإِنَّ الصِّدْقَ يَهْدِي إِلَى الْبِرِّ، وَإِنَّ الْبِرَّ يَهْدِي إِلَى الْجَنَّةِ کہ: تم سچائی کو لازم پکڑ رکھو، اس لیے کہ سچائی ''بر'' کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ ''بر'' کہتے ہیں ہر خوبی اور ہر نیکی کو، نیکی کے جتنے بھی کام ہیں، وہ سارے کام لفظ ''بر'' کے اندر آ جاتے ہیں، گویا سچ آدمی کو تمام خوبیوں اور نیکیوں کی طرف لے جاتا ہے اور یہ بر اور نیکیاں آدمی کو جنت تک لے جاتی ہیں۔

---

① صحيح البخاري، عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ رضي الله عنهما، كَيْفَ كَانَ بَدْءُ الوَحْيِ إِلَى رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ، ر:۷.

معلوم ہوا کہ جس کو جنت میں جانا ہو، اس کو چاہیے کہ وہ سچائی کو اختیار کرے، اس لیے کہ یہ ایسا وصف ہے جس کے نتیجے میں آدمی ساری خوبیاں اور نیکیاں حاصل کر سکتا ہے۔ دیکھو! بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنا حال درست کرنا چاہتے ہیں اور وہ یہ چاہتے ہیں کہ ہم آسانی کے ساتھ راہِ راست پر آجائیں تو یہاں نبیٔ کریم ﷺ نے راہِ راست پر آنے کے لیے ہم کو ایک پوائنٹ کی بات بتلادی، ایک گر بتلایا کہ جو آدمی خوبیاں حاصل کرنا چاہتا ہے، آسانی کے ساتھ راہِ راست پر آنا چاہتا ہے تو اس کے لیے اولین وہلہ میں چاہیے کہ وہ سچائی کو اختیار کرے، گویا یہ خوبیاں حاصل کرنے کی ''ماسٹر کی'' ہے، گرو چابی ہے، آپ سچائی کو لازم پکڑلیں گے تو اللہ تبارک وتعالیٰ اس کی برکت سے ساری خوبیاں آپ کے اندر پیدا فرمادیں گے۔

جھوٹ ہر قسم کی برائی کی جڑ

اس کے بالمقابل جھوٹ ہے، اسی حدیث میں آگے حضور ﷺ نے فرمایا:
وَإِيَّاكُمْ وَالْكَذِبَ، فَإِنَّ الْكَذِبَ يَهْدِي إِلَى الْفُجُورِ، وَإِنَّ الْفُجُورَ يَهْدِي إِلَى النَّارِ: تم جھوٹ سے بچو، اس لیے کہ جھوٹ فجور یعنی ہر قسم کے گناہ اور برائیوں کی طرف لے جاتا ہے اور برائی آدمی کو جہنم تک پہنچاتی ہے[۱]۔

گویا ساری برائیوں کی جڑ جھوٹ ہے، یہ حضور ﷺ نے ہم کو بتلا دیا اور اتنا ہی نہیں بلکہ اور مواقع پر آپ نے جو ارشادات فرمائے، ان سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

---

(۱) صحیح مسلم، عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ رضی اللہ عنہ، بَابُ قُبْحِ الْكَذِبِ وَحُسْنِ الصِّدْقِ، ر:۲۶۰۷.

اوپر پہلے بتلایا: عَلَيْكُمْ بِالصِّدْقِ کہ: تم سچائی کو لازم پکڑو، فَإِنَّ الصِّدْقَ يَهْدِي إِلَى الْبِرِّ: اس لیے کہ سچائی آدمی کو ''بر'' کی طرف رہنمائی کرتی ہے، نیکی کے راستے پر لگا دیتی ہے، وَإِنَّ الْبِرَّ يَهْدِي إِلَى الْجَنَّةِ: اور نیکی والا راستہ آدمی کو جنت تک لے جاتا ہے۔

بعض نیکیاں دوسری نیکیوں کا ذریعہ

ایک عجیب طریقہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بتلایا، بعض نیکیاں ایسی ہوتی ہیں جو دوسری نیکیوں کا ذریعہ بنتی ہیں کہ اگر آپ اس نیکی کو اپنالیں تو اللہ تعالیٰ اس نیکی کی برکت سے آپ کو دوسرے نیک کاموں کی توفیق عطا فرماتے ہیں، ان ہی نیکیوں میں سے ایک نیکی یہ سچائی ہے کہ آدمی جب سچائی کو اپنالے اور جھوٹ سے اپنے آپ کو دور کردے تو اس کو دوسرے نیک کاموں کی توفیق ملتی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شانِ تربیت کا عجیب واقعہ

ایک مرتبہ ایک آدمی نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے عرض کیا کہ: اے اللہ کے رسول! میں بہت سی برائیوں میں مبتلا ہوں: چوری بھی کرتا ہوں، زنا کا ارتکاب بھی کرتا ہوں، شراب بھی پیتا ہوں، جھوٹ بھی بولتا ہوں، اب یہ ساری برائیاں بہ یک وقت چھوڑنا میرے لیے مشکل ہے، ایک ایک کرکے سب کو چھوڑنا چاہتا ہوں تو آپ مجھے مشورہ دیں کہ میں پہلے کس گناہ کو چھوڑوں؟

اب آپ اندازہ لگائیے کہ کسی سے بھی سوال کیا جاتا تو اس لسٹ اور فہرست میں جو چار چیزیں ہیں: (۱) چوری (۲) زنا (۳) شراب نوشی (۴) جھوٹ، ہماری نظر میں ان

میں ہلکا اور کم سے کم درجے کا گناہ جھوٹ ہے، اس لیے ہم سے اگر پوچھا جاتا تو ہم تو کسی بڑے گناہ کو چھوڑنے کا حکم دیتے کہ زنا مت کرنا، چوری مت کرنا۔

لیکن نبیٔ کریم ﷺ کی شانِ تربیت دیکھیے، اس میں دونوں پہلو ہیں: ایک تو یہ کہ سامنے والے کو عمل میں آسانی ہو اور وہ بھی پوری رضا اور رغبت کے ساتھ اس پر عمل کرنے پر تیار ہو جائے، اس لیے فرمایا کہ جھوٹ چھوڑ دو۔ وہ آدمی یہ سن کر خوش ہو گیا کہ چلو! اچھا ہے، بہت سستا سودا ہے، چناں چہ اس نے قبول کر لیا کہ میں جھوٹ چھوڑ دیتا ہوں۔ اُس زمانے کے لوگ اپنے وعدے اور عہد و پیمان کے پکے ہوا کرتے تھے، ایسا نہیں کہ سامنے کچھ اور پیچھے کچھ، لہٰذا اس نے طے کر لیا کہ جھوٹ کو چھوڑنا ہے۔

اس کے بعد دل میں تقاضا ہوا چوری کا تو اس نے سوچا کہ اگر میں نے چوری کر لی اور بعد میں مجھے پوچھا گیا کہ تو نے چوری کی؟ تو چوں کہ میں جھوٹ تو چھوڑ چکا ہوں، اس لیے مجھے سچ بولنا پڑے گا اور کہوں گا کہ ہاں کی ہے، تو میرا ہاتھ کٹے گا، اس لیے اس نے چوری کا ارادہ چھوڑ دیا۔

پھر شراب پینے کی دل میں خواہش پیدا ہوئی، تقاضا ہوا، اس وقت بھی یہی سوچا کہ میں شراب تو پی لوں گا لیکن جب مجھ سے پوچھا جائے گا کہ تو نے شراب پی ہے؟ تو چوں کہ میں جھوٹ چھوڑنے کا وعدہ کر چکا ہوں، اس لیے مجھے اقرار کرنا ہوگا اور اقرار کروں گا تو میرے اوپر سزا جاری ہوگی، یہی حال زنا کے سلسلے میں بھی ہوا۔

ایک جھوٹ کیا چھوٹا، سارے گناہ چھوٹ گئے، اسی لیے جھوٹ کو سارے گناہوں کی جڑ قرار دیا گیا ہے۔ ہمارے معاشرے میں جھوٹ کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی،

حالاں کہ اسلاف کے حالات کا اگر آپ مطالعہ کریں گے تو پتہ چلے گا کہ ان کے یہاں جھوٹ کو بہت بڑا عیب سمجھا جاتا تھا۔

اولاد کو سچائی کا عادی بنائیں

اس لیے ضرورت ہے کہ جب ہم اپنی اولاد کی تربیت کریں تو جھوٹ کی قباحت بھی ان کے سامنے واضح کر کے بیان کریں، حدیث میں بھی آتا ہے کہ بچوں کو سچ بولنے کا عادی بناؤ، جب بچے جھوٹ بولنے کے عادی بن جاتے ہیں تو سارے کام کر ڈالتے ہیں، اب اگر آپ ان سے پوچھیں گے کہ تم نے یہ گناہ کیا، یہ غلط کام کیا تو وہ بے دھڑک جھوٹ بول دیتا ہے کہ میں نے نہیں کیا، اگر آپ نے اس میں سچ کی عادت ڈالی ہے تو آپ کو صحیح اور سچ بتادے گا اور آپ کو اس کی اصلاح کا موقع ملے گا۔

بچوں کے سامنے جھوٹ نہ بولیں

عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ جب ماں اپنے بچے کو بلانا چاہتی ہے، بچہ دور ہوتا ہے اور کسی طرح آتا نہیں ہے تو ماں بچے کو کچھ دینے کی لالچ دلاتی ہے، ابوداؤد شریف میں ہے کہ ایک عورت اپنے بچے کو بلا رہی تھی کہ: بیٹے آجاؤ، میں تم کو کچھ دوں گی، اِدھر آجاؤ، حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس عورت کی یہ بات سن کر اس سے پوچھا کہ: جب تو نے اپنے بچے سے یوں کہا کہ تو آجا، میں تجھے کچھ دوں گی تو کیا تیرا ارادہ اس کو کچھ دینے کا تھا؟ اس عورت نے کہا کہ ہاں، اے اللہ کے رسول! میرے پاس ایک کھجور تھی اور میرے دل میں یہی تھا کہ وہ آئے گا تو میں اس کو یہ دوں گی تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: أَمَا

إِنَّكِ لَوْ لَمْ تُعْطِهِ شَيْئًا كُتِبَتْ عَلَيْكِ كِذْبَةٌ: اگر تو کچھ دینے کا ارادہ نہ رکھتی تو تیرے نامۂ اعمال میں ایک جھوٹ لکھا جاتا[1]۔

حضرت مولانا سید محمد بدرِ عالم صاحب میرٹھیؒ کا مختصر تعارف

دیکھئے! ہم لوگ جھوٹ کے معاملے میں کیسی بے احتیاطیاں کرتے ہیں، بعض اوقات ایسی چیز کہ جس کو ہم ظاہر میں ہلکی سمجھتے ہیں لیکن حقیقت میں وہ جھوٹی بات ہوتی ہے، ہمارے اکابر میں حضرت مولانا سید بدر عالم صاحب رحمۃ اللہ علیہ بہت بڑے بزرگ گذرے ہیں، ہمارے یہاں ڈابھیل میں ۱۷؍سال تک انھوں نے پڑھایا ہے، حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے خاص شاگرد ہیں اور ان کی بخاری شریف کی تقریر انھوں نے ہی ضبط کی اور فیض الباری کے نام سے چھپی، بڑے صاحبِ کشف بزرگ تھے۔

ان کے صاحب زادے ہیں مولانا سید آفتاب عالم میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ، بہت سال پہلے کی بات ہے، میں سمجھتا ہوں کہ ۴۲ یا ۴۵؍سال پہلے کی بات ہے، اب تو ان کا بھی انتقال ہو گیا ہے، وہ ڈابھیل تشریف لائے تھے اور ہمارے حضرت مہتمم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں تین روز ان کا قیام رہا تھا، ہم اساتذہ کی ان کے یہاں مجلس ہوتی تھی، وہ اپنے والد حضرت مولانا سید محمد بدر عالم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے واقعات سناتے تھے۔

مولانا بدرِ عالم صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور جھوٹ سے اجتناب

ایک مرتبہ انھوں نے سنایا کہ ایک دن حضرت پر ایک آدمی کا خط آیا اور اس خط

---

[1] سنن أبی داود، عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَامِرٍ رضی اللہ عنہ، بَابٌ فِي التَّشْدِيدِ فِي الْكَذِبِ، ر:۴۹۹۱.

میں لکھا تھا کہ اس کی بیوی یا والدہ (دونوں میں سے ایک) کا انتقال ہوگیا ہے، خود حضرت خط کا جواب نہیں لکھ سکتے تھے تو لکھواتے ہوئے فرمایا کہ: لکھو کہ تمھارا خط ملا آپ کی والدہ/ بیوی کے انتقال کی خبر سے بہت دکھ ہوا۔ مولانا سید آفتاب عالم میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ کہہ کر مجھے لکھنے سے روکتے ہوئے فرمایا کہ: ذرا ٹھہر جاؤ، اس کے بعد گردن جھکا کر کچھ سوچا اور فرمایا کہ ٹھیک ہے، اب لکھو۔ مولانا سید آفتاب عالم کہتے ہیں کہ میں نے پوچھا کہ ابا جان! کچھ دیر کے لیے آپ نے مجھے لکھنے سے کیوں روک دیا تھا اور پھر وہی بات لکھوائی؟ تو حضرت نے فرمایا کہ: جب میں نے یہ جملہ لکھوایا ''بہت دکھ ہوا'' تو میں نے خیال کیا کہ اس کی بیوی یا والدہ کی وفات کی خبر پر مجھے دکھ تو ہوا تھا لیکن کیا وہ دکھ اتنا تھا کہ میں اس کو یوں لکھوا سکوں کہ ''بہت دکھ ہوا'' اگر بہت نہیں تھا اور میں لکھوا دوں کہ ''بہت دکھ ہوا'' تو یہ جھوٹ ہو جائے گا۔ یہ ہیں ہمارے بزرگ جو جھوٹ سے بچنے کے معاملے میں اتنا زیادہ اہتمام کرتے تھے۔

بچوں کی تربیت کا انوکھا انداز

یہ جھوٹ بہت خطرناک گناہ ہے، اسی لیے حدیث میں آتا ہے: إِذَا كَذَبَ العَبْدُ تَبَاعَدَ عَنْهُ المَلَكُ مِيلًا مِنْ نَتْنِ مَا جَاءَ بِهِ؟ کہ: جب آدمی جھوٹ بولتا ہے تو فرشتہ اس کی بدبو کی وجہ سے ایک میل دور چلا جاتا ہے[۱]۔

حضرت مولانا قاری امیر حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہمارے ماضی قریب کے بہت

(۱) سنن الترمذی، عَنْ ابْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہما، بَابُ مَا جَاءَ فِي الصِّدْقِ وَالكَذِبِ، ر:۱۹۷۲.

بڑے بزرگوں میں سے گذرے ہیں، حضرت شیخ مولانا زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اکابر خلفاء میں سے تھے، وہ فرماتے تھے کہ: ہم جب بچے تھے تو ہمارے گھر کے بڑے ہمیں کہتے تھے کہ دیکھو! جھوٹ بولوگے تو منہ میں سے بدبو آئے گی- اور ظاہر ہے کہ جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہا ہے تو بدبو تو آئے گی- تو ہم لوگ آپس میں ایک دوسرے کو اپنا منہ سونگھواتے تھے کہ دیکھو! میرے منہ میں سے بدبو تو نہیں آرہی ہے؟ یہ تربیت کا ایک انداز ہے۔

جھوٹ اور ایمان جمع نہیں ہوسکتے

بہرحال! جھوٹ بڑا خطرناک جرم ہے، ایک حدیث میں ہے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا گیا: أَيَكُونُ الْمُؤْمِنُ جَبَانًا؟ کیا مؤمن بزدل ہوسکتا ہے؟ تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: ہاں! ہوسکتا ہے، پھر پوچھا گیا: أَيَكُونُ الْمُؤْمِنُ بَخِيلًا؟ مؤمن بخیل ہوسکتا ہے؟ تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: ہاں! ہوسکتا ہے، پھر پوچھا گیا: أَيَكُونُ الْمُؤْمِنُ كَذَّابًا؟ مؤمن جھوٹا ہوسکتا ہے؟ تو فرمایا کہ: نہیں! مؤمن جھوٹا نہیں سکتا۔ گویا جھوٹ اور ایمان یہ دو چیزیں جمع نہیں ہوسکتیں [۱]۔

اللہ کی طرف سے صدّیق اور کذّاب کا لقب

اسی مسلم شریف والی حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: وَمَا يَزَالُ الرَّجُلُ

---

(۱) شعب الإيمان، عَنْ صفْوَانَ بْنِ سُلَيْمٍ رضي الله عنه، بَابٌ فِي حِفْظِ اللِّسَانِ عَمَّا لَا يَحْتَاجُ إِلَيْهِ، ر:۴۴۷۲.

يَصْدُقُ وَيَتَحَرَّى الصِّدْقَ حَتَّى يُكْتَبَ عِنْدَ اللهِ صِدِّيقًا: اورآدمی سچ بولتا رہتا ہے اورسچائی کاارادہ کرتاہے، یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں بھی ”صدیق“ لکھاجاتاہے۔

اس کے برعکس دوسری چیز جھوٹ ہے،فرمایا: وَإِيَّاكُمْ وَالْكَذِبَ: اپنے آپ کو جھوٹ سے بچاؤ، فَإِنَّ الْكَذِبَ يَهْدِي إِلَى الْفُجُورِ: اس لیے کہ جھوٹ آدمی کو گناہ والے راستے پرڈال دیتاہے، وَإِنَّ الْفُجُورَ يَهْدِي إِلَى النَّارِ: اورگناہ والا راستہ آدمی کو آخرکار جہنم میں پہنچادیتا ہے، وَمَا يَزَالُ الرَّجُلُ يَكْذِبُ وَيَتَحَرَّى الْكَذِبَ حَتَّى يُكْتَبَ عِنْدَ اللهِ كَذَّابًا: اورآدمی برابر جھوٹ بولتا رہتا ہےاورجھوٹ کا قصد کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کو”بہت بڑا جھوٹا“ لکھا جاتا ہے۔

خطرناک حالات میں بھی اکابر کے یہاں سچ کا اہتمام

حقیقت تو یہ ہے کہ جھوٹ بہت بری چیز ہے،اس سے اپنے معاشرے کو بچانے کی ضرورت ہے، ہمارے اکابر کے یہاں اس کا بڑا اہتمام تھا، جہاں جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں، وہاں بھی وہ جھوٹ نہیں بولتے تھے۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں کتابوں میں یہ واقعہ لکھا ہے کہ آپ کے خلاف گرفتاری کا وارنٹ جاری کیا گیا تھا،میدانِ شاملی میں انگریزوں سے مقابلہ ہوااوراس میں ناکامی ہوئی، بعدمیں یہ سب حضرات روپوش ہوگئے تھےاور سب کے خلاف باقاعدہ وارنٹ (warrants) جاری ہوئے، اب سب کی تلاشی ہو رہی ہے، اسی دوران ایک مرتبہ آپ چھتہ کی مسجد میں تھے، کسی مخبر نے حضرت کی وہاں

موجودگی کی اطلاع سرکاری افسر کو کر دی تو پولیس آپ کو گرفتار کرنے کے لیے وہاں پہنچ گئی، اب حضرت کا لباس تو بڑا سادہ اور معمولی ہوا کرتا تھا، دیہاتی سے معلوم ہوتے تھے، پولیس وہاں آئی اور دیکھا کہ ایک آدمی ہے، اس سے پوچھا کہ مولانا قاسم کہاں ہیں؟ وہ حضرت مولانا قاسم صاحب ہی تھے، حضرت جانتے تھے کہ یہ سرکاری آدمی ہے، حضرت جہاں کھڑے تھے، وہاں سے ذرا ہٹ گئے اور اس جگہ کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے کہ ابھی یہاں تھے۔

دیکھئے! ایسے موقع پر بھی حضرت نے صریح جھوٹ کا ارتکاب نہیں کیا اور کتابوں میں لکھا ہے کہ کبھی اس طرح کا موقع پیش آجائے تو صریح جھوٹ سے پرہیز کرے اور کنایہ اور تعریض سے کام لے۔

آمدم برسرِ مطلب

نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرما رہے ہیں کہ جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اللہ اور رسول اس کے ساتھ محبت کرے یا اللہ اور اس کے رسول اس کے ساتھ محبت کریں تو فَلْيَصْدُقْ حَدِيثَهُ إِذَا حَدَّثَ کہ: جب بھی بات کرے تو سچی بات کرے، سچی بات کہنا بھی ایمان کا ایک حصہ ہے۔

بہر حال! جھوٹ بہت برا وصف ہے، اس لیے اس سے اپنے آپ کو دور رکھنے کی ضرورت ہے اور سچائی کو اپنانے کی ضرورت ہے اور پھر سچائی قول میں بھی ہوتی ہے، فعل میں بھی ہوتی ہے اور نیتوں میں بھی ہوتی ہے، جو آدمی جتنا زیادہ پختہ ہوگا، وہ ان ساری

چیزوں میں سچائی کا اہتمام کرے گا۔

منافق کی تین علامتیں

جھوٹ ہر قسم کی خرابیوں کی جڑ ہے، اسی وجہ سے نفاق کی بنیادی علامتوں میں جھوٹ کو نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سرِ فہرست ذکر فرمایا، چناں چہ ارشاد فرمایا: آيَةُ المُنَافِقِ ثَلاَثٌ: إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ، وَإِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ، وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ [1]، اور مسلم شریف کی حدیث میں فرمایا: وَإِنْ صَامَ وَصَلَّى وَزَعَمَ أَنَّهُ مُسْلِمٌ [2] منافق کی علامتیں تین ہیں: (۱) جب بات کرے تو جھوٹ بولے (۲) اور جب وعدہ کرے تو وعدہ خلافی کرے (۳) اور جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت کرے، چاہے وہ نماز بھی پڑھتا ہو، روزے بھی رکھتا ہو اور اپنے منہ سے اپنے بارے میں یوں کہتا ہو یا اپنے متعلق یوں سمجھتا ہو کہ میں مسلمان ہوں۔

حدیث کا دوسرا جزء: امانت کا معنیٰ ومفہوم

دوسری چیز نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمائی: وليؤد أمانته إذا اؤتمن، اب امانت کا کیا مطلب ہے؟ امانت کا ایک مطلب تو مشہور ہے، ہم اور آپ جب اپنی زبان سے لفظِ امانت استعمال کرتے ہیں تو ہر خاص وعام جانتا ہے کہ کسی کے پاس کوئی چیز حفاظت کے لیے رکھی گئی ہے، وہ امانت کہلاتی ہے۔ یہ امانت ضرور ہے؛ لیکن قرآن

---

(۱) صحيح البخاری، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ، كِتَابُ الإِيمَانِ، بَابُ عَلاَمَةِ المُنَافِقِ، ر: ۳۳.

(۲) صحيح مسلم، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ، كِتَابُ الإِيمَانِ، بَابُ بَيَانِ خِصَالِ الْمُنَافِقِ، ر: ۱۰۹.

وحدیث میں خالی اسی کو امانت نہیں کہتے، عربی کے اندر امانت کا لفظ اس سے زیادہ وسیع معنی اور وسیع مفہوم کے اندر بولا جاتا ہے جس کو ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ کسی معاملہ میں کسی کے اوپر اعتماد کرنا، اس کا نام ہے عربی زبان میں امانت۔

مثال سے امانت کے معنی کی تفہیم

آپ پر اعتماد کر کے جو کام آپ کو سونپا گیا ہے تو اس کام کو ''امانت'' سے تعبیر کیا جائے گا، جیسے کسی کمپنی نے آپ پر اعتماد کر کے آپ کو اس کمپنی کا منیجر بنایا ہے کہ اس کمپنی کو چلانے کی ساری ذمہ داری آپ کے حوالے ہے اور آپ کو ماہانہ اتنی تنخواہ دی جائے گی، آپ کو یہ فیسیلٹی دی جائے گی، ایک مستقل آفس دیا جائے گا، رہنے کے لیے بنگلہ دیا جائے گا، آمد و رفت کے لیے گاڑی دی جائے گی، اس طرح سب کچھ طے کر کے کمپنی اس کو سونپ دی، اس کی ساری ذمہ داری اس کے حوالے کر دی گئی۔ ہر جگہ ایسا ہی ہوتا ہے، جب کسی کے ساتھ اس طرح کا معاملہ کیا جاتا ہے تو جو معاملہ کیا گیا، اس کے بعد وہ کام اس کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔

مثال کے طور پر آپ کسی مدرسے میں پڑھاتے ہیں، اسکول میں آپ ٹیچر ہیں تو اسکول کی کمیٹی نے یا اسکول کے پرنسپل نے آپ کے ساتھ معاملہ کیا کہ آپ کو ہماری اسکول میں یہ یہ مضامین پڑھانے ہیں، پھر اس کی ایک تنخواہ مقرر کی گئی اور معاہدہ مکمل ہو گیا، ایگریمنٹ (agreement) ہو گیا اور آپ سے کہا گیا کہ اب آپ پڑھانے کا کام شروع کر دو اور پڑھاؤ۔

اب آپ اپنا کام کریں گے تو آپ کے کام کے اوپر کوئی نگران مقرر نہیں ہے، کوئی واچ نہیں رکھی گئی ہے یعنی ایسا نہیں ہے کہ دو آدمی آپ کے ساتھ رہیں گے جو یہ دیکھتے رہیں گے کہ آپ پڑھا رہے ہیں یا نہیں پڑھا رہے ہیں، آپ کو جو ڈیوٹی سونپی گئی، اس ڈیوٹی کی ادائیگی کے معاملے میں آپ پر بھروسہ اور اعتماد کیا گیا، اب آپ کو اس معاہدے کے مطابق کرنا ہے، اگر اس کام کو کرنے کے معاملے میں اور پڑھانے کے معاملے میں آپ پر جو بھروسہ کیا گیا ہے، آپ اس کو اپنی ذمہ داری سمجھتے ہوئے پورا پورا ادا کرتے ہیں، کوئی دیکھے یا نہ دیکھے، کوئی نگرانی کرے یا نہ کرے، کوئی پوچھے یا نہ پوچھے، آپ اپنی ڈیوٹی جو دن میں چار گھنٹے کی ہے، برابر ادا کرتے ہیں، ایک منٹ اور ایک سیکنڈ کی بھی کمی نہیں کرتے تو یہ امانت ہے یعنی کسی معاملے میں کسی پر اعتماد کرنا ''امانت'' کہلاتا ہے، ہر جگہ ہر معاملے میں ایسا ہی ہوتا ہے۔

مفوّضہ خدمت میں ذرا سی کوتاہی بھی خیانت ہے

کوئی عہدہ کسی کے حوالے کیا گیا، کسی کو ملک کا وزیر اعظم بنایا گیا، آپ کو کسی علاقے کا گورنر بنایا گیا تو اس عہدے کی ذمہ داریاں ادا کرنے کے معاملے میں آپ پر بھروسہ کیا گیا، وہاں آپ پر کوئی آدمی اور نگران مقرر نہیں کیے جاتے کہ جو آپ کو ٹوکتے رہیں، یہ آپ کے اندر کی بات ہے کہ آپ اس کو کما حقہ ادا کرتے رہیں اور ذرہ برابر بھی اس میں کمی نہ کریں، اگر پورے طور پر ادا کریں گے تو یوں سمجھا جائے گا کہ یہ امانت ہے اور اگر کوتاہی کریں گے تو خیانت کا ارتکاب کریں گے۔

جسم اور اعضائے انسانی بھی اللہ تعالیٰ کی امانت

امانت کا لفظ بہت عام ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمیں جسم دیا، اس میں دیکھنے کے واسطے آنکھ پیدا فرمائی، سننے کے واسطے کان پیدا فرمائے، بات چیت کرنے کے واسطے زبان پیدا فرمائی، ہاتھ دیے، پاؤں عطا فرمائے اور اس کے بعد ہمیں بتلا دیا کہ ان اعضاء کو کہاں استعمال کرنا ہے اور کہاں استعمال نہیں کرنا ہے، پاؤں کو یہاں استعمال کرنا ہے، یہاں استعمال نہیں کرنا ہے، ہاتھ کو یہاں استعمال کرنا ہے، یہاں استعمال نہیں کرنا ہے، کان سے یہ سننا ہے اور یہ نہیں سننا ہے، آنکھ سے یہ چیز دیکھنی ہے، فلانی چیز نہیں دیکھ سکتے۔ اب اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق ہم ان اعضاء کو یوز (use) کریں، استعمال کریں تو یہ امانت ہوگی اور اگر اس کے خلاف استعمال کریں تو خیانت ہوگی، قرآن کہتا ہے: ﴿يَعْلَمُ خَآئِنَةَ ٱلْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي ٱلصُّدُورُ ۝١٩﴾ [غافر] اللہ فرماتے ہیں: آنکھیں جو خیانت کرتی ہیں یعنی جن چیزوں کو دیکھنے سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے منع کیا ہے، ایسی چیزوں کو اگر آنکھیں دیکھتی ہیں تو یہ خیانت ہے اور اللہ اس کو جانتا ہے، اگر نامحرم عورتوں کو دیکھتا ہے، بے ریش لڑکوں کو دیکھتا ہے، اس کو قرآن ”آنکھوں کی خیانت“ کہتا ہے۔ تمہارے قلوب اور تمہارے دلوں میں جو ارادے چھپے ہوئے ہیں، ان سے اللہ تبارک وتعالیٰ بہ خوبی واقف ہیں خلاصہ یہ ہے کہ یہاں آنکھ کو غلط جگہ استعمال کرنے کو خیانت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

امانت کے مفہوم کا عموم

یہ امانت کا لفظ تو اتنا عام ہے کہ وہ زندگی کے ہر شعبے کو حاوی ہے، آپ کا کسی عورت سے اللہ تعالیٰ کے حکم اور کلمے کی بنیاد پر نکاح ہوا ہے، آپ کے لیے عورت کے حلال ہونے کی شکل کیا ہے؟ تو اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک طریقہ بتلایا کہ وہ عورت خود یا اپنے وکیل کے ذریعہ اپنے آپ کو آپ کے نکاح میں دے کہ میں نے اپنی ذات کو آپ کے نکاح میں دیا اور آپ اس کو قبول کریں، یہ کلمۃ اللہ کہلاتا ہے، اس کے نتیجے میں یہ عورت آپ کے لیے حلال ہوگئی، یہ نہیں ہوا تھا، وہاں تک وہ عورت آپ کے لیے حلال نہیں تھی بلکہ حرام تھی۔ اب اس عورت کے جو حقوق ہیں، ان کو ادا کرنا امانت ہے اور اگر آپ اس عورت کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کرتے ہیں تو یہ خیانت ہے۔

آپ کی اولاد ہے، اس اولاد کی تربیت کے سلسلے میں، اس کی تعلیم کے سلسلے میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے حکم دیا ہے، اس حکم کو آپ پورے طور پر بجالاویں تو یہ امانت کو آپ پورا کررہے ہیں اور اگر اس کو بجا نہیں لاتے، بچے کی تعلیم وتربیت کی طرف دھیان نہیں دیتے تو یہ خیانت کہلائے گی۔ الغرض! امانت کا مفہوم بہت عام ہے، ہر جگہ اپنی ڈیوٹی سچائی کے ساتھ پوری کرنا، اسی کا نام امانت ہے۔

امانت میں خیانت، علاماتِ قیامت میں سے ہے

حدیث میں آتا ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آکر عرض کیا: مَتَى السَّاعَةُ؟ اے اللہ کے رسول! قیامت کب آئے گی؟ تو حضور ﷺ نے

جواب میں ارشادفرمایا: فَإِذَا ضُيِّعَتِ الْأَمَانَةُ فَانْتَظِرِ السَّاعَةَ جب امانت کوضائع اور برباد کیا جائے تو قیامت کا انتظار کرو۔

سوال کرنے والا حضور ﷺ کے اس ارشاد کا مطلب نہیں سمجھا، اس لیے اس نے پوچھا: كَيْفَ إِضَاعَتُهَا؟ امانت ضائع کرنے کا کیا مطلب ہے؟ تو حضورِ اکرم ﷺ نے ارشادفرمایا: إِذَا وُسِّدَ الْأَمْرُ إِلَى غَيْرِ أَهْلِهِ فَانْتَظِرِ السَّاعَةَ: جب کوئی کام اور ذمہ داری ایک ایسے آدمی کوسونپی جائے جو اس کا اہل نہیں ہے تو قیامت کا انتظار کرو[①]۔

موجودہ دور میں یہ علامت علی وجہ الاتم پائی جارہی ہے

آج کیا ہورہا ہے؟ حکومتی عہدوں میں دیکھو، پرائیویٹ اداروں میں دیکھو، اداروں میں جو کام اور عہدے ہیں، اس کام اور عہدے کے لیے جو صلاحیت چاہیے، جیسی قابلیت چاہیے اور ان ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے لیے جو اوصاف چاہئیں، سب اس کو جانتے ہیں کہ فلاں وصف کا آدمی ہوگا تو وہ یہ کام کرسکے گا لیکن یہ جانتے ہوئے بھی ایسے آدمی کو دیتے نہیں ہیں۔

عہدوں کی بندر بانٹ اور اقربا پروری کے بھیانک نتائج

کسی نے اپنا بیٹا ہونے کی حیثیت سے اس کو ذمہ دار بنادیا، آپ کا بھائی ہے، فلانا رشتہ دار ہے، فلانے نے سفارش کردی، حالاں کہ اس میں کمی ہے، اس ذمہ داری کو ادا کرنے کے لیے جو قابلیت اور صلاحیت چاہیے، وہ نہیں ہے، پھر بھی اس کو ذمہ دار بنادیا،

① صحيح البخاری، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ، بَابُ مَنْ سُئِلَ عِلْمًا إلخ، ر:۵۹.

یہ خیانت ہوئی، اسی کو حضور ﷺ نے فرمایا کہ جب نااہل کو عہدہ دیا جائے، آج دنیا کا سب سے بڑا مسئلہ اور پرابلم یہی ہے کہ نااہلوں کو عہدے دیے جارہے ہیں، جس کی وجہ سے ان عہدوں کا جو حق ادا ہونا چاہیے، وہ ادا نہیں ہوتا اور پھر یہ ساری مصیبتیں آتی ہیں۔

خیر! یہ امانت والا موضوع اور سبجیکٹ (subject) تو بڑا لمبا سبجیکٹ ہے، اس کی بیسیوں مثالیں دی جاسکتی ہیں۔

حدیث کا تیسرا جزء: پڑوسی کے ساتھ اچھے سلوک کی تاکید

تیسری چیز نبیٔ کریم ﷺ نے یہ اشاد فرمائی: وَلْيُحْسِنْ جِوَارَ مَنْ جَاوَرَهُ: اپنے پڑوسی کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔ پڑوسی کے ساتھ اچھے سلوک کی بھی بڑی تاکید آئی ہے، بخاری شریف میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے، نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: مَا زَالَ جِبْرِيلُ يُوصِينِي بِالْجَارِ حَتَّى ظَنَنْتُ أَنَّهُ سَيُوَرِّثُهُ: حضرت جبرئیل علیہ السلام پڑوسی کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی مجھے برابر تاکید کرتے رہے، یہاں تک کہ مجھے خیال ہونے لگا کہ اس کو وارث بنادیں گے [1]۔

شریعت کی نگاہ میں پڑوسی کون ہے؟

پڑوسی عام ہے، مسلم بھی ہوسکتا ہے اور غیر مسلم بھی، نیک بھی ہوسکتا ہے اور بد بھی، دوست بھی ہوسکتا ہے اور دشمن بھی- دشمن ہے تو پڑوسی نہیں، ایسا نہیں ہے- مال دار بھی ہوسکتا ہے اور غریب بھی، کوئی بھی پڑوسی ہوسکتا ہے۔ بعض روایتوں میں پڑوسی کی حد

① صحيح البخاری، عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا، كِتَابُ الأَدَبِ، بَابُ الوَصَاةِ بِالْجَارِ، ر:٦٠١٥.

چالیس مکان تک بتائی گئی ہے اور بعض روایتوں میں آپ کے مکان سے چاروں طرف دس دس مکان کا ذکر ہے [١]، یہ سب آپ کے پڑوسی کہلائیں گے۔

پڑوسیوں کے بارے میں موجودہ دور کا چلن

آج کل تو لوگوں نے اپنا ایک اسٹیٹس قائم کرلیا ہے، میں اگر مال دار آدمی ہوں اور میرے محلے میں جو مال دار آدمی ہے تو اس کو تو پڑوسی سمجھتا ہوں اور میرے گھر کے پہلو میں ایک کالا سا آدمی جھونپڑے میں رہتا ہے، اس کو پڑوسی نہیں سمجھتا، حالاں کہ یہ شریعت نے نہیں کہا ہے، شریعت تو کہتی ہے کہ یہ بھی پڑوسی ہے اور وہ بھی پڑوسی ہے، آپ کو دونوں کے ساتھ پڑوس کا حق ادا کرنا ہے، اچھا سلوک کرنا ہے۔

حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہما کا یہودی پڑوسی کے ساتھ سلوک

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے یہاں بکری ذبح ہوتی تھی تو پوچھتے تھے کہ ہمارے اس یہودی پڑوسی کے یہاں گوشت بھیجا یا نہیں؟ [٢]۔

پڑوسی چاہے مسلمان ہو یا غیر مسلم، وہ چاہے یہودی ہو، عیسائی ہو، ہندو ہو، جو بھی ہو، آپ کا دوست ہو یا دشمن ہو، نیک ہو یا بدکار ہو، اگر وہ شراب پیتا ہے تو بھی وہ آپ کا

---

١ الأدب المفرد، باب الأدنى فالأدنى من الجيران، ر:١٠٩

٢ احیاء العلوم ٢/ ٢١٤، كِتَابُ آدَابِ الْأُلْفَةِ وَالْأُخُوَّةِ إلخ. اس حدیث کے بارے میں احیاء کے محشی کہتے ہیں: حديث مجاهد كنت عند عبد الله ابن عمر وغلام له يسلخ شاة، فقال: يا غلام! إذا سلخت فابدأ بجارنا اليهودي؛ الحديث. أخرجه أبو داود والترمذي وقال حسن غريب.

پڑوسی ہے، آپ کو اس کے ساتھ بھلائی کرنی ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کا اپنے شرابی پڑوسی کے ساتھ سلوک

حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا ایک نوجوان پڑوسی تھا جس کو روزانہ شراب پینے کی عادت تھی، شراب پی کر رات کو بکواس کرتا رہتا تھا، حضرت کو اس کی وجہ سے بڑی اذیت ہوتی تھی لیکن حضرت نے اس کی کبھی شکایت نہیں کی، کسی دوسرے آدمی نے حضرت کا خیال کر کے حاکم کو اس کی شکایت کر دی، وہ شراب پی کر جو بکواس کرتا تھا، اس میں کہتا تھا کہ لوگوں نے مجھے ضائع کر دیا اور کیسے آدمی کو ضائع کیا کہ اس کے یہ، یہ اوصاف ہیں، حاکم نے اس شکایت پر اس کو جیل میں ڈال دیا۔ جب اس رات کو اس کی آواز سنائی نہیں دی تو حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے بارے میں تحقیق کی اور لوگوں سے پوچھا کہ کیا بات ہے، آج اس کی آواز نہیں آرہی ہے؟ تو پتہ چلا کہ حاکم نے اس کو اسی جرم میں جیل میں ڈال دیا ہے۔ امام صاحب حاکم کے پاس گئے اور اس کی سفارش کر کے اس کو چھڑوا کر کے لائے اور اس سے کہا کہ ہم نے تو آپ کو ضائع نہیں کیا اور اس کا اثر اور نتیجہ یہ ہوا کہ اسی وقت شراب سے توبہ کر لی[1]۔

---

[1] وہ اشعار یہ ہیں:

أَضَاعُونِي وَأَيَّ فَتًى أَضَاعُوا		لِيَوْمِ كَرِيهَةٍ وَسَدَادِ ثَغْرِ
كَأَنِّي لَمْ أَكُنْ فِيهِمْ وَسِيطًا		وَلَمْ تَكُ نِسْبَتِي فِي آلِ عَمْرٍو
أُجَرَّرُ فِي الْمَجَامِعِ كُلَّ يَوْمٍ		فَيَا لِلّٰهِ مِنْ ظُلْمِي وَصَبْرِي

(أخبار أبي حنيفة وأصحابه للصميري، ص۵۲؛ بحر الدموع لأبی الفرج الجوزی، ص۱۲۷)

حقیقت یہ ہے کہ کیسا بھی ہو اور کیسے ہی اخلاق کا حامل ہو، ہمارے ساتھ برائی کا سلوک کرتا ہو تو بھی وہ ہمارا پڑوسی ہے اور ہمیں اس کے ساتھ بھلائی کرنی ہے۔

حقوق کے اعتبار سے پڑوسی کی مختلف قسمیں

بہرحال! پڑوسی کے بڑے حقوق شریعت نے بتلائے ہیں اور پڑوسی مختلف قسم اور درجے کے ہوتے ہیں، ایک حدیث میں آتا ہے کہ ایک پڑوسی وہ ہے جس کا ایک حق ہے یعنی غیر مسلم ہے اور پڑوسی ہے اور ایک پڑوسی وہ ہے جس کے دو حق ہیں کہ پڑوسی بھی ہے اور مسلمان بھی ہے اور ایک پڑوسی وہ ہے جس کے تین حق ہیں کہ وہ پڑوسی بھی ہے، مسلمان بھی ہے اور رشتہ دار بھی ہے تو جوں جوں اوصاف بڑھتے جائیں گے، اس میں تاکید بھی بڑھتی جائے گی[۱]۔

بہرحال! پڑوسیوں کے بہت زیادہ حقوق ہیں اور یہ ایک بہت بڑا اور طویل موضوع ہے، جس کے بارے میں بہت سی قرآنی آیات اور احادیث وارد ہیں۔

آج اس حدیث کو آپ کے سامنے پیش کرنے سے میرا مقصد یہ تھا کہ اس حدیث میں نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپ کے ساتھ محبت کا تقاضا کیا ہے؟ اس کو بتلایا، آج ہم اور آپ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت کا دم بھرتے ہیں، دعوے کرتے ہیں لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات پر کتنا عمل کرتے ہیں؟ ہم میں سے ہر ایک اپنا اپنا جائزہ لے لے، اندازہ

---

① شعب الإيمان، عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ جَدِّهِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ، بَابٌ فِي إِكْرَامِ الْجَارِ، ر:۹۱۱۳.

ہو جائے گا۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق اور سعادت عطا فرمائے، آمین۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

فضلاء سے اہم خطاب

(۱) قیامت میں پوچھے جانے والے پانچ سوالات

(۲) علمِ نافع وغیر نافع کی تمیز

(۳) اصحابِ نسبت سے فیض حاصل کرنے کا طریقہ

بمقام: جامعہ خیر العلوم، اودگاؤں (مہاراشٹرا)

مؤرخہ: ۱/۵/۲۰۱۷ (سالانہ اجلاس)

اقتباس

کسی نے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا کہ: آپ نے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت کیوں اختیار کی؟ تو فرمایا کہ: بھائی! دیکھو! ایک آدمی میٹھائیوں کے نام پڑھے کہ اس میٹھائی کا یہ نام ہے اور اس کا یہ نام ہے اور فلانی کا یہ نام ہے، اس کا یہ فائدہ ہوتا ہے اور اس میں یہ مواد استعمال ہوتا ہے، یہ سب کچھ اس نے پڑھ لیا۔ اور ایک دوسرا آدمی ہے جو آپ کو حلوائی کی دکان پر لے جائے اور آپ کے منہ میں میٹھائی رکھ کر کہے کہ اس کا ذائقہ چکھو اور اس کا مزہ دیکھو، یہ میٹھائی کھاؤ، اس کا یہ فائدہ ہے۔

فرمایا کہ: حضرت حاجی صاحب کا معاملہ ایسا ہی ہے۔ ہم نے کتابوں میں حروف تو پڑھے تھے، علوم حاصل کیے تھے لیکن کس علم کا کیا فائدہ ہے، حضرت حاجی صاحب نے ہم کو عملی طور پر بتلا دیا۔

آج ہمارے طبقۂ علماء میں سب سے بڑی کمی ہے، وہ یہی ہے، اس کو دور کرنے کی ضرورت ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الحمدللّٰه نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ باللّٰه من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا، ونعوذ باللّٰه من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا، ونعوذ باللّٰه من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا، من يهده الله فلا مضل له، ومن يضلله فلا هادي له، ونشهد أن لا إلٰه إلا الله وحده لا شريك له، ونشهد أن سيدنا ومولانا محمداً عبده ورسوله، أرسله إلىٰ كافّة الناس بشيراً ونذيراً، وداعياً إلى الله بإذنه وسراجاً منيراً، صلّى الله تعالىٰ عليه وعلىٰ آله وأصحابه وبارك وسلّم تسليماً كثيراً كثيراً.

أما بعد: فَأَعُوْذُ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ: ﴿تَبَٰرَكَ ٱلَّذِى بِيَدِهِ ٱلْمُلْكُ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَىْءٍ قَدِيرٌ ۝١ ٱلَّذِى خَلَقَ ٱلْمَوْتَ وَٱلْحَيَوٰةَ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا ۚ وَهُوَ ٱلْعَزِيزُ ٱلْغَفُورُ ۝٢﴾[الملك]

وقال النبي ﷺ: لاَ تَزُولُ قَدَمَا ابْنِ آدَمَ يَوْمَ القِيَامَةِ مِنْ عِنْدِ رَبِّهِ حَتَّى يُسْأَلَ عَنْ خَمْسٍ، عَنْ عُمُرِهِ فِيمَ أَفْنَاهُ، وَعَنْ شَبَابِهِ فِيمَ أَبْلاَهُ، وَمَالِهِ مِنْ أَيْنَ اكْتَسَبَهُ وَفِيمَ أَنْفَقَهُ، وَمَاذَا عَمِلَ فِيمَا عَلِمَ[1].

سالانہ جلسوں کے انعقاد کا مقصد اصلی

حضراتِ علمائے کرام، مشائخِ عظام، برادرانِ اسلام اور عزیز طلبہ! آج کی

① سنن الترمذی، عَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ، بَابٌ فِي الْقِيَامَةِ، ر:۲٤١٦.

ہماری یہ مجلس ''جامعہ خیر العلوم'' کے اجلاسِ سالانہ دستار بندی اور تقسیمِ اسناد کے مقصد سے منعقد کی گئی ہے، ایسی مجلسوں کا اصلی مقصد تو یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کو مدرسے کی سال بھر کی کارگزاری سے آگاہ کیا جائے۔

لوگ مدرسے میں آتے ہیں اور دیکھتے ہیں، خاص کر کے عوام جب مدرسے میں آتے ہیں اور درس گاہ کے پاس سے گذرتے ہیں تو وہ اساتذہ کو طلبہ کے سامنے درس دیتے ہوئے تو دیکھتے ہیں لیکن کیا پڑھایا جاتا ہے، کیسی تربیت ہوتی ہے، کن کن چیزوں سے ان کو آگاہ کیا جاتا ہے، کون سے علوم ہیں جو یہاں نصاب میں داخل ہیں اور ان پر کس انداز سے محنتیں کی جاتی ہیں، یہ ساری باتیں وہ ہیں جن کو وہ نہیں سمجھ پاتے۔

اسی طرح مدرسے کا جو نظام چل رہا ہے، اس پر جو مصارف آرہے ہیں، اللہ کے مخلص اور مخیر بندے اس میں جو مخلص تعاون اور امداد فرماتے ہیں اور ان کے اس تعاون اور امداد کی برکت سے اللہ تبارک وتعالیٰ اس سارے نظام کو ان منتظمین کے لیے آسان فرمادیتے ہیں، یہ ساری باتیں آپ نے مہتمم صاحب کی روداد میں سنی، آپ نے قرأتیں سنیں، تقریریں سنیں، یہ ساری باتیں آپ کے سامنے بڑی تفصیل کے ساتھ آچکی ہیں، اور ساتھ ہی ساتھ اس سال فراغت حاصل کرنے والے ہمارے دو فارغ التحصیل طلبہ کی دستار بندی ہوئی اور ان کو سند سے بھی نوازا گیا، یہ منظر بھی آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے۔

بہرحال! اس قسم کی مجالس کے انعقاد کا جو اصل مقصد ہوا کرتا ہے، بحمد اللہ وہ بہ احسنِ وجوہ حاصل ہو چکا ہے، ایسے مواقع پر مجلس کی مناسبت سے دو چار باتیں بھی عرض

کی جاتی ہیں؛ تا کہ اس میں شرکت کرنے والے حضرات دین کی کچھ باتوں سے آگاہ بھی ہو جائیں، اس غرض سے احقر کو پابند کیا گیا تو میں مختصر انداز میں آپ کے سامنے دو چار باتیں عرض کروں گا۔

میدانِ حشر میں انسان سے پوچھے جانے والے پانچ سوالات

ابھی آپ کے سامنے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک ارشاد پڑھا جو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: قیامت کے دن انسان کے قدم اللہ تبارک وتعالیٰ کے حضور سے ہٹ نہیں سکیں گے، یہاں تک کہ پانچ چیزوں کے متعلق اس سے پوچھا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر احسانِ عظیم

یہ بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کا بہت بڑا اکرم اور احسان ہے کہ حشر کے اُس امتحان گاہ میں کیا پوچھا جائے گا، کن چیزوں کے بارے میں تفتیش ہوگی، یہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ ہمیں پہلے ہی بتلا دیا، دنیا میں ایسا نہیں ہوتا، دنیا میں تو انسان امتحان گاہ میں داخل ہوتا ہے، داخل ہونے کے بعد سوالات کا پرچہ جب اس کے ہاتھوں میں تھمایا جاتا ہے، اور وہ اس کو دیکھتا ہے، تب پتہ چلتا ہے کہ کیا سوالات ہیں اور مجھے کیا جواب دینا ہے لیکن یہاں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے اپنے حبیبِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے واسطے سے ہمیں یہ ساری باتیں پہلے ہی بتلا دیں۔

اس حدیث میں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان ہی سوالات میں سے پانچ کا تذکرہ کیا

ہے جو میدانِ حشر میں انسان سے پوچھے جائیں گے، اور بھی باتیں ہیں جو پوچھی جائیں گی جن کا ذکر بعض آیاتِ قرآنیہ میں اور دوسری احادیث میں موجود ہے، اس حدیث میں پانچ کا تذکرہ ہے:

پہلا سوال: زندگی کے اوقات کہاں خرچ کیے؟

پہلی بات جو پوچھی جائے گی: عَنْ عُمُرِهِ فِيمَ أَفْنَاهُ: زندگی کے متعلق سوال ہوگا کہ اپنی زندگی کہاں گنوائی، کن کاموں میں اسے استعمال کیا؟

واقعہ یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمیں جو یہ زندگی عطا فرمائی ہے، یہ ان تمام نعمتوں کا سرچشمہ ہے جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمیں عطا فرمائی ہیں، اگر ہمیں زندگی ہی نہ ملتی تو بعد میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ہمیں جن نعمتوں سے سرفراز کیا گیا ہے، ان نعمتوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔

اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی نعمت: زندگی

یہ چیز بھی حضراتِ علمائے کرام کے درمیان موضوعِ بحث رہی ہے کہ سب سے بڑی نعمت کون سی ہے؟ ایمان، زندگی، یا کچھ اور؟ تو بعض لوگ یہی کہتے ہیں کہ زندگی سب سے بڑی نعمت ہے، ویسے تو ایمان سب سے بڑی نعمت ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کا حصول اور ملنا بھی اسی زندگی کے اوپر موقوف ہے، اس معنی کر کے اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ سب سے بڑی نعمت جو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ہمیں دی گئی ہے، وہ زندگی کی شکل میں ہے تو اس کا یہ دعویٰ کوئی بے جا دعویٰ نہیں ہے جس کو رد کرنے

کی ضرورت ہو۔

موت اور زندگی کو پیدا کرنے کا مقصد

بہرحال! اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمیں یہ زندگی عطا فرمائی ہے: ﴿خَلَقَ ٱلْمَوْتَ وَٱلْحَيَوٰةَ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا﴾: اللہ تبارک وتعالیٰ نے موت کو بھی پیدا فرمایا اور زندگی کو بھی پیدا فرمایا اور مقصد یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ آزمانا چاہتے ہیں کہ تم میں کون اچھے اعمال والا ہے، ہم سے اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں حسنِ عمل مطلوب ہے۔

نبوت اور رسالت کے سلسلے کو جاری کرنے کا مقصد

اب اس زندگی کو ہمیں کس طرح گذارنا ہے؟ اسی کو بتلانے کے لیے حضراتِ انبیائے کرام علیہم السلام کا سلسلہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر سیدنا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک جاری فرمایا، اللہ تعالیٰ کے آخری نبی، خاتم النبیین، سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے نبوت اور رسالت کے اس سلسلے کو مکمل فرمایا۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آکر زندگی گذارنے کا ایک شان دار طریقہ پوری انسانیت کو بتلایا، وہ طریقہ ایسا عمدہ اور بہترین ہے جس کے متعلق خود اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآنِ پاک میں ارشاد فرمایا: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ ٱللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ [الأحزاب۲۱] نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ بابرکات کے اندر تمھارے لیے بہترین نمونہ موجود ہے۔

یعنی ہم کیسی زندگی گذاریں تو اللہ تبارک وتعالیٰ ہم سے راضی اور خوش ہوں، اس کا سارا نمونہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ بابرکات کے ذریعہ سے

پوری انسانیت کو عطا فرمایا۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شریعت کے احکام عملی طور پر سکھلائے

زندگی کے ہر شعبے سے متعلق شریعتِ مطہرہ نے جو احکامات انسان کو دیے ہیں، ان سارے احکامات کا نمونہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات کے اندر موجود ہے، شریعت مطہرہ نے انسانی زندگی کے ہر شعبے سے متعلق احکامات دیے ہیں، عقائد سے متعلق احکام کی تفصیلات بھی موجود ہیں، اسی طرح اخلاق سے متعلق، عبادات سے متعلق، معاملات سے متعلق، معاشرت سے متعلق ایک ایک چیز موجود ہے، یہاں تک کہ ایک مؤمن کے لباس کی وضع قطع کیسی ہونی چاہیے، وہ بھی نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کر کے بتلائی۔

ٹخنے سے نیچے لنگی لٹکانے پر ایک صحابی کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تنبیہ

شمائل میں روایت موجود ہے، حضرت عبید بن خالد محاربی رضی اللہ عنہ ایک صحابی ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ میں راستے سے گذر رہا تھا کہ پیچھے سے ایک آواز سنی: اِرْفَعْ إِزَارَكَ، فَإِنَّهُ أَتْقَى وَأَبْقَى یا فرمایا: أَنْقَى وَأَبْقَى: تم اپنی لنگی کو اونچا کرو، اس میں لنگی کی صفائی بھی ہے۔ اس لیے کہ اگر لنگی ٹخنوں سے اتنی نیچی ہے کہ وہ زمین کے ساتھ گھسٹ رہی ہے تو وہ میلی ہو جائے گی اور اس طرح گھسٹنے کے نتیجے میں جلدی سے پھٹ بھی جائے گی؛ اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: أَنْقَى وَأَبْقَى: اس میں صفائی بھی ہے اور اس کے اندر تمھاری لنگی کا زیادہ بقا بھی ہے، دیر پا رہنے کا یہ طریقہ ہے۔ حضرت عبید بن خالد محاربی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے جنھوں نے مجھے

اس جملے سے مخاطب کیا تھا۔ اب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ازار کو ٹخنوں سے اوپر رکھنے کی علت اور وجہ کے طور پر دو چیزیں بتلائی تھیں: أَنْقَى وَأَبْقَى، اس سے ان صحابی کو یہ خیال گذرا کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میری اس لنگی کی حفاظت کے پیشِ نظر یہ ہدایت عطا فرما رہے ہیں، ورنہ تو حضراتِ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عاشق زار تھے، وہاں تو حضور کا حکم ملنے کے بعد کسی اور چیز کی کوئی گنجائش نہیں تھی، لیکن یہ آخری جملہ جو آپ نے اس حکم کی علت کے طور پر فرمایا تھا، اس سے ان کو یہ خیال گذرا کہ شاید حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میری اس لنگی کی حفاظت کی غرض سے یہ ارشاد فرما رہے ہیں۔ اس لیے انھوں نے جواب میں نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا: يَا رَسُولَ اللّٰهِ إِنَّمَا هِيَ بُرْدَةٌ مَلْحَاءُ کہ: اے اللہ کے رسول! یہ تو معمولی سی چدریا ہے، یعنی اگر وہ میلی بھی ہو جائے، پھٹ بھی جائے تو کوئی ایسی بات نہیں ہے، یہ جواب اسی لیے دیا، اور کوئی مقصد نہیں تھا۔

کیا میری ذات میں تمھارے لیے نمونہ نہیں ہے؟

جب انھوں نے یہ جواب دیا تو وہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پلٹ کر جواب میں ارشاد فرمایا: أَمَا لَكَ فِيَّ أُسْوَةٌ؟ کیا تمھارے لیے میری ذات کے اندر نمونہ موجود نہیں ہے؟ حضرت عبید بن خالد محاربی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: میں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی لنگی کو دیکھا تو وہ آدھی پنڈلی تک تھی، چناں چہ میں نے اپنی لنگی کو فوراً اونچا کر کے آدھی پنڈلی تک کر لیا[۱]۔

[۱] الشمائل المحمدية للترمذی، بَابُ مَا جَاءَ فِي صِفَةِ إِزَارِ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ، ر:۱۲۱.

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہر ادا مؤمن کے لیے نمونہ ہے

دیکھو! یہاں لنگی کی وضع کیسی ہونی چاہیے، لنگی کس انداز سے ہمیں پہننا چاہیے، یہ بھی نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیں بتلا رہے ہیں اور ان کے جواب میں نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو جملہ ارشاد فرمایا: أَمَا لَكَ فِيَّ أُسْوَةٌ؟ کیا تمھارے لیے میری ذات کے اندر نمونہ موجود نہیں ہے؟ یہ بیّن دلیل ہے کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہر ادا ایک مؤمن کے لیے نمونہ ہے، اس کو چاہیے کہ وہ اپنی زندگی کو اسی کے مطابق استوار کرنے کا اہتمام کرے۔

حضراتِ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا مقام بہت اونچا ہے، عقائد، عبادات، معاملات، معاشرت، ہر ہر شعبے میں نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک ایک ادا کو اپنانا اپنے لیے سعادت سمجھتے تھے، اُن سنتوں میں جن کو حضراتِ علماء نے ''سنن زوائد'' سے تعبیر کیا ہے، ان سنتوں میں بھی حضراتِ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی کو اپنے لیے لازم سمجھتے تھے۔

صلحِ حدیبیہ کے وقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا بہ طورِ سفیر مکہ جانا

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اکابر صحابہ میں سے ہیں، نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حدیبیہ کے موقع پر ان کو مکہ والوں کے پاس اپنا نمائندہ اور ایلچی بنا کر، ایک پیغام و میسیج دے کر بھیجا، حالتِ احرام میں تھے، ایک چادر لنگی کے طور پر نیچے پہنے ہوئے تھے اور ایک چادر اوپر اوڑھے ہوئے تھے، ان کے قبیلے والوں کو مکہ کے اندر بڑی ریاست اور قوت حاصل تھی، بنوامیہ ان کے قبیلے کا نام تھا۔

جب ان کو پتہ چلا کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے بہ طور قاصد کے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ آ رہے ہیں، چوں کہ ان کے قبیلے کے لوگ مکے میں زیادہ تعداد میں تھے اور زیادہ قوت والے تھے، اس سے ان کو بہت خوشی ہوئی کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمارے قبیلے کے ایک آدمی کو یہ سعادت عطا فرمائی ہے، اگر چہ وہ موبائل کا زمانہ نہیں تھا لیکن وہاں بات پہنچ چکی تھی کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے ایلچی اور قاصد بن کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مکہ آ رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے قبیلے کا آدمی آ رہا ہے، وہ سب باقاعدہ ہتھیار لگا کر، مسلح ہو کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے استقبال کے لیے مکہ سے باہر آئے اور جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ آئے تو ان کا بڑا شان دار استقبال کرتے ہوئے ان کو اپنی حمایت میں لے لیا، ان کو اطمینان دلایا اور ان کو ساتھ لے کر گئے کہ کوئی بھی آپ کا بال بیکا نہیں کر سکتا، تم جو چاہو کرو۔ اس لیے کہ اندیشہ تھا کہ کوئی آدمی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو کوئی گزند نہ پہنچا دے، اس سے پہلے ایک آدمی کو نمائندہ بنا کر بھیجا گیا تھا، ان کے اونٹ کو مکہ والوں نے قتل کر دیا تھا اور ان کی جان کے بھی لالے پڑ گئے تھے، بڑی مشکل سے جان بچا کر واپس لوٹے تھے، اس لیے قبیلے والوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کہا کہ ہم آپ کو اپنے ساتھ لے کر چلتے ہیں، آپ بے خوف وخطر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پیغام مکہ کے سرداروں تک پہنچایئے۔

خیر انھوں نے مکہ کے سرداروں کو پیغام پہنچایا، وہاں جو ضعفائے مسلمین تھے، ان کو پیغام دیا گیا تھا، وہ بھی پہنچایا اور اپنی ذمہ داری سے فارغ ہو گئے۔ جس وقت ان کو ان کے قبیلے والے سرداروں کے پاس لے جا رہے تھے تو ان کے قبیلے والوں نے دیکھا

کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی لنگی آدھی پنڈلی پر ہے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طریقہ یہی تھا کہ آدھی پنڈلی تک لنگی رکھتے تھے۔

لنگی باندھنے کے معاملے میں کفارِ مکہ کا طرز و انداز

اس زمانے میں مکہ والوں کا اور مکہ کے جو سردار تھے، ان کا فیشن (fashion) اسٹیٹس اور اسٹائل یہ تھا کہ وہ لنگی ٹخنوں سے اتنی نیچے رکھا کرتے تھے کہ زمین سے گھسے، اس طرح پہننے کی عادت تھی اور اس کو اپنی عزّت، وقار اور فخر کی چیز سمجھتے تھے، اگر کوئی آدمی اس سے ذرا اوپر لنگی پہنے تو اس کو معمولی اور حقیر سمجھتے تھے، اس کو ذلیل سمجھتے تھے۔ جیسے آج کل کے جو اسٹائل ہوتے ہیں، اس کے خلاف کوئی کرے، جیسے ہم لوگ آدھی پنڈلی تک لنگی پہنتے ہیں تو یہ فیشن پرست لوگ اس کو حقیر سمجھتے ہیں نا؟ کہ یہ کون آ گیا؟ کہاں سے آ گیا؟۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قبیلے والوں نے دیکھا کہ ان کی لنگی آدھی پنڈلی پر ہے، تھوڑی اونچی بھی نہیں ہے، بہت زیادہ اونچی ہے تو قبیلے والوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کہا کہ دیکھو عثمان! تم مکۂ مکرمہ کے بڑے بڑے چودھریوں اور سرداروں کے پاس پیغام لے کر ایلچی بن کر کے جا رہے ہو اور وہاں کا فیشن یہ ہے، طریقۂ کار یہ ہے، ان کے یہاں لنگی کو اوپر رکھنا ذلّت کی چیز ہے اور تمھاری لنگی آدھی پنڈلی تک ہے اور وہ ایسے آدمی کو جس کی لنگی اس طرح آدھی پنڈلی پر ہو، بہت حقیر اور معمولی سمجھتے ہیں؛ اس لیے تم بھی اپنی لنگی ذرا نیچی کر لو۔

پروہ نہ سمجھیں کہ میری بزم کے قابل نہ رہا

جب قبیلے والوں نے یہ کہا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بڑی ہمت اور لاپرواہی کے ساتھ جواب میں فرمایا: هٰكَذَا إِزْرَةُ صَاحِبِنَا: میرے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی لنگی باندھنے کا انداز اور اسٹائل یہی ہے، نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی لنگی بھی اسی طرح ہوتی ہے اور میں اس سے ہٹ کر اپنی لنگی نہیں باندھ سکتا[1]۔

پروہ نہ سمجھیں کہ میری بزم کے قابل نہ رہا		لوگ سمجھیں مجھے محرومِ وقار و تمکین

حضراتِ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین تو وہیں سے عزت حاصل کرتے تھے، یہ دیکھتے تھے کہ وہاں کون سی ادا پسند کی جاتی ہے، ہم لوگ دنیا والوں سے عزت حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن بھائیو! اس میں کبھی بھی کامیابی ملنے والی نہیں ہے، ایک کو راضی کرلو، ساری دنیا آپ سے راضی ہوجائے گی، اگر اس کو ناراض کرلیا تو ساری دنیا کو راضی کرتے پھروگے لیکن کام نہیں بنے گا۔ میں یہ عرض کررہا تھا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ بابرکات کو جو نمونہ بنا کر بھیجا ہے، وہ ہر چیز میں ہے، اس لیے ہمیں اپنی زندگی کو اسی کے مطابق گذارنا ہے۔

دوسرا سوال: جوانی کہاں خرچ کی؟

وَعَنْ شَبَابِهِ فِيمَ أَبْلَاهُ: دوسرا سوال جوانی کے متعلق ہوگا کہ جوانی کے قیمتی سرمایے کو کہاں استعمال کیا، کہاں خرچ کیا، پرانا کیا؟۔

---

(۱) المصنف لابن أبي شيبة، غَزْوَةُ الْحُدَيْبِيَةِ، عَنْ سَلَمَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ، ر: ۳٦٨٥٢.

جوانی اگرچہ زندگی ہی کا ایک حصہ ہے اور پہلے سوال میں زندگی کے متعلق بتلا دیا، چاہیے تو یہ تھا کہ جوانی اس میں آ گئی؛ اس لیے اس کے متعلق مستقل سوال نہ ہوتا لیکن چوں کہ جوانی زندگی کا ایسا حصہ ہے جس کو زندگی کے بقیہ حصوں کے اوپر فوقیت حاصل ہے، ایک شان دار چیز ہے، اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں اس کے متعلق الگ سے سوال ہوگا۔

لہو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانیاں

میں نوجوان دوستوں سے عرض کروں گا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جوانی کی شکل میں آپ کو جو نعمت عطا فرمائی ہے، وہ ایسی عجیب وغریب نعمت ہے کہ اور کوئی نعمت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی، جوان اپنے عزم وارادے سے کوئی کام کرنا چاہیں، وہ آسانی سے کر سکتے ہیں۔ آج ہمارے جوانوں میں وہ عزم اور حوصلے نہیں رہے، ختم ہوتے جا رہے ہیں، آج ہمارے جوانوں کی نوجوانیاں اور شباب شہوت پرستی کی نذر ہو گیا، انھوں نے اپنے آپ کو موبائل کے اندر کھپا دیا اور ختم کر دیا، ضرورت ہے کہ ہمارے جوان اپنی جوانی کو کام میں لائے۔

نوجوان صحابی حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے فضائل

نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے والے صحابہ کون تھے؟ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کون تھے؟ ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کون تھے؟ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کون تھے؟ اسی طرح دوسرے بہت سارے صحابہ نوجوان تھے۔

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ جن کا اتنا اونچا مقام ہے کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: وَأَعْلَمُهُمْ بِالحَلاَلِ وَالحَرَامِ مُعَاذُ بْنُ جَبَلٍ حلال اور حرام کو سب سے زیادہ جاننے والے معاذ بن جبل ہیں①، ایمان لائے تو اس وقت ان کی عمر بارہ، تیرہ سال تھی اور ۱۸ھ کے اندر ان کا انتقال ہوا، صرف ۳۳ر سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسا اونچا مقام عطا فرمایا تھا کہ ترمذی شریف کی روایت میں نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جن چار صحابہ سے قرآن سیکھنے کی لوگوں کو تلقین فرمائی، ان میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کا نام بھی ہے②۔

حضرت علقمہ رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے خاص شاگرد ہیں، فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے ان کے سامنے قرآنِ پاک کی یہ آیت پڑھی: ﴿إِنَّ إِبْرَٰهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِّلَّهِ حَنِيفًا وَلَمْ يَكُ مِنَ ٱلْمُشْرِكِينَ ۝١٢٠﴾ [النحل]، فرماتے ہیں کہ یہ سن کر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرمانے لگے: إِنَّ مُعَاذًا كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِلَّهِ حَنِيفًا، انھوں نے پوچھا کہ: امت کس کو کہتے ہیں؟ تو جواب دیا کہ جو آدمی لوگوں کو بھلائی اور خیر کی باتیں سکھلائے، اس کو ''امت'' کہتے ہیں اور ''قانت'' اس کو کہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کا مطیع اور فرماں بردار ہو③۔

---

① سنن الترمذی، عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، بَابُ مَنَاقِبِ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ إلخ، ر:۳۷۹۰.

② صحیح البخاری، عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا، بَابُ مَنَاقِبِ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، ر:۳۸۰٦.

=

بہر حال! یہ جتنے بھی صحابہ ہیں جنھوں نے بڑے بڑے کارنامے انجام دئے، وہ سب جوان تھے، ہمارے جوانوں کو چاہیے کہ وہ اپنی جوانی کو اللہ تعالیٰ کے لیے استعمال کریں، اس جوانی کے متعلق قیامت کے روز سوال ہوگا۔

تیسرا اور چوتھا سوال: مال کے متعلق

آگے تیسرا اور چوتھا سوال مال کے متعلق ہے، مال کے متعلق دو سوال ہوں گے: مِنْ أَيْنَ اكْتَسَبَهُ وَفِيمَ أَنْفَقَهُ (۳) کہاں سے کمایا (۴) کہاں خرچ کیا؟۔

کمانے کے متعلق شریعت نے ایک بات اصولی طور پر فرمادی: كَسْبُ الْحَلَالِ فَرِيضَةٌ بَعْدَ فَرِيضَةٍ: اسلام کے جو بنیادی فرائض ہیں، فرائضِ خمسہ، اس کے بعد یہ حلال روزی حاصل کرنا بھی فرض ہے۔

حلال کمائی کے لیے اسلامی فرائض کو قربان کرنا جائز نہیں

لیکن اس کا درجہ بعد کا ہے، آپ چاہے حلال طریقے سے کما رہے ہوں لیکن اس کے لیے آپ نماز کو قربان نہیں کر سکتے، آپ روزے کو قربان نہیں کر سکتے، اسلام کے ان بنیادی فرائض کے مقابلے میں اس حلال کمائی والے طریقے کو ترجیح حاصل نہیں ہے، اگر کوئی یہ کہے کہ حلال کمائی کو بھی فرض قرار دیا گیا ہے اور اس میں مجھے جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا موقع نہیں ملتا یا میری نماز قضا ہو جاتی ہے تو آپ کو یہی جواب دیا

= (۳) المستدرك على الصحيحين، ذكر مناقب أحد الفقهاء الستة من الصحابة معاذ بن جبل رضي الله عنه، ر:۵۱۸۸.

جائے گا کہ شریعت ایسی کمائی کی اجازت نہیں دیتی، اس کا درجہ بعد کا ہے۔

پیسوں کے پیچھے اندھی دوڑ کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیشین گوئی

شریعت کے بتلائے ہوئے طریقے کے مطابق حلال مال کمانا ہے۔آج ہمارے معاشرے میں حرام بہت زیادہ شائع اور عام ہو چکا ہے،لوگوں کا مزاج یہ بن گیا ہے کہ بس! پیسہ چاہیے۔

بخاری شریف کی روایت ہے، نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پیشین گوئی فرمائی ہے:يَأْتِي عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ، لاَ يُبَالِي المَرْءُ مَا أَخَذَ مِنْهُ، أَمِنَ الحَلاَلِ أَمْ مِنَ الحَرَامِ:ایک زمانہ ایسا آنے والا ہے کہ آدمی جب پیسہ حاصل کرے گا تو یہ پروانہیں کرے گا کہ کہاں سے حاصل کیا ہے،حلال سے یا حرام سے [۱]۔بس! پیسہ لاؤ،کہیں سے بھی آوے۔نہیں، یہ مطلوب نہیں ہے، یہ حرام تو آپ کو جہنم میں لے جائے گا۔

خرابیوں کی بڑی وجہ حرام کمائی

آج ہمارے معاشرے میں، ہماری سوسائٹی میں، ہمارے سماج کے اندر یہ برائیاں جو گھس چکی ہیں، ڈیرہ ڈال چکی ہیں،اس کی مختلف وجوہات میں سے ایک بڑی وجہ کمائی کا حلال نہ ہونا ہے؛اس لیے اس کی طرف خاص توجہ کی جائے۔

پھر حلال طریقے سے کمانا بھی اللہ تعالیٰ کی ایک بڑی نعمت ہے اور خرچ کرنے میں بھی ہم آزاد نہیں ہیں،خرچ بھی ہمیں اسی طریقے کے مطابق کرنا ہے جو ہمیں شریعت

---

(۱) صحيح البخاري، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ، بَابُ مَنْ لَمْ يُبَالِ مِنْ حَيْثُ كَسَبَ المَالَ، ر:۲۰۵۹.

نے بتلایا۔

فضول خرچی ہر حال میں ممنوع ہے

بعض لوگ غلط فہمی کے شکار ہیں، وہ حلال طریقے سے کماتے ہیں اور جب خرچ کرنے کا موقع آتا ہے تو غلط طریقے سے بے دریغ خرچ کرتے ہیں، حالاں کہ جس انداز سے خرچ کیا جارہا ہے، شریعت نے اس کی اجازت نہیں دی ہے، ان کو جب اس پر متنبہ کیا جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ: مولوی صاحب! ہم نے حلال طریقے سے کمایا ہے۔

ٹھیک ہے، آپ نے حلال طریقے سے کمایا ہے لیکن خرچ کرنے کے معاملے میں آپ آزاد نہیں ہیں، شریعت تو ہر چیز میں فضول خرچی سے منع کرتی ہے، وضو جیسی عبادت جو نماز کا ایک ذریعہ ہے، اس میں بھی اجازت نہیں، ایک صحابی وضو کررہے ہیں، پانی کچھ زیادہ استعمال کررہے تھے، حالاں کہ ویسے ہی وہاں پانی کی کمی تھی، استعمال کرنے والے بہت بچ بچ کر کے استعمال کرتے تھے لیکن پھر بھی انھوں نے اس میں کچھ زیادتی کی ہوگی تو نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: مَا هَذَا السَّرَفُ يَا سَعْدُ: اے سعد! یہ پانی میں فضول خرچی کیسی ہے؟، چوں کہ وہ وضو کررہے تھے؛ اس لیے انھوں نے عرض کیا: أَفِي الْوُضُوءِ إِسْرَافٌ؟: اے اللہ کے رسول! کیا وضو میں بھی فضول خرچی ہے؟ یعنی اگر وضو میں بھی پانی کچھ زیادہ استعمال ہوجائے تو وہ اسراف ہے جو ممنوع ہے؟ تو نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: نَعَمْ وَإِنْ كُنْتَ عَلَى نَهرٍ جَارٍ: جی ہاں! اگر تم بہنے والی نہر پر بیٹھ کر وضو کررہے ہو اور اُس وقت بھی تم ضرورت سے

زیادہ پانی استعمال کروگے تو وہ اسراف ہے[۱]۔

امت کا مال دار طبقہ اور فضول خرچی

ہمارے یہاں شادی بیاہ اور دوسرے مواقع پر بے دریغ دولت خرچ کرتے ہیں، حالاں کہ امت کا ایک طبقہ ایسا غریب ہے کہ بھوکا مر رہا ہے اور اللہ تعالیٰ نے جن کو دولت دے رکھی ہے، ان کا حال یہ ہے کہ وہ اس کو بے دریغ خرچ کر رہے ہیں، ضرورت ہے کہ اس طرف توجہ کی جائے، اس کے متعلق بھی سوال ہوگا۔

پانچواں سوال: اپنے علم پر کتنا عمل کیا؟

اور آخری سوال، مجھے اسی سوال کی طرف متوجہ کرنا مقصود ہے، نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن یہ سوال بھی ہوگا: وَمَاذَا عَمِلَ فِيمَا عَلِمَ: آپ نے جو علم حاصل کیا، اس پر کیا عمل کیا؟ یہ ہر ایک سے سوال ہوگا، ایک عامی آدمی جو شریعت کے متعلق جانتا ہے، اس سے بھی سوال ہوگا کہ تم جتنا جانتے تھے، اس پر کتنا عمل کیا؟ ایک عالم کے پاس جتنا علم تھا، اس سے اس کے متعلق سوال ہوگا کہ اس پر آپ نے کیا عمل کیا؟۔

علمے کہ راہ نہ نماید، جہالت است

آج ہمارے یہ عزیز یہاں سے فارغ التحصیل ہو کر جا رہے ہیں، ان سے عرض ہے کہ علم بہ معنی دانستن، جاننا یہ اصل کمال نہیں ہے، آج ہماری سب سے بڑی کمزوری

[۱] شعب الإيمان، عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرٍو رضی اللہ عنہما، فَضْلُ الْوُضُوءِ، ر:۲۵۳۳.

یہ ہے اور ہماری سوچ میں سب سے بڑی خرابی اور تبدیلی آئی ہے، وہ یہ ہے کہ ہم نے علم ہی کو فخر اور مباہات کا ذریعہ بنالیا اور اسی پر راضی ہو کر بیٹھ گئے، عمل کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔

ہمیں اپنی غلطیوں کا علم ہے، جانتے ہیں کہ ہمارے اندر کیا کیا کوتاہیاں ہیں، ان کو جاننے کے باوجود ہم اسی پر جمے ہوئے ہیں، ہمارا علم ہمیں یہ بتلاتا ہے کہ تمھارا یہ طرز عمل درست نہیں ہے، اللہ تعالیٰ اس پر تم سے ناراض ہیں، ہم یہ جاننے کے باوجود اپنے عمل کو ٹھیک کرنے کی طرف توجہ نہیں کرتے، علم کے مطابق عمل کرنے کا اہتمام نہیں کرتے بلکہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے پاس جو اتنا علم ہے، یہی ہماری بڑائی کی علامت ہے۔

نہیں بھائی! یہ تو بہت غلط چیز ہے کہ ہمیں اپنی غلطیاں ہمارے علم کی روشنی میں معلوم ہیں اور پھر بھی اپنے علم کے مطابق عمل نہیں کرتے بلکہ اپنی ان غلطیوں کے اوپر، اپنی ان برائیوں کے اوپر اسی طرح اڑے رہتے ہیں، جیسے علم حاصل کرنے سے پہلے ہمارا حال تھا تو علم نے ہمیں کیا فائدہ پہنچایا؟ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کو اس کا جواب دینا پڑے گا۔

علمِ نافع کی دعا

نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تو اپنی دعاؤں کے ذریعہ سے ہمارے سامنے یہ بات واضح فرما دی کہ علم کی دو قسمیں ہیں: علمِ نافع اور علمِ غیر نافع، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعاؤں میں ہے: اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ عِلْمًا نَافِعًا کہ: اے اللہ! میں آپ سے نفع دینے والا علم مانگتا

ہوں[۱]۔معلوم ہوا کہ علم کی ایک قسم وہ بھی ہے جو فائدہ پہنچاتی ہے۔

علمِ غیر نافع سے پناہ

اور دوسری قسم کے علم کے بارے میں نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ دعا مانگتے تھے: اللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنْ عِلْمٍ لَا يَنْفَعُ کہ: اے اللہ! میں ایسے علم سے تیری پناہ چاہتا ہوں جو مجھے فائدہ نہ پہنچائے[۱]۔

معلوم ہوا کہ علم کی دوسری قسم علمِ غیر نافع ہے اور علمِ نافع مطلوب ہے اور علم غیر نافع سے پناہ مانگی گئی ہے، وہ مطلوب نہیں ہے بلکہ وہ تو آدمی کے لیے وبال ہے، کل قیامت کے دن ناواقف لوگوں کے مقابلے میں اس علمِ غیر نافع کے حاملین کو زیادہ سزا اور عذاب دیا جائے گا۔

علمِ نافع وغیر نافع میں فرق

اب علمِ نافع اور غیر نافع میں فرق کیسے ہوگا اور کیسے پتہ چلے گا کہ کون سا علم نافع ہے اور کون سا غیر نافع ہے؟ تو اس کے لیے یہ واقعہ سنو: امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ایک طالب علم مدت تک رہا، جب جانے لگا تو عرض کیا کہ آپ کی خدمت میں رہ کر میں نے بہت کچھ سیکھا، بہت سارا علم حاصل کیا، اب میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ

---

① شعب الإيمان، عَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رضي الله عنها، فَصْلٌ قَالَ: وَيَنْبَغِي لِطَالِبِ الْعِلْمِ أَنْ يَكُونَ تَعَلُّمُهُ وَلِلْعَالِمِ أَنْ يَكُونَ تَعْلِيمُهُ لِوَجْهِ اللهِ تَعَالَى، ر:١٦٤٥.

① صحيح مسلم، عَنْ زَيْدِ بْنِ أَرْقَمَ رضي الله عنه، بَابُ التَّعَوُّذِ مِنْ شَرِّ مَا عُمِلَ إلخ، ر:٢٧٢٢.

آپ مجھے مختصر مگر جامع انداز میں نصیحت فرمادیں تو اس کو میں اپنی زندگی کے اندر اپنالوں گا۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک نصیحت نامہ لکھ کر اس طالب علم کو دیا، اس کا نام ہی ہے ”أيّها الولد“ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے رسائل میں ایک رسالہ اس نام کا بھی ہے اور ہمارے اکابر میں سے حضرت مولانا عاشق الٰہی میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا اردو ترجمہ کیا ہے، اس کا نام ہے ”امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا خط“، اس میں انھوں نے علم نافع اور غیر نافع کی بڑی اچھی علامت بتلائی ہے۔

وہ فرماتے ہیں: بیٹا! جو علم تم کو دنیا میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے نہیں بچا سکتا، وہ قیامت کے روز اللہ کے عذاب سے نہیں بچائے گا، آپ کو چاہیے کہ آپ اپنے علم کی روشنی میں اپنی زندگی کو ایسا استوار فرمائیں کہ کسی بھی چیز میں اللہ تعالیٰ کی معصیت اور نافرمانی کی نوبت نہ آوے۔ جاننے کے باوجود اگر آپ ان چیزوں کا ارتکاب کریں گے تو آپ کا یہ علم کل کو اللہ کے عذاب سے آپ کو بچا نہیں سکتا۔

اس لیے ضرورت ہے کہ آپ حضرات حاصل کردہ علم پر عمل کا اہتمام کریں، علم آپ سے عمل چاہتا ہے۔

علم کی صورت، حقیقت اور لذت

حضرت ڈاکٹر عبدالحی عارفی رحمۃ اللہ علیہ - جو حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے اجل خلفاء میں سے ہیں - فرماتے ہیں کہ علم کی صورت کتابوں سے آتی ہے اور علم کی حقیقت

عمل سے آتی ہے اور علم کی لذت اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کی صحبت سے آتی ہے، بزرگانِ دین کی صحبت سے آتی ہے۔ خالی کتابوں میں پڑھ لینے سے علم نہیں آتا۔

غزالی، غزالی کیسے بنے؟

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے بہت اونچا مقام عطا فرمایا تھا، مدرسہ نظامیہ جو اس زمانے میں عالم اسلام کا سب سے بڑا مدرسہ تھا، اس کے منصبِ صدارت پر فائز تھے، بڑے بڑے علماء آپ کی خدمت میں علم حاصل کرنے کے لیے آتے تھے، امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی زندگی پر غور کیا تو میں نے دیکھا کہ میری زیادہ تر توجہ ان علوم کی طرف ہے جو آخرت کے اعتبار سے زیادہ نافع نہیں ہیں اور میں نے اپنی نیت کو ٹٹولا تو معلوم ہوا کہ اس میں حب جاہ کام کر رہی ہے۔

چناں چہ آپ نے اس منصب کو چھوڑا اور صحرانوردی اختیار کی اور گیارہ سال تک اپنی اصلاح کے لیے اس طرح صحرانوردی میں مشغول رہ کر اپنا تزکیہ کر لیا، اس کے بعد جب آپ مسندِ تدریس پر بیٹھے ہیں تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کے علوم کے فیض کو اس درجے پر پہنچایا کہ آج تک وہ سلسلہ جاری ہے۔

مولوی ہرگز نہ شد مولائے روم

مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ کا بھی علمی اعتبار سے بہت اونچا مقام تھا، جب آپ کی سواری نکلتی تھی تو آپ کے پیچھے جہاں طلبہ اور علماء کی جماعتیں ہوتی تھیں، وہاں شاہی خاندان کے امرائے سلطنت کی جماعت بھی ساتھ ہوتی تھی، اس شان سے ان کی سواری نکلتی تھی

لیکن ان کو بھی دل نے اسی طرح ٹوکا تو انھوں نے حضرت شمس تبریزی رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت اختیار کی، چناں چہ پھر ان کو وہ مقام حاصل ہوا کہ آج تک دنیا ان کو یاد کرتی ہے، فرماتے ہیں:

مولوی ہرگز نہ شد مولائے روم		تا غلامِ شمس تبریزی نہ شد

''مولوی'' اس وقت تک مولائے روم نہیں بنا، جب تک شمس تبریزی کی غلامی میں نہیں آیا، ان کی صحبت اختیار نہیں کی اور جب ان کی صحبت اختیار کی تو اللہ تعالیٰ نے وہ فیوض عطا فرمائے کہ آج تک اس کا سلسلہ مسلسل جاری ہے۔

اکابر دیوبند آسمانِ علم وعمل کے مہرِ تاباں کیسے بنے؟

ہمارے اکابر: حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت سہارنپوی رحمۃ اللہ علیہ، شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا رحمۃ اللہ علیہ، اور دوسرے حضراتِ اکابر، ان کے علوم کو، ان کی کتابوں کو جب ہم دیکھتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو کیسے علوم ومعارف سے نوازا تھا، آج تو بہت سے عالموں کے لیے ان علوم کا پڑھنا بھی دشوار ہوجاتا ہے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے فتاوی اٹھا کر دیکھ لو، جوابات ایسے انداز میں ہیں کہ بعض تو اس کو بھی سمجھ نہیں سکتے اور حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریرات کا تو کہنا ہی کیا! لیکن ان حضرات نے اپنے علم کی حقیقت کو حاصل کرنے کے لیے حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت اختیار کی، جو رسمی اعتبار سے عالم نہیں تھے، صرف کافیہ تک پڑھے

ہوئے تھے۔لیکن ان حضرات نے ان کی صحبت اختیا کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کی تو ان کو یہ مقام حاصل ہوا۔

تجھے آباء سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی

آج کل ہمارے علماء کا حال یہ ہے کہ جو اہلِ علم اصحابِ نسبت ہیں، ان کے پاس جانے سے بھی عار محسوس کرتے ہیں، جو رسمی عالم نہیں ہیں، وہاں تو ان کے جانے کا سوال ہی نہیں ہوتا۔لیکن ہمارے یہ اکابر جن کی طرف نسبت کرنے کو ہم اپنے لیے سعادت اور فخر کی چیز سمجھتے ہیں، انھوں نے ایک غیر عالم صاحبِ نسبت کے ساتھ تعلق قائم کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کیا۔

حضرت حاجی صاحبؒ عالم گر تھے

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا کہ: حضرت! یہ حاجی صاحب عالم تھے؟ تو حضرت جواب میں فرمایا کہ: عالم گر تھے یعنی عالم بنانے والے تھے۔

کسی نے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا کہ: آپ نے حاجی صاحبؒ کی صحبت کیوں اختیار کی؟ تو فرمایا کہ بھائی! دیکھو! ایک آدمی میٹھائیوں کے نام پڑھے کہ اس میٹھائی کا یہ نام ہے اور اس کا یہ نام ہے اور فلانی کا یہ نام ہے، اس کا یہ فائدہ ہوتا ہے اور اس میں یہ مواد استعمال ہوتا ہے، یہ سب کچھ اس نے پڑھ لیا۔اور ایک دوسرا آدمی ہے جو آپ کو حلوائی کی دکان پر لے جائے اور آپ کے منہ میں میٹھائی رکھ کر کہے کہ اس کا ذائقہ چکھو اور اس کا مزہ دیکھو، یہ میٹھائی کھاؤ، اس کا یہ فائدہ ہے۔

فرمایا کہ: حضرت حاجی صاحب کا معاملہ ایسا ہی ہے۔ہم نے کتابوں میں حروف تو پڑھے تھے، علوم حاصل کیے تھے لیکن کس علم کا کیا فائدہ ہے، حضرت حاجی صاحب نے ہم کو عملی طور پر بتلادیا۔

آج ہمارے طبقۂ علماء میں سب سے بڑی کمی ہے، وہ یہی ہے، اس کو دور کرنے کی ضرورت ہے۔

طالبِ علمانہ ذہنیت استفادے کی راہ کی بہت بڑی رکاوٹ

اس وقت طلبہ کا ایک خاص ماحول اور مزاج ہوا کرتا ہے، پہلے تو یہی کہا جاتا تھا کہ طلب علم کا سلسلہ ختم ہونے کے فوراً بعد یہ سلسلہ شروع ہوجائے لیکن آج کل کے حالات کے پیش نظر اگر فوراً اصحابِ نسبت کے یہاں جائیں گے تو یہ جو طالب علمانہ مزاج ہے، وہ استفادے کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ بنتا ہے؛ اس لیے پہلے کچھ عرصہ درس وتدریس میں گذارنا بہتر ہے۔

علماء کے لیے اصحابِ نسبت سے تعلق قائم کرنے کا بہترین وقت

طلبِ علم کے زمانے میں کوئی ذمہ داری ہوتی نہیں، سب کچھ بیٹھے بٹھائے ہوتا ہے، جب کچھ سال کسی مدرسے میں، مکتب میں پڑھائیں گے اور لوگوں سے واسطہ پڑے گا اور آپ کی ''انا'' مجروح ہوگی، اس کے بعد جب آپ کسی بزرگ کی خدمت میں جائیں گے تو ذرا قدر ہوگی۔

اس چیز کی (اصحابِ نسبت سے تعلق قائم کرنے کی) بہت اہمیت ہے، اس کی

طرف ہمارے طبقۂ علماء کو خاص طور پر توجہ دینے کی ضرورت ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق اور سعادت عطا فرمائے۔آمین۔

صادقین اور صالحین کا وجود ہر زمانہ میں رہے گا

پہلے قدیم زمانے میں خانقاہوں کا سلسلہ جیسا تھا، آج بھی اللہ تعالیٰ کے فضل سے وہ موجود ہے، اللہ تعالیٰ کے کچھ بندے آج بھی موجود ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآنِ پاک میں حکم دیا ہے:﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ ٱتَّقُواْ ٱللَّهَ وَكُونُواْ مَعَ ٱلصَّٰدِقِينَ۝١١٩﴾ [التوبة]اور اللہ تعالیٰ کسی ایسی چیز کا حکم نہیں دیتے جس پر عمل ممکن نہ ہو،﴿لَا يُكَلِّفُ ٱللَّهُ نَفۡسًا إِلَّا وُسۡعَهَا﴾[البقرة۝٢٨٦]۔حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: صادقین کا وجود ہر زمانے میں دنیا کے اندر رہے گا۔

بس! تلاش کرنے کی ضرورت ہے اور عقیدت اور محبت کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضر ہونے کی ضرورت ہے، آپ کے شیخ بڑے سے بڑے عالم ہوں لیکن جب تک کہ ان کے متعلق آپ کے دل میں محبت اور عقیدت نہ ہو تو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی باکمال صحبت کے باوجود منافقین کی محرومی کا سبب

نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں منافقین بھی حاضر ہوتے تھے اور نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شانِ افاضہ یعنی فیض پہنچانے والی صلاحیت میں کوئی کلام ہی نہیں تھا لیکن یہاں جو فیض حاصل کرنے والے لوگ تھے، ان کے اندر صلاحیت موجود نہیں تھی، ان کو جس عقیدت سے آراستہ ہونا چاہیے تھا، وہ نہیں تھے۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں کھلے لفظوں میں کہہ دیا:﴿إِذَا جَآءَكَ ٱلْمُنَٰفِقُونَ قَالُواْ نَشْهَدُ إِنَّكَ لَرَسُولُ ٱللَّهِۗ وَٱللَّهُ يَعْلَمُ إِنَّكَ لَرَسُولُهُۥ وَٱللَّهُ يَشْهَدُ إِنَّ ٱلْمُنَٰفِقِينَ لَكَٰذِبُونَ ۝١﴾ [المنافقون]، اس لیے حقیقت یہ ہے کہ جب تک عقیدت اور محبت نہیں ہوگی، وہاں تک فائدہ ہونے والا نہیں ہے۔

ہر زمانے میں لوگ اہل اللہ کی خدمت میں جاتے رہے، وہاں بھی یہی دو قسمیں ہوتی رہیں: جو عقیدت اور محبت سے حاضر ہوتے تھے، وہ توفیق یاب ہو کر واپس لوٹتے تھے، جو اعتراض کے ساتھ حاضری دیتے تھے، وہ محروم آتے تھے۔

لوگوں کو بزرگوں سے فائدہ نہ پہنچنے کا بڑا سبب

حضرت شاہ وصی اللہ صاحب الٰہ آبادی رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کے اجل خلفاء میں سے ہیں، ان کے رسائل چھپے ہوئے ہیں، ایک رسالہ ہے: ''اعتقاد اور انکار'' اس میں اسی موضوع پر کلام ہے، لوگ یہ شکایت کرتے ہیں کہ ہم بزرگوں کی خدمت میں جاتے ہیں لیکن ہم کو فائدہ نہیں ہوتا، حضرت نے اس کا بہت تفصیل سے جواب دیا ہے کہ فائدہ کیوں نہیں ہوتا، فائدہ حاصل کرنے کے لیے جس اعتقاد اور محبت کے ساتھ جانا چاہیے، وہ نہیں ہے، پھر فائدہ کہاں ہوگا؟، ورنہ تو دینے والی ذات اللہ تبارک وتعالیٰ کی ہے۔

دنیا دار الاسباب ہے

دینے والا اللہ ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو دار الاسباب بنایا ہے، دنیا کا نظام

اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایسا قائم کیا ہے کہ ہر چیز کا ایک سبب ہے، اس سبب کو آپ اس کی شرائط کے ساتھ اپناؤ گے تو وہ چیز حاصل ہوگی۔

اگر آپ کو دودھ چاہیے اور رات بھر اس کے لیے دعا کرتے رہیں تو وہ آسمان سے نہیں برسے گا، دودھ کے لیے آپ کو بھینس کا، گائے کا، بکری کا سہارا لینا پڑے گا، کوئی آدمی یہ کہے کہ یہ بھینس کالی کیوں ہے؟ میں تو اس سے دودھ نہیں لیتا، ارے بھائی! شیرنی سے دودھ حاصل کرونا! شیرنی اپنی جگہ پر کیسی ہی بہادر اور طاقتور سہی، لیکن دودھ تو آپ کو گائے اور بھینس سے ہی ملے گا، شیرنی سے ملنے والا نہیں ہے۔

آپ آم کا پھل لینا چاہتے ہیں تو آپ کو آم کے درخت سے تعلق قائم کرنا پڑے گا، وہیں سے آپ کو آم کا پھل ملے گا، چیکو چاہیے تو چیکو کے درخت سے ملے گا، انگور چاہیے تو انگور کی بیل سے ملے گا، یہ دار الاسباب ہے۔

شرائط کی رعایت سے ہی فائدہ حاصل ہوگا

اسی طرح آپ کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق قائم کرنا ہے تو اہل اللہ سے تعلق قائم کرنا پڑے گا لیکن اہل اللہ کے ساتھ تعلق قائم کرنے کے اور ان سے استفادے کے کچھ شرائط ہیں، ان میں سب سے بڑی شرط یہ ہے کہ جب آپ ان کے پاس جاویں تو ان کے متعلق آپ کے دل میں کوئی اعتراض نہ ہو۔

سوشل میڈیا کی تباہ کاریاں

آج کل عام مزاج اعتراض والا بنا ہوا ہے، بچپن سے اخبارات پڑھتے ہیں اور

آج کل تو اس سوشل میڈیا نے ہمارے قلوب اور اذہان کا کباڑا کر دیا ہے، دنیا میں کوئی اچھا آدمی ہے ہی نہیں، کوئی ایسی شخصیت ہے کہ جس کے متعلق سوشل میڈیا پر کوئی کلام نہ کیا گیا ہو؟۔

آج کیا ہو رہا ہے؟ ایک آدمی بے چارہ اپنی سعادت سمجھ کر کسی نیک بندے کی خدمت میں جاتا ہے، اس کے چار دوست ہیں، چاروں کے چاروں اس کو ٹارچر کرتے رہتے ہیں کہ تو اس کے پاس جاتا ہے؟ وہ تو ایسا ہے، وہ تو ویسا ہے، اس نے تو اتنے پیسے کھائے ہیں۔ اس سے پوچھیں کہ ذرا بتاؤ تو! اس نے کس کے پیسے کھائے ہیں؟ تو چپ ہو جائیں گے لیکن یہ کہیں گے ضرور۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کے دل میں اس کے شیخ کے متعلق جو عقیدت تھی، وہ ختم ہو جاتی ہے اور یہی بنیاد تھی فیض کے حاصل ہونے کی تو فیض کا سلسلہ بھی وہیں ختم ہو جاتا ہے۔

آج دنیا کا مزاج ''ہم تو ڈوبے ہیں صنم، تمھیں بھی لے ڈوبیں گے'' والا بنا ہوا ہے، خود بھی ان برائیوں کے اندر مبتلا ہیں اور دوسروں کو بھی ان میں ڈالنا چاہتے ہیں، اس لیے بہت زیادہ سنبھل کر رہنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں چاہیے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے فیض کے یہ چشمے جہاں اپنی اپنی جگہ پر جاری ہوں، اس کا جو طریقہ ہے، اس طریقے کے مطابق اس کو حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں اس کی توفیق اور سعادت عطا فرمائے، آمین۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

مکمل ومدلل تعزیت

بتاریخ: ۱۱ / رمضان المبارک ۱۴۳۶ھ ۔ بروز پیر، بعدِ ظہر

بمقام: ساحل کالونی، سورت

اقتباس

مرنے والے پر آدمی جو غم کرتا ہے وہ درحقیقت اپنا غم کرتا ہے، مرنے والے کا نہیں۔اس لیے کہ مرنے والے سے جو توقعات وامیدیں تھیں اوراس سے ہمیں جو فائدہ پہنچ رہا تھا وہ فائدہ منقطع ہوگیا، اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ جس سے جتنا زیادہ فائدہ پہنچ رہا ہوتا ہے اس کی جدائی پر رونے والے بھی اتنے ہی زیادہ ہوتے ہیں، ایک آدمی بوڑھا ہوگیا، اب اس کی زندگی سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ رہا ہے، ایسا آدمی جب دنیا سے جاتا ہے تو لوگ روتے ہیں، لیکن کہتے ہیں کہ بہت معذور ہوگئے تھے، اچھا ہوا اللہ تعالیٰ نے ان کی مشکل آسان کردی اوراٹھالیا۔گویا ان سے توقعات بھی زیادہ نہیں تھی تو غم بھی اتنا زیادہ نہیں ہے۔اور جوانی کی موت پر غم زیادہ ہوتا ہے کہ اس سے امیدیں بھی وابستہ تھیں اور فائدہ بھی زیادہ پہنچ رہا تھا جو اچانک منقطع ہوگیا۔اور بچوں کی وفات پر اس وجہ سے غم زیادہ ہوتا ہے کہ مستقبل میں ان سے بہت کچھ توقعات ہوتی ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا، ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا، ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا، من يهده الله فلا مضل له، ومن يضلله فلا هادي له، ونشهد أن لا إلٰه إلا الله وحده لا شريك له، ونشهد أن سيدنا ومولانا محمداً عبده ورسوله، أرسله إلىٰ كافّة الناس بشيراً ونذيراً، وداعياً إلى الله بإذنه وسراجاً منيراً، صلّى الله تعالىٰ عليه وعلىٰ آله وأصحابه وبارك وسلّم تسليماً كثيراً كثيراً.

أما بعد: فَأَعُوْذُ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ: تَبَٰرَكَ ٱلَّذِى بِيَدِهِ ٱلۡمُلۡكُ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيرٌ ۝١ ٱلَّذِى خَلَقَ ٱلۡمَوۡتَ وَٱلۡحَيَوٰةَ لِيَبۡلُوَكُمۡ أَيُّكُمۡ أَحۡسَنُ عَمَلًاۚ وَهُوَ ٱلۡعَزِيزُ ٱلۡغَفُورُ ۝٢ [الملك]

وقال تعالىٰ: وَلَنَبۡلُوَنَّكُم بِشَىۡءٍ مِّنَ ٱلۡخَوۡفِ وَٱلۡجُوعِ وَنَقۡصٍ مِّنَ ٱلۡأَمۡوَٰلِ وَٱلۡأَنفُسِ وَٱلثَّمَرَٰتِۗ وَبَشِّرِ ٱلصَّٰبِرِينَ ۝١٥٥ ٱلَّذِينَ إِذَآ أَصَٰبَتۡهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوٓاْ إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّآ إِلَيۡهِ رَٰجِعُونَ ۝١٥٦ [البقرة]

وقال تعالىٰ: إِنَّمَا يُوَفَّى ٱلصَّٰبِرُونَ أَجۡرَهُم بِغَيۡرِ حِسَابٍ ۝١٠ [الزمر]

شریعتِ مطہرہ کا حسن

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس پوری کائنات کو پیدا فرما کر انسانوں کو خاص طور پر اپنی

عبادت کے لیے پیدا فرمایا، اور کائنات کی ہر چیز کو انسان کی خدمت اور فائدہ کے لیے پیدا فرمایا اور پھر اللہ تعالیٰ جن چیزوں اور جن کاموں سے راضی ہوتا ہے وہ بھی بتلا دیا اور جن کاموں اور جن چیزوں سے ناراض ہوتا ہے وہ بھی بتلا دیا۔ حضراتِ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ذریعہ پوری انسانیت پر واضح کر دیا کہ زندگی کا کون سا طریقہ اللہ تعالیٰ کو پسند اور محبوب ہے اور کون سا طریقہ اللہ تعالیٰ کو ناپسند اور مغبوض ہے، اب ہماری عبدیت کا تقاضہ یہ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کا اہتمام اور کوشش کریں، اور ہماری طرف سے کوئی ایسی حرکت، کوئی ایسا فعل، کوئی ایسا قول، یا کوئی ایسی چیز صادر نہ ہو جو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا سبب ہو۔ اللہ تعالیٰ نے نبیٔ کریم ﷺ کے واسطہ سے شریعتِ مطہرہ کی شکل میں زندگی گزارنے کا جو طریقہ اور دستور انسانیت کو عطا فرمایا، اس میں انسانی زندگی کے تمام شعبوں اور انسانوں کو پیش آنے والے تمام حالات سے متعلّق واضح ہدایات اور رہنمائی موجود ہے۔ انسان کو جو مختلف حالات پیش آتے ہیں ان میں ایک مصیبت بھی ہے کہ انسان کے مزاج کے خلاف کوئی بات پیش آجائے، کوئی تکلیف واقع ہو جس کی وجہ سے انسان کی طبیعت پر اثر ہو؛ تو ایسے موقعہ پر اسے کیا کرنا چاہیے؟ اس سلسلہ میں بھی نبیٔ کریم ﷺ نے ہمیں ہدایات عطا فرمائی ہیں، اور قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر فرما دیا: ﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُم بِشَيْءٍ مِّنَ ٱلْخَوْفِ وَٱلْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ ٱلْأَمْوَٰلِ وَٱلْأَنفُسِ وَٱلثَّمَرَٰتِ﴾ ہم تم کو کچھ ڈر وخوف کے ذریعہ، بھوک کے ذریعہ، اور تمہارے مالوں اور تمہاری جانوں اور تمہارے پھلوں اور پیداوار میں کچھ کمی کے ذریعہ آزمائیں گے ﴿وَبَشِّرِ ٱلصَّٰبِرِينَ ﴿١٥٥﴾﴾ اس موقعہ پر اللہ کے جو

بندے صبر سے کام لیتے ہیں انہیں آپ خوشخبری اور بشارت سنا دیجئے ﴿ ٱلَّذِينَ إِذَآ أَصَٰبَتۡهُم مُّصِيبَةٞ﴾ ان کا حال یہ ہے کہ جب ان کو کوئی تکلیف یا مصیبت پہنچتی ہے تو وہ فوراً اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوکر یہ کلمات اپنی زبان سے ادا کرتے ہیں ﴿إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّآ إِلَيۡهِ رَٰجِعُونَ ۝١٥٦﴾ ہم اللہ تعالیٰ ہی کے ہیں اور ہمیں اللہ تعالیٰ ہی کی طرف لوٹ کر کے جانا ہے۔

صبر کی حقیقت

اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمیں صبر کا حکم جو دیا ہے یہ دراصل ایک بہت عظیم نعمت ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی بندہ کو دی جاتی ہے۔صبر کی حقیقت حضراتِ علماء نے یہ بیان فرمائی ہے ”حَبْسُ النَّفْسِ عَلٰی مَایَقْتَضِیْهِ الشَّرْعُ وَالْعَقْلُ“شریعت اور عقل جن چیزوں کا تقاضہ کرتی ہیں ان کے مطابق اپنے نفس کو جمانا۔جیسا شریعت چاہتی ہے اس کے مطابق اپنے نفس سے کام کروانا۔جیسے:شریعت نے نماز کا حکم دیا گیا ہے۔تو ظاہر ہے کہ نماز کی ادائیگی کے لئے بندے کو بہت ساری مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے،مثلاً:سردی کے زمانے میں جلدی سے اٹھنا،اپنی نیند کو قربان کرنا،اور ٹھنڈے پانی سے وضو کرنا،وغیرہ۔اسی طرح شریعت کے تمام اوامر کی بجا آوری میں آدمی کو مجاہدات اور مشقتیں پیش آتی ہیں،ان کو جھیلنے کے لئے اپنے نفس کو جمانا پڑتا ہے اور نفس سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔

اور بہت سی مرتبہ آدمی اپنی عقل کے تقاضہ کی وجہ سے کوئی کام کرتا ہے،جیسے:

بیماری کے زمانہ میں کڑوی دوا استعمال کرنا۔تو کڑوی دوا استعمال کرنا کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسے آدمی پسند کرے، مگر پھر بھی آدمی سوچتا ہے کہ اگر اس وقت میں تھوڑی سی تکلیف برداشت کرلوں گا تو اس کے نتیجہ میں صحت ہوگی،تو پھر میں بے شمار حلاوتوں سے فائدہ اٹھاسکوں گا۔اور ہر حالت میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو مکلف بنایا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق چلے۔

جو دیا وہ بھی،اور جو لیا وہ بھی؛ اللہ تعالیٰ ہی کا

اللہ تعالیٰ نے ہمیں مختلف نعمتیں عطا فرمائی ہیں جو دراصل اللہ تعالیٰ کی امانتیں ہیں جو ہمارے پاس ایک مقرّرہ وقت تک فائدہ اٹھانے کے لئے دی گئی ہیں۔ بخاری شریف میں واقعہ موجود ہے کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک صاحبزادی کا ایک بچہ بیمار تھا (حدیث کی شرح کرنے والے حضرات علماء نے وضاحت فرمائی ہے کہ وہ صاحبزادی حضرت زینبؓ تھی)اور وہ بچہ بالکل زندگی کے آخری حالت میں تھا،گویا آخری سانسیں لے رہا تھا۔انہوں نے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کہلوایا کہ آپ ضرور تشریف لایئے، میرے بچے کی آخری گھڑیاں ہیں۔حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے جواب میں بجائے تشریف لے جانے کہ یہ پیغام بھیجا:"إِنَّ للهِ مَا أَخَذَ وَلَه مَا أَعْطىٰ وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَه بِأَجَلٍ مُّسَمّٰى، فَلْتَصْبِرْ وَلْتَحْتَسِبْ" جو کچھ اللہ تعالیٰ لے گا وہ بھی اسی کا ہے،اور جو دیا ہے وہ بھی اسی کا دیا ہوا ہے (چاہے وہ انسان ہو یا دوسری نعمتیں ہوں) اور ہر چیز کا اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں ایک وقت مقرر ہے،آدمی اسی وقت تک ان سے فائدہ

اٹھاتا ہے، جب وہ وقت ختم ہوجاتا ہے تو وہ چیز اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے لے لی جاتی ہے۔ گویا یہ بچہ بھی اللہ تعالیٰ کی ایک امانت تھی جو اس نے عاریت کے طور پر استعمال کے لئے ہمیں دی ہوئی تھی۔

لہٰذا صاحبزادی (حضرت زینبؓ) سے کہہ دیا جائے کہ وہ صبر سے کام لیں اور اللہ تعالیٰ سے ثواب کی امید رکھیں۔ جب نبیٔ کریم ﷺ کا یہ پیغام ان کے پاس پہنچا تو انہوں نے دوبارہ باصرار کہلوایا کہ آپ ضرور تشریف لائیے۔ ان کے اصرار پر حضور اکرم ﷺ تشریف لے گئے، آپ ﷺ کے ساتھ حضرت اسامہ بن زیدؓ، حضرت سعد بن عبادہؓ، حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ وغیرہ حضرات بھی تھے۔ جب آپ وہاں پہنچے تو وہ بچہ آپ ﷺ کے ہاتھ میں دیا گیا، اس کی سانس اکھڑ رہی تھی، یہ منظر دیکھ کر نبیٔ کریم ﷺ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ آپ کی یہ کیفیت دیکھ کر حضرت سعد بن عبادہؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ بھی روتے ہیں؟ نبیٔ کریم ﷺ نے فرمایا: یہ ایک جذبۂ رحمت ہے جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہر انسان کے قلب میں رکھا ہے۔ اور انسان جب کسی مصیبت زدہ کو دیکھتا ہے تو اسی جذبۂ رحمت کی وجہ سے بے چین ہوکر اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ یہ تو گویا اللہ تبارک وتعالیٰ کی ایک نعمت ہے جو اس نے عطا فرمائی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے انہیں پر رحم کا معاملہ کرتا ہے جو دوسرے بندوں پر رحم کا معاملہ کرتے ہیں۔

معلوم ہوا کہ کسی آدمی کو کسی مصیبت میں دیکھ کر، یا کسی مصیبت کے آنے پر غیر اختیاری طور پر آدمی کے اوپر جو کیفیت طاری ہوتی ہے اور اس کے نتیجہ میں آنسو بھی بہتے

ہیں اور کبھی زبان سے کوئی ایسا جملہ بھی نکل جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے فیصلہ پر ناراضگی کا نہ ہو، بلکہ اپنی تکلیف کے اظہار کا ہو؛ تو یہ شریعت کی نگاہوں میں ناپسندیدہ نہیں ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات پر حضرت فاطمہؓ کا شدتِ غم

بخاری شریف میں حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ جس وقت نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مرض الوفات میں مبتلا تھے تو حضرت فاطمہؓ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تکلیف ان سے دیکھی نہیں گئی تو بے چین ہوکر ان کی زبان پر یہ جملہ آیا: ''وَاكَرْبَ أَبَتَاهْ'' ہائے میرے ابا کی تکلیف! گویا مجھ سے دیکھی نہیں جاتی۔ یہ سن کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''لَيْسَ عَلٰى أَبِيكِ كَرْبٌ بَعْدَ الْيَوْمِ'' تمہارے ابا پر آج کے بعد کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ یعنی تمہارے ابا پر بھی اللہ تعالیٰ کا وہ حکم آرہا ہے جس سے کسی کو مفر اور چھٹکارا نہیں، گویا موت کا وقت قریب آرہا ہے۔ پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات ہوگئی تو حضرت فاطمہؓ کی زبان پر یہ الفاظ تھے: ''يَا أَبَتَاهُ! أَجَابَ رَبًّا دَعَاهُ، يَا أَبَتَاهُ! جَنَّةُ الْفِرْدَوسِ مَأْوَاهُ، يَا أَبَتَاهُ! إِلَى جِبْرِيلَ نَنْعَاهُ'' ہائے میرے ابا! انہوں نے اپنے رب کی پکار پر لبّیک کہا، یعنی اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے پاس بلالیا اور آپ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق وہاں تشریف لے گئے۔ ہائے میرے ابا! جنت الفردوس ان کا ٹھکانا ہے۔ ہائے میرے ابا! ہم ان کی موت سے حضرت جبرئیل کو باخبر کررہے ہیں۔

اسی روایت میں آگے یہ بھی ہے کہ جب لوگ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دفن کرکے واپس

لوٹے تو حضرت فاطمہؓ نے حضرت انسؓ سے فرمایا: ’’يَا أَنَسُ! أَطَابَتْ أَنْفُسُكُمْ أَنْ تَحْثُوْا عَلٰى رَسُولِ اللهِ ﷺ التُّرَابَ‘‘ تمہارے دلوں نے کیسے گوارا کیا کہ نبیٔ کریم ﷺ کے جسمِ اطہر پر مٹی ڈالو۔

یہ نوحہ نہیں

شراحِ حدیث نے لکھا ہے کہ حضرت فاطمہؓ کی زبان سے یہ الفاظ شدتِ غم کی وجہ سے غیر اختیاری طور پر نکلے تھے، یہ نوحہ میں شمار نہیں۔ نوحہ کی حقیقت تو یہ ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کے فیصلہ پر ناراض ہو کر ماتم کرے، یا حقیقت میں دل میں کوئی کیفیت نہ ہو لیکن بہ تکلّف اپنی زبان اور حال سے غم کا اظہار کرے۔ پہلے زمانے میں مستقل پیشہ ور (Professional) عورتیں ہوا کرتی تھی، جن کا کام ہی یہ ہوا کرتا تھا کہ کسی کے میّت کے موقعہ پر ان کے گھر جا کر رویا دھویا کرتی تھیں، اپنے کپڑے پھاڑا کرتی تھیں، اپنے رخسار پر طمانچے مارا کرتی تھیں اور اپنے بالوں کو کھول دیا کرتی تھیں۔ مطلب یہ ہے کہ غم کے اظہار کے لئے قصداً اس طرح کے طریقہ اختیار کئے جاتے تھے، حالاں کہ حقیقت میں دل کے اندر کوئی غم نہ ہوتا تھا؛ تو ایسے نوحہ والے طریقوں سے شریعت نے منع فرمایا ہے۔ باقی کوئی آدمی حقیقتاً کسی مصیبت اور آفات پر قلب کے مجروح ہونے کی وجہ سے غیر اختیاری طور پر روئے اور اس کی زبان سے کچھ ایسے جملے بھی نکل جائیں جس پر اللہ تبارک وتعالیٰ کے کسی فیصلہ پر ناراضگی مقصود نہ ہو؛ تو یہ شریعت کے حکم کے خلاف نہیں ہے۔ حضرتِ فاطمہؓ کے جملے بھی اسی قبیل سے تھے۔

دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشیت

خلاصہ یہ ہے کہ مصیبت کی وجہ سے آدمی کے دل کا مجروح ہونا طبعی اور فطری چیز ہے۔اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کو بنایا ہی ایسا ہے:

دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشیت، درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار ، کوئی ہمیں رلائے کیوں

تو ایسے حالات جو آدمی کے لئے مصیبت کا سبب بنتے ہیں ان میں قلب کے اندر غم کی کیفیت کا پیدا ہونا مذموم نہیں ہے۔ہاں! اللہ تبارک وتعالیٰ کے فیصلے پر آدمی راضی رہے۔

بیت الحمد

بخاری شریف کی روایت ہے کہ جب کسی کی اولاد کا انتقال ہوتا ہے اور فرشتے اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے کے باوجود فرشتوں سے پوچھتے ہیں کہ تم نے میرے بندے کی اولاد کی روح کو قبض کرلیا؟ فرشتے کہتے ہیں: جی ہاں! باری تعالیٰ۔ پھر اللہ تبارک تعالیٰ پوچھتے ہیں: تم نے اس کے جگر کے ٹکڑے کو لے لیا؟ فرشتے کہتے ہیں: جی ہاں۔ باری تعالیٰ پوچھتے ہیں: اس پر اس نے کیا کہا؟ فرشتے کہتے ہیں: اس نے آپ کی تعریف کی اور ”انا لله وانا اليه راجعون“ پڑھا۔ باری تعالیٰ فرماتے ہیں: اس کے لئے جنت میں ایک گھر بنادو اور اس کا نام بیت الحمد رکھو۔ ”انا لله وانا اليه راجعون“ ان جملوں کے اندر ہمارے لیے بڑی تسلی ہے۔

''اناللہ وانا الیہ راجعون'' کا اہم سبق

اور''اناللہ''میں گویا ہمیں اس بات کا سبق دیا گیا ہے کہ ہم جس کے جانے پر غم کر رہے ہیں وہ اللہ تعالیٰ ہی کا تھا اور ہم بھی اللہ تعالیٰ ہی کے ہیں۔ بقول حکیم اختر صاحب نوراللہ مرقدہ: آپ کے گھر کے اندر الماری میں مختلف چیزیں ہیں، آپ نے ایک خانے میں چند چیزیں رکھیں، دوسرے خانے میں چند دوسری چیزیں رکھیں، پھر چند دنوں کے بعد پہلے خانے میں جو چیزیں رکھی تھیں ان میں سے ایک دو چیزیں لے کر نیچے کے خانے میں شفٹ کر دیں تو اس کا آپ کو پورا اختیار ہے، اس لیے کہ وہ سب چیزیں آپ ہی کی تھیں جس میں سے آپ نے اپنی ایک چیز میں کچھ تصرف کیا۔ اسی طرح ہمارے گھر کے مختلف افراد ہیں، اور وہ سب اللہ تعالیٰ ہی ملکیت ہیں، اب ان میں سے ایک فرد کو اس نے اس دنیا کے خانے میں سے اٹھا کر دوسری دنیا میں پہنچا دیا، تو وہ اس کا بھی مالک ہے اور ہمارا بھی مالک ہے، اور مالک اپنی مملوکہ چیز کے اندر کوئی تصرف کرتا ہے تو بندے کو اس کے متعلق کچھ بھی بولنے کا حق نہیں ہے کہ اس نے ایسا تصرف کیوں کیا؟

اور پھر آگے تسلی کے لئے فرمایا کہ جانے والے پر غم کیوں کرتے ہو؟''وانا الیہ راجعون''، تم بھی اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہو۔ اگر آج ہمارے گھر کا کوئی فرد بمبئی یا انگلینڈ چلا جائے اور ہمیں معلوم ہو کہ دو مہینے کے بعد ہم بھی وہیں جانے والے ہیں تو اس کی جدائی کا اتنا غم نہیں ہوتا، اس لئے کہ ہم یوں سوچ لیتے ہیں کہ چلو ٹھیک

ہے، ایک دو مہینے کے بعد ہم بھی وہیں جانے والے ہیں۔ ''وانا الیہ راجعون'' کے اندر گویا اسی حقیقت کو بتلایا ہے کہ آج ہمارے گھر کا جو فرد اس دنیا سے آخرت کے طرف سدھار گیا ہے، تو کل کو ہمیں بھی وہیں جانا ہے، جدائی کا زمانہ کوئی زیادہ طویل نہیں ہے، بلکہ مختصر سا زمانہ ہے، ہم بھی وہیں پہنچنے والے ہیں، اس لیے اس جدائی کی وجہ سے زیادہ غم کرنے کی ضرورت نہیں۔

جانے والا یہ سبق دے کر گیا

البتہ یہ ہے کہ اس جانے والے نے جاتے ہوئے ہمیں اس بات کا سبق دیا اور اس بات کی طرف متوجہ کیا کہ تم بھی اس کی تیاری کرلو۔ ہمارے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس جب کسی کی وفات کے اوپر کوئی خط آتا اور حضرت تعزیتی جواب لکھواتے تو اس میں یہی لکھواتے تھے کہ: جانے والا تو چلا گیا، لیکن ہمیں یہ سبق دے کر گیا ہے کہ ہمیں اپنے لئے تیاریاں کرنے کی ضرورت ہے، جہاں وہ گیا ہے ایک دن ہمیں بھی وہاں جانا ہے۔

بشارتیں بہ زبانِ رسالت

پہلی بشارت

اللہ کے رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سلسلے میں جو بشارتیں ارشاد فرمائی ہیں وہ تو ایسی ہیں کہ جن کی وجہ سے ہمیں بجائے غم کے خوش ہونا چاہیے۔ حدیثِ پاک میں آتا ہے، حضرت عمرؓ ایک مرتبہ تشریف فرما تھے، سامنے سے ایک جنازہ گزرا، لوگوں نے

اس کی تعریف کی۔ آپ نے فرمایا: ''وَجَبَتْ''۔ پھر دوسرا جنازہ گزرا، لوگوں نے اس کی بھی تعریف کی آپ نے فرمایا: ''وَجَبَتْ''۔ تیسرا جنازہ گزرا تو لوگوں نے اس کی برائی بیان کی تو آپ نے فرمایا: ''وَجَبَتْ''۔ جو لوگ وہاں موجود تھے انہوں نے پوچھا: امیر المؤمنین! آپ نے ہر موقعہ پر ''وَجَبَتْ'' ہی فرمایا، واجب ہو گیا؛ اس کا کیا مطلب ہے؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا: میں نے وہی بات کہی جو نبیٔ کریم ﷺ نے فرمائی تھی کہ اگر کسی کے مرنے پر اس کے متعلق تین آدمی اس کی نیکی کی گواہی دیں تو اس کے لئے جنت واجب ہو گئی۔ ہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! اگر دو آدمی گواہی دیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: اگر دو گواہی دیں تب بھی اس کے لئے جنت واجب ہے۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ ہم نے ایک کا نہیں پوچھا، اگر پوچھتے تو امید ہے کہ حضور ﷺ اس کے متعلق بھی یہی فرماتے۔ اور یہاں تو بے شمار افراد ہیں جو جانے والی مرحومہ کی خوبیوں کا تذکرہ کر رہے ہیں اور ان کے کمالات کو بیان کر رہے ہیں؛ تو پھر بھلا ان پر نبیٔ کریم ﷺ کی بشارت کیوں صادق نہیں آئے گی! ایک بشارت تو یہ ہوئی۔

دوسری بشارت

دوسری بشارت بھی ہے، حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ کسی کی وفات پر مسلمانوں کا ایک مجمع جس کی تعداد سو افراد تک پہنچ جائے، اور دوسری روایت میں ہے کہ مسلمانوں کا ایک مجمع جس کی تعداد چالیس ہو؛ اور وہ اس کے لئے سفارش کرے تو اللہ تبارک وتعالیٰ ان کی سفارش کو اس جانے والے کے حق میں قبول کر لیتا ہے۔ یہاں تو مرحومہ کے

جنازہ کی نماز پڑھنے والوں کی بڑی کثیر تعداد تھی ۔گو یا یہ سعادت و بشارت بھی ان کے حق میں پوری ہوئی ۔

تیسری بشارت

ایک صحابی کا معمول تھا کہ جب کسی کے جنازے میں تشریف لے جاتے اور نماز پڑھانے کی نوبت آتی تو تین صفیں بنانے کا اہتمام کرتے تھے،اگر لوگ کم ہوتے تب بھی تین صفیں بنالیتے ۔اور وہ روایت بیان کرتے تھے کہ میں نے نبیٔ کریم ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جس مرنے والے پر تین صفوں نے نماز پڑھی ،اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کی مغفرت ہو جائے گی ۔ یہ بشارت بھی مرحومہ کو حاصل ہوئی ۔

علماء نے لکھا ہے کہ اگر کسی کے جنازہ میں صرف سات آدمی ہوں تو ان میں سے ایک امام بنے ،پہلی صف میں تین لوگ کھڑے رہیں ،دوسری صف میں دو ،اور تیسری صف میں ایک آدمی رہے،اس طرح تین صفیں ہو جائیں گی ۔

چوتھی بشارت

اس کے علاوہ بھی ایک بشارت ہے۔حدیثِ پاک میں نبیٔ کریم ﷺ نے اس امت کے مختلف شہداء کو شمار فرمایا،ان میں ایک یہ بھی ہے ’’وَالْمَرْأَةُ تَمُوتُ بِجُمْعٍ شَهِيدَةٌ‘‘ [سنن أبوداود، سنن النسائی] وہ عورت جو در دِزہ کے اندر انتقال کر جائے ۔گو یا اللہ تبارک وتعالیٰ نے شہادت کی سعادت بھی مرحومہ کو عطا فرمائی ۔

نبیٔ کریم ﷺ کے ان تمام ارشادات کی روشنی میں جب ہم اس واقعہ کو دیکھتے ہیں

تو بجائے غم کے خوشی کا موقعہ محسوس ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مرحومہ کو ان ساری بشارتوں کے ساتھ دنیا سے اٹھایا ہے۔

زندگی میں خوشی کے دو مواقع

حضرت قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ: انسان کی زندگی میں دو مواقع خوشی کے ہوا کرتے ہیں، ایک تو جب کوئی کام شروع کیا جاتا ہے اس وقت خوشی کا اظہار کیا جاتا ہے۔ اور دوسرا موقعہ کسی کام کے اختتام کا ہوتا اس وقت بھی خوشی کا اظہار کیا جاتا ہے۔ مثلاً: آپ مکان کی تعمیر کی بنیاد رکھتے ہیں اس وقت بھی لوگوں کو جمع کرتے ہیں، دعوت کرتے ہیں، دعائیں کرتے اور کراتے ہیں۔ اور جب مکان بن کر مکمل ہو جاتا ہے اس وقت بھی لوگوں کو جمع کرتے ہیں، دعوت کا اہتمام کرتے ہیں اور دعائیں کرتے ہیں۔ پہلے موقعہ پر جو خوشی ہوتی ہے وہ ایک توقع کے اوپر ہوتی ہے کہ آئندہ ہم جو کام کرنے جا رہے ہیں اس میں اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ یہ کام پایۂ تکمیل تک پہنچے گا۔ اور اختتام پر خوشی کا جو اظہار ہوتا ہے وہ اس نعمت کے حصول کے اوپر ہوتا ہے۔ جب کوئی آدمی دنیا سے گیا اور وہ اپنی زندگی کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق گزار کر گیا؛ تو یہ موقعہ نہایت خوشی کا ہوتا ہے۔

موت ایک پُل ہے

حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو لوگوں نے موت کے وقت یہ فرماتے ہوئے سنا: ”غَداً نَلْقىٰ الْأَحِبَّه، مُحَمَّداً وَّحِزْبَه“ کل ہم اپنے دوستوں سے ملاقات کریں گے، نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

اورآپ کے رفقاء سے ملیں گے۔اسی لیے کہا گیا ہے: ”اَلْمَوْتُ جَسْرٌ یُوْصِلُ الْحَبِیْبَ اِلٰی الْحَبِیْبِ“ موت ایک پُل ہے جوایک حبیب اوردوست (بندے) کواپنے حبیب اوردوست (اللہ تعالیٰ) سے ملاتا ہے۔

مبارک ہیں وہ لوگ

اورحقیقت تو یہ ہے کہ موت آدمی کی زندگی کا خاتمہ نہیں ہے، بلکہ جس مقصد کے لیے زندگی گزاری تھی اس مقصد کے حصول تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔ بقول شیخ سعدیؒ: مبارک ہیں وہ لوگ جنہوں نے ایسی زندگیاں گزاریں کہ جن کے جانے پر بے شمار رونے والے ہوں۔

یاد داری کہ وقت زادن تو، ہمہ خنداں بودند وتو گریاں
آں چناں بزی کہ وقت مردنِ تو، ہمہ گریاں بوندوتو خنداں

یادرکھو! جس وقت تم پیدا ہوئے تھے تو سب ہنس رہے تھے اورتم رورہے تھے۔ اس طرح زندگی گزاروکہ جب جانے کا وقت آئے توسب رورہے ہوں اورتم ہنس رہے ہو۔

نیکی کا کام کرلے اس سے پہلے کہ.....

خیرے کن اے فلاں وغنیمت شمارعمر		پیش ازاں کہ بانگ برآید کہ فلاں نہ ماند

اے فلانے! نیکی کا کام کرلے، اللہ تعالی نے جو زندگی عطا فرمائی ہے اس کوغنیمت سمجھ لے، اس سے پہلے کہ تمہارے متعلق یہ اعلان ہو کہ فلاں آدمی دنیا سے رخصت ہوگیا۔

آں پیر لاشہ کہ سپردند زیرِ خاک		خاکش چناں بخورد کہ استخواں نماند

اس بوڑھی لاش کو جب قبر کے حوالے کیا گیا تو قبر کی مٹی نے اس کو کھا کے ایسا ختم کر دیا کہ اس کی ہڈیاں بھی باقی نہ رہیں۔اس لیے ہمارا جسم تو ختم ہونے والا ہے، لیکن جو اعمال ہم کرلیں گے وہ ہمارے ساتھ جانے والے ہیں۔

غم درحقیقت اپنا ہے، مرنے والے کا نہیں

مرحومہ کا جانا واقعتاً غم کا سبب ہے، لیکن بقول حکیم الاسلامؒ: مرنے والے پر آدمی جو غم کرتا ہے وہ درحقیقت اپنا غم کرتا ہے، مرنے والے کا نہیں ۔اس لیے کہ مرنے والے سے جو توقعات وامیدیں تھیں اور اس سے ہمیں جو فائدہ پہنچ رہا تھا وہ فائدہ منقطع ہوگیا، اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ جس سے جتنا زیادہ فائدہ پہنچ رہا ہوتا ہے اس کی جدائی پر رونے والے بھی اتنے ہی زیادہ ہوتے ہیں، ایک آدمی بوڑھا ہو گیا، اب اس کی زندگی سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ رہا ہے، ایسا آدمی جب دنیا سے جاتا ہے تو لوگ روتے ہیں، لیکن کہتے ہیں کہ بہت معذور ہو گئے تھے، اچھا ہوا اللہ تعالیٰ نے ان کی مشکل آسان کر دی اور اٹھالیا۔گویا ان سے توقعات بھی زیادہ نہیں تھی تو غم بھی اتنا زیادہ نہیں ہے۔اور جوانی کی موت پر غم زیادہ ہوتا ہے کہ اس سے امیدیں بھی وابستہ تھیں اور فائدہ بھی زیادہ پہنچ رہا تھا جو اچانک منقطع ہو گیا۔اور بچوں کی وفات پر اس وجہ سے غم زیادہ ہوتا ہے کہ مستقبل میں ان سے بہت کچھ توقعات ہوتی ہیں۔

یہ نہ دیکھو کہ کیا گیا، بلکہ یہ دیکھو کہ کیا ملا!

اور کسی محبوب چیز کے چلے جانے پر ہمیں کیا مل رہا ہے؟ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد

ہے کہ باری تعالیٰ فرماتے ہیں: جب میں کسی بندے کی کسی محبوب چیز کو لے لیتا ہوں (یہاں لفظ ''صفی'' ہے یعنی محبوب چیز، چاہے انسانوں کے قبیل سے ہو یا اور کوئی پسندیدہ چیز ہو) اوراس پر وہ صبر کرتا ہے تو میں اس کے بدلے میں اس کو جنت عطا کرتا ہوں۔ ہمارے بزرگوں نے فرمایا ہے کہ: ''یہ نہ دیکھو کہ کیا گیا، بلکہ یہ دیکھو کہ کیا ملا!'' یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کسی بچے کا دوروپے کا قلم گم ہوگیا، وہ رورہا تھا،آپ نے اس سے کہا کہ بیٹا! روتا کیوں ہے؟ یہ دوسرا قلم لے لے،اوراس کو دس روپے کا قلم لاکر دے دیں؛ تو اب ظاہر ہے کہ اس کا تو فائدہ ہی ہوا کہ دو کا گیا اور دس کا ملا۔ اسی طریقے سے مرنے والے کے چلے جانے کی وجہ سے ہمیں جو کچھ بھی کمی ہوئی اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ ہمیں جنت عطا فرمارہے ہیں؛ تو اب ظاہر ہے کہ جنت کا تو کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا۔ اس لیے حقیقت تو یہ ہے ہمیں اللہ تعالیٰ کی ان عنایتوں اور بشارتوں کو دیکھنا اور سوچنا چاہیے۔

بچوں کا کیا ہوگا؟

دوسرا خیال یہ ہوتا ہے کہ جانے والا گیا تو اب اس کے بچوں کا کیا ہوگا؟ اور گھر کا کیا ہوگا؟ گویا خود اس کی ذات کے متعلق جذبۂ ترحم کام کرتا ہے، یا اس کی ذات کے تعلق رکھنے والی اولاد کے متعلق جذبۂ ترحم کام کرتا ہے۔ تو غور کرنا چاہیے کہ جس ذات نے یہ جذبۂ ترحم ہمارے اندر رکھا ہے، وہ ذات تو ہم سب سے زیادہ رحم کرنے والی ہے۔ مشکوٰۃ شریف میں حضرت عامِر رامؓ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ ایک آدمی نبیٔ کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور وہ ایک چادر اوڑھے ہوئے تھا، اس نے اپنے

ہاتھ پر اس چادر کا ایک پلہ ڈال رکھا تھا، اس نے آ کر نبیٔ کریم ﷺ سے عرض کیا کہ: اے اللہ کے رسول! درختوں کے ایک جھنڈ کے پاس سے میں گزر رہا تھا، مجھے اندر سے پرندے کے بچوں کی بولنے کی آواز آئی تو میں اندر گیا تو دیکھا کہ گھونسلے میں پرندے کے بچے تھے، میں نے ان کو لے لیا، جب اس جھنڈ میں سے باہر آیا تو ان بچوں کی ماں آ کر میرے سر پر منڈلانے لگی، میں نے بچوں پر جو چادر ڈالی تھی وہ ہٹا دی تو ماں آ کر ان بچوں پر گری اور ان سے بالکل چپک گئی، اب جانے کا نام نہیں لیتی، بچوں کے بازوؤں میں تو اُڑنے کی طاقت نہیں تھی اس وجہ سے وہ تو جا نہیں سکتے تھے، لیکن ماں تو اُڑ سکتی تھی پھر بھی بچوں کے ساتھ مہربانی، رحمت ومحبت کی وجہ سے وہاں سے ہٹ نہیں رہی تھی۔ نبیٔ کریم ﷺ نے اس آدمی سے کہا کہ بچوں کو نیچے رکھو۔ اس نے ان کو نیچے رکھا، ان کی ماں بھی بچوں کے ساتھ لپٹی ہوئی تھی، اور وہاں سے ہٹنے کا نام نہیں لیتی تھی، اس پر نبیٔ کریم ﷺ نے حضرات صحابہ کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ''أَتَعْجَبُونَ لِرُحْمِ أُمِّ الأَفْرَاخِ فِرَاخَهَا! فَوَالَّذِی بَعَثَنِی بِالْحَقِّ، للهُ أَرْحَمُ بِعِبَادِهِ مِنْ أُمِّ الأَفْرَاخِ بِفِرَاخِهَا'' کیا تم لوگوں کو اس ماں کے اپنے بچوں کے ساتھ جو مہربانی ورحمت اور محبت وشفقت ہے اس پر تعجب ہوتا ہے؟ قسم ہے اس ذات کی جس نے مجھے دینِ حق لے کر بھیجا ہے! اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں کے ساتھ اس سے زیادہ محبت ہے۔ مرحومہ کے بچوں کے ساتھ ہمیں جو محبت ہے اور ان کا ہمیں جتنا خیال ہو رہا ہے اللہ تعالیٰ کو ان کا اس سے زیادہ خیال ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سے زیادہ ان کو سنبھالیں گے۔ اور ہمارے پاس تو اسباب ووسائل بھی نہیں ہیں، وہ تو اسباب ووسائل کا مالک ہے، اس لیے وہی اپنے حکم

سے سب کچھ کرے گا، بلکہ ہم تو عام طور دیکھتے ہیں کہ ایسے بچے جن کے متعلق یہ خیال ہوتا ہے ان کو اللہ تعالیٰ ایسا نوازتا ہے، ان کی ایسی تربیت و پرورش ہوتی ہے اور ان کو ایسا پروان چڑھاتا ہے جس کا لوگ تصور بھی نہیں کرسکتے اور دنیا حیرت میں پڑ جاتی ہے۔

زیادہ غمگین ہونے کی ضرورت نہیں

بہر حال! ایک تو اس کے لیے غم ہوتا ہے۔ اور ایک غم جانے والے کے متعلق ہوتا ہے تو ان کے بارے میں تو جیسا کہ میں نے ابھی آپ کے سامنے ان کے متعلق بشارتیں بیان کی۔ ایک آدمی جہاں کہیں بھی جاتا ہے ان سب میں اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر اور کوئی ذات ایسی نہیں جو اپنے بندوں کے ساتھ مہربانی کرنے والی ہو جہاں وہ جاتا ہے۔ اس لیے حقیقت تو یہ ہے کہ مرحومہ جہاں گئی ہیں وہاں ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحم وکرم اور اعزاز واکرام کا جو معاملہ ہونے والا ہے، ویسا معاملہ تو ہم اور آپ بھی ان کے ساتھ نہیں کرسکتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسی سعادتوں اور بشارتوں سے نوازا ہے اس لیے ہمیں ان پر بھی زیادہ غمگین ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہا جو نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کھلائی ہیں (یعنی جنھوں نے بچپن میں نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کھیل لگایا تھا) جب نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا انتقال ہوگیا اس کے بعد ایک مرتبہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ چلو! آج ام ایمن رضی اللہ عنہا کے یہاں جائیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ان کے یہاں جایا کرتے تھے۔ چناں چہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو لے کر ان کے پاس پہنچے، ان دونوں کو دیکھ کر وہ رونے لگیں، تو حضرات شیخین

نے تسلی کے طور پر ان سے کہا کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ کے یہاں گئے ہیں، اور دنیا میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس جو کچھ تھا اس کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ کے یہاں جو نعمتیں آپ کو ملنے والی ہیں وہ اس سے بہت زیادہ بڑھ کر ہیں۔ گویا وہ دونوں ان کو تسلی کے الفاظ کہنا چاہتے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وہاں جو کچھ ملا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ بڑھ کر ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہاں دنیا میں حاصل تھا اس لیے ہمیں رونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے جواب میں انہوں نے ایک اور بات فرمائی جس کی طرف حضرات شیخین کی بھی توجہ نہیں گئی تھی، انہوں نے فرمایا کہ: میں اس پر نہیں رو رہی ہوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وصال ہو گیا، اس لیے کہ میں جانتی ہوں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وہاں اس سے بہتر ہی ملے گا جو یہاں دنیا میں ملا تھا، بلکہ میں تو اس بات پر رو رہی ہوں کہ دنیا والے وحی کی برکات سے محروم ہو گئے۔

مرحومین کا حق

اور اب ان کا حق بھی ہے کہ ہم ان کے لیے دعائے مغفرت اور ایصالِ ثواب کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کریں، اور ان کے ساتھ جو تعلق تھا اس نسبت پر ان کے حقوق کی ادائیگی کا اہتمام کرنا بھی چاہئے۔ حدیثِ پاک میں آتا ہے حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے یہاں جب کبھی بکری ذبح ہوتی تھی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت خدیجہؓ کی سہیلیوں کے یہاں بھی گوشت بھیجا کرتے تھے۔ گویا ان کے تعلقات کا خیال رکھنا یہ بھی بڑی اہمیت کی چیز ہے۔ مرحومین کے اہلِ تعلق کے ساتھ بھی اسی طرح کے سلوک کا اہتمام کرنا چاہئے۔

ہمارے لیے تو حضورِ اکرم ﷺ کا اسوہ موجود ہے

بہرحال! اس موقعہ پر خاص کر مستورات کو اور دیگر گھر والوں کے دلوں پر بھی غم تو ہوتا ہی ہے۔ تو غور کرنا چاہئے کہ نبیٔ کریم ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں آپ کی تین بڑی صاحبزادیاں انتقال فرما گئیں۔ ان میں سے حضرت زینبؓ کا وصال تو اسی درد میں ہوا تھا۔ جس کا واقعہ یہ ہوا تھا کہ جب ان کو مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ لایا جارہا تھا تو دشمنوں نے ان کو سواری پر سے گرادیا، اسی میں آپ کو اسقاط ہوگیا اور حمل ضائع ہوا اور اسی بیماری میں وہ اخیر تک رہیں اور اسی تکلیف میں ان کا انتقال ہوا۔ گویا ہوبہو اسی طرح کا واقعہ آپ کہہ سکتے ہیں جو آپ کے یہاں ہوا۔

اور دوسری دونوں صاحبزادیاں حضرت رقیہ اور حضرت ام کلثومؓ جو حضرت عثمانؓ کے نکاح میں یکے بعد دیگرے تھیں ان دونوں کا انتقال بھی نبیٔ کریم ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں ہوا۔ حضرت رقیہ کا انتقال تو اس وقت ہوا جب آپ ﷺ غزوۂ بدر میں مشغول تھے، گویا آپ کی غیر حاضری میں ہوا۔ اور دوسری حضرت ام کلثومؓ آپ کے سامنے انتقال فرما گئیں، ان کے جنازہ میں حضور ﷺ شریک ہوئے ہیں۔ اسی طرح حضرت زینبؓ کے جنازہ میں شریک تھے۔ گویا چار صاحبزادیوں میں سے تین بڑی صاحبزادیاں آپ کی موجودگی میں آپ کے سامنے انتقال فرما گئیں۔ اس لیے نبیٔ کریم ﷺ کا اسوہ ہمارے لیے موجود ہے، اسی کے اوپر ہمیں عمل کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان سب پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

دعائے مغفرت اورایصالِ ثواب کا اہتمام کریں

اب ہمیں ان تعلیمات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اپنی زندگیوں کو درست کرتے ہوئے آخرت کی تیاری کرنی چاہیئے، کسی کی موت کی کوئی گارنٹی نہیں دی جاسکتی کہ کب کس کا وقتِ موعود آ پہنچے، اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے آپ کو اس کے لیے تیار کریں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق وسعادت عطا فرمائے۔ اور جانے والوں کے لیے ہم خوب دعائے مغفرت اور زیادہ سے زیادہ ایصالِ ثواب کا اہتمام کریں۔ بقولِ حضرت تھانویؒ: ایصالِ ثواب کے مقابلہ میں دعائے مغفرت کا اہتمام زیادہ اہمیت رکھتا ہے، اور اس کی زیادہ قدر وقیمت ہے۔ روایتوں سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ اور اس کو ایک مثال دے کر بھی سمجھایا ہے کہ کوئی آدمی جیل میں ہے، اور آپ روزانہ اس کے لیے ٹفن بھیجتے ہیں، اور دوسرا آدمی اس کے لیے ٹفن تو نہیں بھیجتا لیکن اس کو وہاں سے نکالنے کے لیے محنت وکوشش کررہا ہے، تو ظاہر ہے کہ اس کی وہ محنت ہمارے ٹفن کے مقابلہ میں زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اور دعائے مغفرت کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ اگر اس کی مغفرت ہوچکی ہے تو اس کی وجہ سے درجات بلند ہوتے ہیں۔ اس لیے بھی اس کا اہتمام زیادہ ہو، اور دوسرے طریقوں سے بھی ان کے حقوق کو ادا کرنے کا اہتمام کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق وسعادت عطا فرمائے۔

دعا

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ وَتَبَارَكَ اسْمُكَ وَتَعَالٰى جَدُّكَ وَلَا اِلٰهَ غَيْرُكَ.

اَللّٰهمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ وَبَارِكْ عَلٰى سَيِّدِنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰٓى اٰلِ سَيِّدِنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدٍ كَمَا تُحِبُّ وَ تَرْضٰى بِعَدَدِ مَا تُحِبُّ وَتَرْضٰى.

رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَــنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ.

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَي الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ.

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ.

اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِحَيِّنَا وَمَيِّتِنَا، وشَاهِدنَا وَغَائِبِنَا، وَصَغِيرنَا وَكَبيرنَا، وَذَكَرِنَا وَأُنْثَانَا، اللَّهُمَّ مَنْ أَحْيَيْتَهُ مِنَّا فَأَحْيِهِ عَلَى الإِسْلاَمِ، وَمَنْ تَوَفَّيْتَهُ مِنَّا فَتوفَّهُ عَلَى الإِيمَان.

اَللَّهُمَّ اغْفِرْ لَهَا وَارْحَمْها، وَسَكِّنْها فِي الْجَنَّةِ، اَللَّهُمَّ باعِدْ بَيْنَها وَبَيْنَ خَطَايَاهَا كَمَا بَاعِدْتَ بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ. اَللَّهُمَّ أَكْرِمْ نُزُلَهَا، وَوَسِّعْ مُدْخَلَها، اللَّهُمَّ اغْسِلْ خطاياها بِالمَاءِ وَالثَّلْجِ وَالبَرَدِ، وَنَقِّها مِن الخَطَايَا كَمَا نَقَّيْتَ الثَّوْبَ الأَبْيَضَ مِنَ الدَّنَس.

اللَّهُمَّ اجْعَلْ قَبْرَها رَوْضَةً مِّنْ رِيَاضِ الْجَنَّةِ. اللَّهُمَّ اجْعَلْ قَبْرَها رَوْضَةً مِّنْ رِيَاضِ الْجَنَّةِ. اللَّهُمَّ اجْعَلْ قَبْرَها رَوْضَةً مِّنْ رِيَاضِ الْجَنَّةِ.

اے اللہ! مرحومہ کی بھرپور مغفرت فرما۔اپنی مغفرتوں اوررحمتوں سے ڈھانپ لے۔جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام ومراتب عطافرما۔اے اللہ! تیرے حبیب پاک ﷺ نے جوجو بشارتیں ارشادفرمائی ہیں ان تمام کاان کومورِدومصداق بنا۔ان کی قبرکو جنت کاباغیچہ بنا۔

اے اللہ!ان کے پسماندگان کو،والدین کو،بھائیوں بہنوں کو،شوہروبچوں کواور تمام ہی متعلقین کوصبرجمیل واجرِ جزیل عطافرما۔

اے اللہ!ان کی موجودگی میں جن نعمتوں اورراحتوں سےتونے ان کونوازاتھااس سلسلہ کوجاری رکھتے ہوئے اپنے خصوصی فضل کامعاملہ فرما۔اے اللہ! جانے والی کی خطاؤں سے درگزرفرما۔اس کےحسنات کوقبول فرما۔اپنےخصوصی فضل کامعاملہ فرما۔

اے اللہ! ہم سب کوبھی اپنی موت کی تیاری کرنے کی توفیق عطافرما۔غفلت کی زندگی سے حفاظت فرما۔اے اللہ! کسی کی موت کاکوئی وقت مقررنہیں،معلوم نہیں کہ کہاں زندگی کی شام ہوجائے ، اے اللہ!ایسی حالت میں ہماری موت آئے کہ ہمارے دل ایمان کےنورسےمنورہوں،زبان پرکلمۂ طیبہ جاری ہو،تو ہم سے راضی ہو اورہم تجھ سےراضی ہوں،تیرےاورتیرے بندوں کےحقوق میں سےکوئی حق واجب الاداءہم پرباقی نہ رہ گیاہو،اے اللہ!ایسی حالت میں موت عطافرما۔

قبرکےعذاب سے پوری پوری حفاظت فرما۔ہمارےتمام ہی مرحومین کی قبرکے عذاب سے حفاظت فرما۔اے اللہ ! آخرت کی منزلوں میں وہ پہلی منزل ہےاگراس سےآسانی سے پارہوگئےتوآگے کی تمام منزلیں آسان ہیں۔اے اللہ! وہ تمام گناہ جو

عذابِ قبر کا باعث بنتے ہیں ان سب سے ہماری حفاظت فرما، اور وہ نیکیاں جو عذابِ قبر سے حفاظت کا ذریعہ بنتی ہیں ان کا اہتمام نصیب فرما۔

محشر کی ہولنا کیوں سے حفاظت فرما، اس دن کی رسوائی سے بچالے، اس دن اپنے عرشِ عظیم کا سایہ عطا فرما۔ اپنے حبیبِ پاک ﷺ کے مبارک ہاتھوں حوضِ کوثر کا جام نصیب فرما۔ حضورِ اکرم ﷺ کی شفاعت مرحمت فرما۔ نیکیوں کے پلڑے کو جھکا دے۔ داہنے ہاتھ میں نامۂ اعمال نصیب فرما۔ پل صراط پر سے عافیت کے ساتھ گزار کر جہنم کے عذاب سے پوری حفاظت فرما کر جنت میں دخولِ اولین نصیب فرما۔

اے اللہ! مرحومہ کے بچوں کی بہترین تربیت فرما، اے اللہ! ہر طرح کے آدابِ زندگی سے ان کو آراستہ فرما۔ علومِ نافعہ، اعمالِ صالحہ، اخلاقِ فاضلہ سے آراستہ فرما۔ اے اللہ! اپنی والدہ کی شفقتوں سے بڑھ کر شفقتیں و محبتیں ان کو عطا فرما۔ اے اللہ! ان کی بھرپور نصرت و مدد فرما۔ اور بھی گھر کے تمام افراد جن کو ان کی ذات سے فائدے پہنچ رہے تھے، ان فوائد کے سلسلے کو جاری وساری فرما۔

اے اللہ! حضورِ اکرم ﷺ نے جتنی خیر و بھلائی آپ سے مانگی، وہ سب ہمیں اور پوری امت کو عطا فرما۔ اور جن شرور و برائیوں سے پناہ چاہی، ان سے ہماری اور پوری امت کی بھرپور حفاظت فرما۔ اے اللہ! ہماری دعاؤں کو محض اپنے فضل و کرم سے قبول فرما۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ وَتُبْ عَلَیْنَا اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ.

وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ سَیِّدِنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ.

بِرَحْمَتِکَ یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ.